کشمیر میں اردو
عبدالقادر سروری
جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹ کلچر اینڈ لینگویجز سرینگر
89

ا

کشمیر میں اردو

تیسرا حصہ

(موجودہ دور)

پروفیسر عبدالقادر سروری

ترتیب

محمد یوسف ٹینگ

جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لینگویجز، سری نگر
۱۹۸۴ء

ناشر — سیکریٹری جموں و کشمیر اکیڈیمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لینگویجز سرینگر

مطبع — جے کے آفسیٹ پرنٹرز۔ نئی دہلی۔

چھاپ — ۱۹۸۴ء — ایک ہزار

کتابت۔ محمد صدیق۔ محمد یوسف مسکین۔ ولی محمد میر۔ شوکت عباس

قیمت —

انچارج پبلی کیشن — بشیر اختر

عرضِ ناشر

پروفیسر عبد القادر سروری مرحوم کی ضخیم کتاب "کشمیر میں اردو" کا تیسرا اور آخری حصّہ شائع کر کے اکادمی اُس بارِ امانت سے سبکدوش ہو رہی ہے جو سروری صاحب کے انتقال کے بعد اُس نے قبول کیا تھا۔ اِس جلد کے سمیت اب پوری کتاب کی ضخامت ڈیڑھ ہزار صفحات کے قریب ہو جاتی ہے۔ اور اس میں ریاست میں اردو کی آمد اور عروج کی داستان اردو کے اوّلین لمس سے اِس صدی کی ساتویں دہائی تک مکمّل ہو جاتی ہے۔ یہ ایک بہت بڑا کام تھا اور اِس کو بخیر و خوبی انجام دینے سے ایک تھکن آمیز سرور کا احساس ہونا فطری ہے۔ اب اس تذکرے سے جموں و کشمیر میں اُردو زبان اور ادب کا ایک نہایت صاف اور بہتر نظارہ کھلتا ہے۔ اِس پر طرّہ یہ کہ یہ ذکر ایک ایسی شخصیّت کے قلم سے ہے۔ جس کی لِسانی خدمات اور ادبی دقعت کے بارے میں اردو حلقوں میں دو رائیں نہیں ہیں۔ ظاہر ہے کہ اُنکی بات توجّہ اور اشتیاق سے سُنی جائیگی اور خوشگوار گونج پیدا کریگی۔ یہ مرحوم کی آخری تصنیف بھی ہے اور اِس لحاظ سے سروری پر کام کرنے والوں کے لئے بھی ایک اہم چیز بن جاتی ہے

ہم نے اپنی بِساط کے مطابق ساری کتاب کو اُس رنگ میں شائع کرنے کی کوشش کی ہے۔ جس رنگ میں اِسے سروری چھاپنا پسند کرتے۔ ہم نے اُن کی آراء اور بیانیہ کے

بہاؤ کو بھی نہیں چھیڑا ہے کہ یہ ادبی اعتبار کے اصولوں کی خلاف ورزی ہوتی۔

اُمید ہے کہ اس تذکرے کی بنیاد پر اب اردو کے کشمیر دبستان کے متعلق زیادہ توجّہ اور تجسّس سے کام ہوگا اور یہ کتاب کئی آنے والی کتابوں کا مژدہ اور پیش خیمہ ثابت ہوگی۔

سرینگر
۶ فروری ۶۸ء

محمّد یوسف ٹینگ
سیکریٹری

پیش گفتار

پروفیسر سروری کے اس تذکرے کے تیسرے اور آخری حصّے کے ساتھ ہی کشمیر میں اُردو کے رُومان کی داستان خود ہماری نسل تک آجاتی ہے۔ چونکہ بات اُن ادیبوں اور احباب کی ہورہی ہے۔ جو اِس وقت بھی اپنے تخلیقی سفر میں مصروف ہیں۔ اِس لئے اس میں بیک وقت گریز اور دِلکشی کی ایک ایسی صُورت پیدا ہوگئی ہے۔ جو ایسے موضوعات کی خمیر میں مُضمر ہوتی ہے۔ گریز اِس لئے کہ اپنے متعلق بات سُننے میں حجاب کا پیدا ہوجانا فطرتِ انسانی کا خاصہ ہے اور دِلکشی اِس لئے کہ بہرحال کائنات کو اپنی ذات کے حوالے سے ہی پہچانا جاتا ہے اور اپنی کدوکاوش کی قدرسنجی ایک انوکھا تجربہ ہوسکتی ہے۔ سروری نے اس ایکٹ کا صرف ابتدائیہ ہی پیش کیا ہے کہ اِس کے علاوہ وہ کچھ کر بھی نہیں سکتے تھے۔ اِس ایکٹ کے بیشتر کردار بفضلہٖ ابھی تخلیق کے ہیج پر مصروف و مشغول ہیں۔ نہ اُن کا رول ختم ہوا ہے اور نہ اُن کی تخلیقی تگ و تاز کا حرفِ آخر آیا ہے۔ اس لئے اِس بات کو سٹیج سے رُوشناسی کی پہلی منزل سمجھا جانا چاہیئے۔ اسی لئے اِس کی تکمیل کی صلاح اِس کی اِبتدار کا ہی حصّہ ہے۔ اچھّا ہوا کہ یہ ابتدا سروری نے ہی کی تھی۔ اب اِس کو منطقی انجام تک لے

جانے کی تحریک و ترغیب سے دامن بچانا آسان نہ ہوگا۔

اُردو کی عمر ریاست میں تحریری سطح پر ڈیڑھ سو برس سے زیادہ نہیں ہے اور تخلیقی سطح پر تو یہ قدرتی طور اور بھی مختصر ہے۔ یہ کسی زبان اور اُس کے ادب کے برگ و بار ہونے اور پھولنے پھلنے کے لئے بہت ہی کم عرصہ ہے۔ لیکن اِس جلد کے شمولات پر ایک نظر ڈالنے سے یہ حقیقت فوراً روشن ہو جائیگی کہ یہ گُل زمین جہاں اُگنے والی گھاس بھی بقول شیخ یعقوب صرفی زعفران کا رنگ اور خوشبو لے کر آتی ہے۔ اُردو کے پودے کو بڑی راس آئی اور اس نے یہاں کی مٹی کی طرح یہاں کے زرخیز ذہنوں سے نمو پا کر تخلیق و تحریر کا ایک گھنا جنگل اُگا دیا۔ غالب نے شاید اِس شعر میں ایسی ہی آتش آمادہ زمین کی خاصیت بیان کی ہے ؎

مستیٔ بادِ صبا سے ہے بغرضِ سبزہ ریزۂ شیشۂ مے جوہرِ تیغِ کہسار

کاٹ کر پھینکیے ناخن تو بہ اندازِ ہلال قوتِ نامیہ اس کو بھی نہ چھوڑے بے کار

اُردو اور کشمیر کے توسط کے بارے میں بات کرتے ہوئے میں نے پچھلے حصے میں لکھا تھا کہ یہ یہاں صنعتی انقلاب اور ترقی یافتہ تمدن کا سندیسہ لے کر آئی ہے۔ اِس سلسلے میں دو اہم سنگ میل نظر میں لانا ضروری ہیں۔ ایک یہ کہ انگریزوں نے پنجاب پر اپنا تسلط ۱۸۴۹ء میں مکمل کر لیا۔ پنجاب لاہور دربار اور انگریز سرکار سے کشمیر کے آقانے زور وزر گلاب سنگھ کا کتنا گہرا رابطہ تھا۔ وہ سبھی پر عیاں ہے۔ یہ گویا ویری ناگ پر قبضہ کرنے کے مترادف تھا۔ جہاں سے اُس خاص زمانے میں کشمیر کے تہذیبی نفوذ کی وِتستا بہتی تھی۔ چنانچہ اُردو یہاں انگریزی کے قاصد اور نئی دُنیا کے سفیر کی حیثیت سے آئی۔ رہی سہی کسر ۱۸۸۵ء میں پوری ہو گئی۔ جب رنبیر سنگھ کی وفات کے بعد پرتاپ سنگھ گدی نشین ہوا اور انگریز ریذیڈنسی نے اپنی گزشتہ کوتاہیوں پر ہاتھ ملتے ہوئے ایک ترکتازانہ انداز سے اصل اقتدار

پرچھا جانے کے لئے پہل کی۔ یہی نقطہ کشمیر میں سرکاری سطح پر اُردو کے تسلیم کئے جانے کا ہے
فارسی اپنی تمکنت اور وقار کے باوجود جاگیرداری نظام کی ہی ترجمان اور نشان تھی۔ اُردو
ایک نوخیز کلی کی طرح ابھی اثر و قبول کے دائرے میں تھی۔ یہ کشمیر میں انگریزوں کی راست مداخلت
کے ساتھ ہی سرکاری زبان بن گئی مگر اس نے انگریزوں کے سرکاری مقاصد سے زیادہ اُن کے
تہذیبی پیغام کو یہاں پہونچایا۔

برسرِ اقتدار طبقے کی پسندیدہ زبان کی حیثیت سے یہ اُس زمانے کے فیشن اور
دربارداری ETIQUETE کا حصہ بننے لگی اور بڑے عرصے تک سماج کی اوپری سطح پر ہی
عود و عنبر کے بادلوں کی طرح منڈلاتی رہی۔ لیکن جموں و کشمیر کی سیاسی اور لسانی صورتِ حال
میں ایک متحد کرنے والی زبان کے لئے گنجائش موجود تھی۔ اس لئے اُردو جلد ہی زمین پر اپنے
حنا آلود پاؤں دھرنے لگی۔ اُردو کے سنجیدہ ادبی ذوق کا تعارف کرانے اور اسے عام کرنے میں بیرونِ
ریاست کے ادیبوں اور شاعروں کا ہی حصہ رہا۔ لیکن بہت جلد یہاں کے بڑے ذہین اور باصلاحیت
ادیبوں نے اس زبان میں قلم کے اُڑن کھٹولے پر سوار ہونے کے لئے پر تولنا شروع کر دیئے
اگرچہ اُنہوں نے صحیح اور مرصع اُردو بھی لکھی۔ لیکن اُن کے اظہار کی پرتیں کھلنے کے لئے ابھی بہت
عرصہ درکار تھا۔ چنانچہ ریاست میں اُردو کی پہلی اور دوسری پیڑھی کے کارناموں کے آگے جبینِ
نیاز خم کرنے کے باوجود اس کڑوی سچائی کا اظہار کئے بغیر چارہ نہیں ہے۔ کہ یہ حضرات بہر حال
اُردو کے سوادِ اعظم اور سوادِ اعلیٰ سے دور دور ہی پر پھڑپھڑاتے رہے۔ انہیں اُردو کے
مستند اور معتبر دھارے میں جگہ حاصل نہیں ہو سکی۔ یہی وجہ ہے کہ ہم اپنی چھوٹی حب الوطنی
اور محدود وفاداری کی سنک میں اُن کی اہمیت پر کتنا ہی زور کیوں نہ دیتے رہیں۔ اُردو
کے کسی اعلیٰ اور معیاری تذکرے یا تواریخ میں مرزا سعید۔ پریم ناتھ پردیسی۔ پریم ناتھ بزاز

خوشی محمد ناظر تک کا نام دریافت نہیں کر سکتے۔ انہیں اردو نقاد اور مورخ از راہِ کرم بھی بس دوسری، تیسری صف میں ہی جگہ دینے پر آمادہ ہوں گے۔ یہاں تک کہ میر غلام رسول نازکی جیسا اردو سخن سنج جو اپنے بارے میں اس طنطنے سے بولتا ہے ؎

کشمیر کا رہنے والا ہوں - اردوئے معلّٰی لکھتا ہوں
اس دیس میں مجھ سا کوئی بھی اردو کا سخن ور ہو نہ سکا

بھی اردو کے جانے پہچانے ایوانوں میں باریابی حاصل کرنے میں دِقّت محسوس کرتا ہے حالانکہ اردو میں تیس چالیس سال تک دادِ سخن دینے کے بعد جب وہ پچاس سال کی عمر میں کشمیری کی طرف راغب ہوا۔ تو تقریباً آناً فاناً کشمیری کے ادبی شہ نشین میں اس کے لئے نشست سنور جاتی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ دانستہ طور نہ سہی غیر شعوری طور پر اردو کا یہ عدمِ التفات بھی اُن کے اظہار کی ٹرین بدلی کا ذمہ دار بنا ہو۔ مطلبِ سخن یہ ہے کہ اردو اُس وقت کشمیر میں تخلیقی اظہار کے امکانات کا اصل صیغہ دریافت کرنے میں کامیاب ہوئی۔ جب یہ اپنی تواریخ کے سب سے بڑے آشوب اور اُفتاد کا شکار ہو کر ملک میں راون کے چنگل میں پھنسی ہوئی سیتا کی طرح سہمی سہمی پھر رہی تھی اور غالب کا یہ شعر زبانِ حال سے دُہرا رہی تھی۔ ؎

یارب زمانہ مجھ کو مٹاتا ہے کس لئے
لوحِ جہاں پہ حرفِ مکرّر نہیں ہوں میں

جمّوں و کشمیر میں اُس وقت کشیری، ڈوگری اور دوسری علاقائی بھاشاؤں کے سلب شدہ حقوق طلب اور تسلیم کئے جا رہے تھے۔ لیکن اُس کے باوجود نوجوانوں کے ایک گروہ نے اردو میں ہی اپنی نواہ کی صداقتیں، شوخیاں، رنگینیاں اور گہرائیاں دریافت

کرلیں۔ شمیم احمد شمیم کو ہندوستان گیر سطح پر آل احمد سرور، خلیل الرحمان اعظمی اور سردار جعفری جیسے نقادوں نے اردو کے اول درجے کے صحافیوں میں شمار کیا۔ اب ڈاکٹر حامدی کاشمیری اور ڈاکٹر اکبر حیدری کی تنقیدی اور تحقیقی کاوشوں کے چرچے کشمیر سے باہر ساری اردو دنیا میں سنائی دے رہے ہیں۔ لیکن اس دور کا اصل کارنامہ جو اردو کی روایت میں زبردست INROADS بنا رہا ہے۔ وہ یہاں کے ان شعراء کا کلام ہے جو جدیدیت کی رو کے تحت لکھ رہے ہیں۔ اس سلسلے میں حامدی کاشمیری۔ حکیم منظور۔ ایرج کاشمیری پرتپال سنگھ بے تاب تو صاحب کتاب بن چکے ہیں اور ان کی نگارشات اردو کی معاصر روایت کا حصہ بن رہی ہیں۔ دوسری طرف بہت سے نوجوان شعراء بھی اپنا وجود منوانے کی جدوجہد میں کامیاب ہوتے نظر آرہے ہیں اور ان کے قدموں کی چاپ آہستہ آہستہ تیز ہو رہی ہے۔ میرا خیال ہے کہ اب جموں وکشمیر اردو کی اعلیٰ سطح پر ایک معتبر مکتب کی صورت اختیار کر رہی ہے اور اردو کے مورخ اور نقادوں کی معاصر تحریروں میں اس کا عکس جھلکنے لگا ہے۔ یہی اہم نصرت سرداری کی اس جلد کی خبر اور بشارت ہے۔

سرداری نے اس جلد میں بھی اپنی دقت نظر اور تحقیقی ریزہ کاری کا بھرپور مظاہرہ کیا ہے۔ اس جلد میں ایسے گمنام ادیبوں کے نام بھی ملیں گے۔ جو زمانے کے کہرے میں چھپنے لگے تھے۔ لیکن سرداری نے ان کے چہرے بشرے جانکاری کی کرنوں سے اجلا دیئے۔ اسی طرح معروف اشخاص اور ادیبوں کے بارے میں بھی انہوں نے گہری تحقیق و تفتیش سے نئے واقعات سامنے لائے ہیں۔ جن سے ان کے رول کو سمجھنا نسبتاً آسان ہو جاتا ہے۔ سرداری یہ کتاب ایک زبان ساز بلکہ طرفدار زبان کی حیثیت سے لکھ رہے تھے۔ اور اپنی ترنگ میں ہر کہ ومہ کو اردو کے مدار کا سیارہ ثابت کرنے پر آمادہ تھے۔ اتنا ہی نہیں بلکہ معیار کے

ساتھ نئے جمہوری آداب کے "شُمار" پر بھی نظر لگائے ہوئے تھے۔ اس لئے اُنہوں نے اصل ہیروں کے ساتھ کبھی کبھی کانچ اور شیشے کے نگینوں کو بھی اس مالا میں پرو دیا۔ اس طور اُن کے جوش کی کیفیت میں کلام تو ہو سکتا ہے۔ مگر اُن کے خلوص کے کھرے ہونے میں نہیں۔ بقول عُرفی ؎

زنقصِ تشنہ لبی داں بہ عقلِ خویش مناز
دِلت فریب گر از جلوۂ سراب نہ خورد

چنانچہ اُن کی اسی مودّت اور مُروّت کا نتیجہ ہے کہ اُنہوں نے جی ایم راجپوری کے سیاحت پر لکھے ہوئے محکمانہ پیغام کو بھی ادب گردانا ہے اور کسی راج دُلاری کے نام سے شایع ہونے والے مُختصر اشتہار کو بھی جس میں قبیح رسوم سے بچنے کی اپیل کی گئی ہے۔ اُنہوں نے بارہ مولہ پرائمری سکول کی کسی نذیرہ غازی کو بھی ادیب مانا ہے اور جی ڈی شرما کے نام سے شایع ہونے والے مضمون کو بھی ادب کی ذیل میں درج کیا ہے۔ حالانکہ ان کا یہ مضمون جو صنعت ابریشم کے اعداد و شمار پیش کرتا ہے۔ دراصل اُن کے انگریزی مضمون کا ترجمہ ہے جو اُن کے کسی ماتحت نے کیا ہے۔ سروری نے اپنے جوش میں ثریّا جبیں ناہید کو بھی ادیب مانا ہے۔ حالانکہ یہ ایک مرد کا فرضی نام تھا۔ اُنہوں نے اسی رَو میں کشمیر کے ایک معروف شخص کا یہ جملہ بھی ادب کی ذیل میں درج کیا ہے۔

"جیب میں پیسے نہ ہوں تو گدھے کا بھی سالا بننا پڑتا ہے۔ ارے صاحب یہ تو معمولی بات ہے۔ گدھے کو باپ بھی کہنا پڑتا ہے۔ پیسے کے لئے انسان کیا کچھ نہیں کرتا"۔

بہر کیف! سروری کی یہی گرمجوشی اس کتاب کا کیف بھی ہے اور اس کا کم بھی۔ اس میں شک نہیں کہ اس کتاب کی بنیادی اہمیت تذکرے کی حیثیت سے ہی ہے اور سروری نے

اپنی طرف سے اُس کوتاہی کو COMPENSATE کرنے کی دانستہ کوشش کی ہے جس کا کشمیر کے ادیبوں کے تئیں اردو کے ثقہ مورخ اور تنقید نگار مظاہرہ کرتے ہیں۔ غالب کا شعر بے ساختہ نوکِ قلم پر آگیا ہے ؏

تیری وفا سے کیا ہو تلافی کہ دہر میں
تیرے سوا بھی ہم پہ بہت سے ستم ہوئے

اردو کے ایوان میں موجودہ دور کے کشمیری ادیبوں کی پذیرائی کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ جدیدیت کی لے اردو میں تقریباً بیک وقت ساری جگہوں پر سُنی گئی اور اس کی بازگشت بھی ہر جگہ ہوئی۔ اس کے علاوہ اردو کے دِلی۔ لکھنؤ سکولوں وغیرہ میں محاورہ بندی اور ٹکسالیت کا رجحان جو مریضانہ انتہائیں اختیار کر گیا تھا۔ وہ زمانے کے چند جھٹکوں سے دور ہو گیا۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ کشمیر کے موجودہ اردو شاعر اور ادیب اچھی اردو نہیں لکھتے بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اب زبان کے ساتھ خیال۔ کیفیت اور فن کے وسیع تر لوازمات نے صرف "اہلِ زبان کے اجارے" پر فوقیت حاصل کر لی ہے۔

سرورؔی کے اس نسخے کو لکھے ہوئے سولہ سال سے زائد عرصہ گزر گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس دوران وقت ساکت نہیں رہا ہے۔ جن ادیبوں کے کلام اور کارناموں کا اُنہوں نے ذکر کیا ہے۔ اُنہوں نے اپنی معنوی اور تعدادی فتوحات میں بہت اضافہ کر لیا ہے اس کے علاوہ منظر پر اب ایسے نام بھی اُبھر آئے ہیں۔ جن سے سرورؔی واقف نہ تھے۔ اور اس لئے اُن کا ذکر اس کتاب میں نہ ملے گا۔ اس لئے قاری کو جہاں سرورؔی کے تعارف کردہ ادیبوں کے بارے میں یہ کتاب ناکمتفی معلومات فراہم کریگی۔ وہاں ایسے نام اس تذکرے میں سرے سے نظر نہ آئیں گے۔

پروفیسر سیف الدین سوز۔ پرتپال سنگھ بے تاب۔ رفیق راز۔ رخسانہ جبیں۔ اقبال فہیم۔ منیب الرحمان۔ بے تاب جے پوری۔ اشرف ساحل۔ شجاع سلطان۔ راز منادری خالد بشیر۔ پریمی رومانی۔ مسعود سامون۔ شافی شفائی۔ مقبول احمد۔ رفیق ہمراز۔ نذیر احمد نظیر واجدہ تبسم۔ یوسف سلیم۔ سعید رضا۔ کے ڈی مینی۔ خورشید بسمل۔ احمد شناس۔ عابدہ احمد غلام محمد آجر۔ فاروق مضطر۔ ح عامر۔ قیوم کشمیری۔ جاوید آذر۔ شمس الدین شمیم۔ خالد حسین دیریندر پٹواری۔ انیس ہمدانی۔ ہمراہ کشمیری۔ محمد اسد اللہ وانی۔ رسول پونپر۔ ڈاکٹر محمد زمان آزردہ ڈاکٹر ظہور الدین۔ ڈاکٹر عابد پشاوری۔ آنند لہر۔ عبد الغنی شیخ لداخی۔ محبوبہ وانی۔ بشیر احمد نحوی۔ یوسف جمیل۔ طاہر محی الدین۔ صوفی محی الدین۔ محمد امین اندرابی اور بہت سے دوسرے حضرات۔ اسی طرح ان ادیبوں میں جو باہر سے آکر یہاں مقیم ہیں اور اردو کی روایت کو رعنائی بخشنے میں مصروف رہے ہیں۔ پروفیسر آل احمد سرور جیسے صاحب نظر استاد اور نقاد مظہر امام جیسے شاعر اور اس کے علاوہ ڈاکٹر جعفر رضا۔ کبیر احمد جائسی۔ ڈاکٹر مسعود حسین خان۔ علی سردار جعفری۔ پروفیسر عالم خوندمیری، ڈاکٹر سلامت اللہ اور ایسے ہی دوسرے حضرات شامل ہیں۔

بہر حال یہ تو زمانے کی برق رفتاری کا تقاضہ ہے۔ جسکی کیفیت بقول اقبال یہ ہے ع

زود پروازے کہ پروازش نیاید در شعور

امید ہے کہ سروری کا یہ شاندار تذکرہ کشمیر کے اردو مکتب کی بہتر جانکاری پیدا کریگا اور اس طرح اس کو اردو حلقے اپنا جائز RECOGNITION دیں گے۔ اس تذکرے کی بنیاد پر کشمیر کے اردو ادب کا زیادہ گہرائی سے مطالعہ کرنے کا

راستہ بھی ہموار ہو گیا ہے اور سروری کی روح بجا طور پر پکار سکتی ہے ؎

کون ہوتا ہے حریفِ مئے مرد افگن عشق

کشمیر میں اردو کے مستقبل کے بارے میں اس وقت کچھ اندیشوں کا اظہار ہو رہا ہے۔ کشمیر میں اردو کا مستقبل ملک میں اردو کے مستقبل سے جدا نہیں ہے اگر ملکی سطح پر اردو ادیبوں کو نشر و اشاعت اور دوسری ترغیبات کے ذرائع میسر رہے تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ ان کے شوق اور لگن میں کوئی کمی آجائے۔ ۔۔۔لیکن جس انداز سے اردو کے بڑے بڑے ادارے جن میں انجمن ترقی اردو (ہند) ترقی اردو بورڈ، آل انڈیا ریڈیو کی اردو سروس، ایوان غالب، ساہتیہ اکادمی اور نیشنل بک ٹرسٹ، ریاست کے مقامی ادیبوں سے اغماض برت لیتے ہیں۔ وہ کسی امید افزا رجحان کا اشارہ نہیں ہے۔ یا تو ان اداروں سے جموں و کشمیر کے ادیبوں اور یہاں کے موضوعات پر توجہ ہی نہیں ہوتی یا اگر ہوتی بھی ہے۔ تو "سلطان زین العابدین" پر بھی کسی غیر ریاستی اردو ادیبہ کو لکھنے کی دعوت دیکر اس کی ادھ پکی کھچڑی قبول کی جاتی ہے۔

اس کتاب میں اخبارات کا ذکر سروری صاحب نے سرسری انداز سے کیا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ریاست میں اردو اخبارات کا شمار اور معیار ایسا ہے کہ موضوع سے انصاف کرنے کے لئے ایک مستقل تصنیف کی ضرورت ہے۔ اس سلسلے میں کچھ کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ لیکن سروری صاحب کے سرسری تذکرے کو ان کے ارادے سے زیادہ کتاب کی حدود کے پس منظر میں دیکھا جانا ہوگا۔

کتاب کے آخر میں ہم نے ۱۹۶۸ء کے بعد اکادمی کی طرف سے شائع ہونے والی اردو مطبوعات کی فہرست شامل کی ہے۔

سری نگر — ۹ر فروری ۱۹۸۴ء

محمد یوسف ٹینگ

مرتب

شاعری

شاعری

آزادی اور مابعد

ثقافتی اور ادبی تحریکیں

ادب کی نئی راہیں

وطنی شاعری کی صدائے بازگشت

اندرجیت شرما۔ غلام جیلانی اثر۔ غلام رسول آزاد۔ حکیم دوارکا ناتھ حاذق۔ خموشش سرحدی۔ غلام مصطفیٰ عشرت کشتواڑی۔ عبدالرحمٰن خمار۔ غلام احمد مقبل۔ شہزور کاشمیری۔ غلام محمد میر طاؤس۔ شیخ غلام علی بلبل۔ ثناء اللہ عاجز۔ گردھاری لال آنند تمنا۔ تنہا انصاری۔ غلام رسول کامگار۔ غلام احمد فاضل کاشمیری۔ طالب امین آبادی۔ عبدالحق برق۔ سید اکبر ہاشمی۔ سیف الدین سیفی سوپوری۔ سائیف کھوردی۔ محمد امین کامل۔ حبیب کامران۔ اندرجیت لطف۔ شوریدہ کاشمیری۔ بیکش کاشمیری۔ گردھاری لال برق۔ عرش صہبائی۔ مہندر رینہ۔ تسنیم کاشمیری۔ بشارت سلیم۔ رحمٰن راہی۔ حکیم جلال الدین آثم۔ ڈاکٹر کاشی ناتھ پنڈت۔ قیصر قلندر۔ اکبر جے پوری۔ شہزادی کلثوم۔ فاروق نازکی۔ شیولال رینہ آزاد۔ ریش شرما۔ منظور ہاشمی۔ حامدی کاشمیری۔ پرتھوی راج خمار۔ ہر بگوان شنکر [illegible] طاؤس بانہالی۔ میر غوث بانہالی۔ سلطان الحق شہیدی

فرحت گیلانی۔ راجیش گوہر۔ بال کرشن ساگر۔ ہمدم کاشمیری۔ محمود حسن محمود۔ مسعود حسن مسعود۔ قاضی غلام محمد۔ عابد مناوری۔ حکیم منظور۔ رہبر جدید۔ راج کمار ابرول۔ ودیا رتن عاصی۔ شہباز راجوروی۔ مرزا محمد یٰسین بیگ۔ یوسف رشی۔ بشیر شاہ۔ سجود سیلانی۔ ایرج کاشمیری۔ صادق علی اسیر۔ نشاط انصاری۔ نشاط کشتواڑی۔ وجے سمن سوسن۔

بیرونی شعراء:

وامق جونپوری۔ کمال احمد صدیقی۔ جگن ناتھ آزاد۔ مظفر اعظمی۔

کشمیر سے باہر:

ظہیر کاشمیری۔

موجودہ دور

یہ دور جو گذشتہ عہد کی سیاسی کشمکش کا نتیجہ ہے۔ کم و بیش اس صدی کے وسط سے شروع ہوتا ہے۔ اس اعتبار سے گذشتہ عہد کی سیاسی تحریکوں کے مقابلے میں، اسی دور کی اجتماعی زندگی میں عام طور پر سماجی، معاشی اور ثقافتی باز تعمیر اور ایک سماج وادی نظام کو فروغ دینے کی مساعی نمایاں ہونے لگیں۔ ان مساعی کا نقطۂ آغاز، ملک کی آزادی ہے۔ کشمیر میں آزادی کی جو تحریکیں، اس صدی کے ربع اول سے شروع ہوئی تھیں۔ وہ اس میں شک نہیں کہ اسی زمانے میں بار آور ہوئیں، لیکن تقسیم ملک نے کشمیر کے لئے نئے اور گوناگوں مسایل پیش کر دیئے۔ سب سے اہم مسئلہ کشمیر کے الحاق کا تھا۔ انگریزی اقتدار اعلیٰ کے ختم ہو جانے کے بعد، اقتدار مہاراجہ اور اہلِ کشمیر کو حاصل ہو گیا۔ مہاراجہ نے وقتی طور پر حالات کے جوں کے توں برقرار رکھنے کا معاہدہ ہندوستان اور پاکستان سے کر لیا۔ اسی دوران قبائلیوں کا حملہ کشمیر پر ہوا۔ جس سے ایک نئی صورت حال کھڑی ہو گئی۔ شیخ محمد عبداللہ جو گرفتار تھے، انہیں عوامی قاید کی حیثیت سے رہا کر کے، نظم و نسق کا کام چلانے کے لئے مقرر کیا گیا۔[1] اب وہ

لہ: جناب شیخ محمد عبداللہ قبائلی حملے سے پہلے رہا ہوتے تھے پہلے قبائلی حملے کی اطلاع ہمیں ۲۱ اکتوبر ۱۹۴۷ء کے لگ بھگ ملتی ہے جب کہ شیخ صاحب ۲۹ ستمبر ۴۷ء کو رہا کئے گئے تھے۔ (ر ف ط)

اور ان کے ساتھی، جو آزادی کی جنگ لڑ رہے تھے، ریاست کے نظم کی ذمہ داری ان کے کندھوں پر آن پڑی۔ اس ذمہ داری سے وہ کس طرح عہدہ برا ہوئے۔ اس کے فیصلے کے لئے وقت درکار ہے۔ تاہم اس افراتفری کے عالم میں بھی ترقی پرور رجحانات رکھنے والے قائدین نے اپنی توانائیوں کو بازتعمیر کے کاموں میں لگایا۔ قبائلیوں سے عہدہ برآ ہونے کے لئے ایک قومی ملیشیا تشکیل دی گئی، جس میں کچھ قایدین شامل ہوگئے۔

لیکن نوجوان ذہنوں کو اس سلسلے میں جو تہذیبی، ثقافتی اور ادبی موڑ دینے کی کوشش کی گئی اس میں نیشنل کانفرنس فرنٹ[1] کا بڑا حصہ رہا، جسے بعد میں کلچرل کانگریس کا نام دیا گیا اور اس کے حدود کو وسعت دینے کی کوشش کی گئی۔ اس حاوی ادارہ کے ماتحت ہر ثقافتی دلچسپی کا ضامن ایک ذیلی ادارہ تھا جو پردگروسیو رائیٹرز ایسوسی ایشن، تھیٹر ایسوسی ایشن اور آرٹسٹس ایسوسی ایشن کے نام سے موسوم تھا۔ اس طرح اس مرکزی ادارہ نے ایک نئی تحریک کو اپنے حلقے میں سمیٹ لیا اور ان کو نئی راہیں سجھا کر اور ایک نیا آدرش دے کر انہیں تعمیری کاموں میں لگا دیا۔ کشمیر سے باہر، ہندوستان کی وسعت کے لحاظ سے، اس کے گوناگوں مسائل نے، اگلے دور کی آزادی کی کشمکش میں شریک نوجوانوں کے لئے ایسا کوئی فورم مہیا نہیں کیا تھا۔ پچھلے عہد کی جدّ وجہد میں، باہر سے جو قوتیں آزادی کی جنگ لڑنے والوں کی امداد کر رہی تھیں، وہ اب تعمیر نو میں معاون ہونے لگیں۔

کشیر ادیبوں اور شاعروں میں جو اس ادارہ کی مختلف اکائیوں سے متوسل رہے، ان میں نور محمد روشن، نادم، امین کامل، رحمان راہی، فراق، اختر محی الدین، امیش کول، بنسی نردوش، ہردے کول بھارتی، چمن لال چمن، مکھن لال بیکس، محمد عبداللہ عارج، موتی لال ساقی، غلام نبی عارض، عبدالستار رنجور، عبدالحق برق، پریم ناتھ پریمی وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔ ڈراما اور تھیٹر کی اکائی سے پران کشور، لشکر بھان، موہن لال ایمہ

---

[1] اس کا نام نیشنل کلچرل فرنٹ تھا۔ جس کے تحت اس کا اولین کتابچہ کاشے جاکشیر شائع ہوا۔

عبدالغنی نمتہ ہالی، سومناتھ زتشی کے علاوہ نور محمد روشن بھی متعلق رہے ہیں۔ فنکاری کے شعبے کے ساتھ ایس۔ این کھوسا، پرتھوی ناتھ کاچرو، سوم ناتھ بھٹ، ترلوک کول اور غلام رسول سنتوش مربوط رہے۔

باہر کے ادیبوں اور فنکاروں میں جن لوگوں کی مدد اور مشورہ اس تحریک کو حاصل رہا۔ ان میں صلاح الدین احمد، دیوندر ستیارتھی، خواجہ احمد عباس، بلراج ساہنی، راجندر سنگھ بیدی، شیلا بھاٹیا، وشنو پربھاکر، شیودان سنگھ چوہان، ایچ۔ ایس۔ رضا، اچلا سچدیو، کرنل شیر جنگ وغیرہ چند اہم نام ہیں۔ جو جذبۂ عمل اس تنظیم نے نوجوانوں میں ابھارا۔ اس کو دیکھتے ہوئے یہ صاف واضح ہوتا ہے کہ دل و دماغ کی جو قدریں انہیں ہمیشہ عزیز رہی تھیں اور وہ اجتماعی ادارے جن میں ان کا ذہن اپنی پرورش اور صحت بخش نشوونما کے لئے سہارے ڈھونڈتا تھا، ان کے لئے اب تک شجرِ ممنوعہ بنے رہے تھے۔ ہری سنگھ کی حکومت سے دست کشی اہلِ کشمیر کے لئے دوہری آزادی کے مترادف تھی۔ اس دُہری مسرت نے گویا ان گھٹے ہوئے جذبات سے بند کھول دیئے اور وہ اپنے اظہار کے لئے اپنی خواہش کے راستے تلاش کرنے لگے۔

آزادی اور اپنی قسمتوں کے آپ مختار ہونے کے احساس کے ساتھ ساتھ اپنی زبانوں کی طرف توجہ ایک فطری بات تھی۔ یہ احساس پچھلے عہد سے بیدار ہونے لگا تھا، جس کے آثار مہجور اور ان کے ہم عصر کچھ شاعروں کے پاس ملتے ہیں۔ کئی نوجوان شاعر اور ادیب اردو کے ساتھ، یا اردو سے ہٹ کر کشمیری اور ڈوگری میں بھی لکھنے لگے اور حکومت کی جانب سے ان کی سرپرستی اور کلچرل ساہتیہ اکادمیوں کی طرف سے ان کی حوصلہ افزائی نے بڑے سہارے کا کام کیا۔ جموں کے علاقے میں بھی کئی ادیب اور شاعر ڈوگری میں لکھنے لگے۔

لیکن کئی باہمت اہلِ قلم وسیع تر ادبی دنیا میں اپنی مخصوص ذہانت اور اپنے فن کا نقش

پٹھانے اور ایک کل ہند ادبی تصویر میں اپنے موقلم کی رنگ کاری کی نشانِ عمل کو نمایاں کرنے میں اب بھی مصروف ہیں اور اردو میں بڑے اچھے ادب کی تخلیق کر رہے ہیں۔

پچھلے عہد میں ادب کی راہیں، روایتی نظمیں اور دوسری تحریروں کی تحریک ضرورت، لیکن اس دور میں ادب کی راہیں زندگی سے کھولنے کی کوشش شروع ہوئی اور اسے انفرادی اور اجتماعی اور سماجی تقاضوں کا آئینہ دار بنانے کی کوشش کی جانے لگی۔ گو روایت کا پاس اب بھی باقی ہے۔ نئے شعور کا آغاز پردیسی سے ہو چکا تھا۔ چنانچہ ۱۹۴۱ء میں ان کے ہم خیال دوستوں نے ترقی پسند ادیبوں کی ایک لیگ قائم کی تھی، جس میں رامانند ساگر کی کوششوں کو بہت دخل تھا۔ اور اس میں پردیسی کے علاوہ ویشیشور، دینا ناتھ وارِ کو شاہد، سوم ناتھ زتشی، میرزا غلام حسن بیگ عارف، مہجور، تیرتھ کاشمیری، بے غرض، پرتھوی ناتھ کول اور نند لال واتل شامل تھے۔ ایک اور سعی ۱۹۴۶ء میں حلقۂ اربابِ ذوق کے قیام کی بھی ہوئی جس کا ایک شعبہ تھیٹر کا بھی تھا اور اس کے صدر عبد الستار عاصی تھے۔ بعد میں یہ حلقۂ انجمن ترقی پسند مصنفین کے ساتھ ضم ہو گیا۔ اس حلقے کے جلسے کبھی پردیسی کے مکان پر اور کبھی اس کے دوسرے اراکین کی قیام گاہوں پر منعقد ہوتے، جن میں کہانیاں پیش کی جاتیں، غزلیں اور نظمیں سنائی جاتیں اور ان پر تبصرے بھی ہوتے۔ پریم ناتھ بزاز جیسے قلم اور عمل کے قائد بھی کبھی کبھی ان جلسوں میں شامل ہوتے تھے۔

ہم سے قریب تر عہد میں، جموں کے نوجوان شعراء پر ملحقہ علاقے، پنجاب کے مُسلّم الثبوت اُستاد جوشؔ ملسیانی کا گہرا اثر رہا۔ جوشؔ اکثر جموں آتے اور ہفتوں وہاں قیام کرتے تھے، ان کی تربیت سے کئی نوجوان شاعر مستفید ہوئے۔ جوشؔ شعر میں آدابِ شاعری اور زبان میں آدابِ محاورہ کو سب سے زیادہ عزیز رکھتے ہیں۔ اس کا اثر نئی نسل کے شعراء پر

اتنا گہرا ہے کہ وہ نہایت سڈول شعر آسانی سے کہہ لیتے ہیں۔ جموں کے مقابلے میں کشمیر کے نوجوان شعراء کی تربیت سیماب اکبر آبادی جیسے جید سخنور کی مخصوص روایات میں ہوئی۔ سیماب اپنے مخصوص انداز کے اُستاد ہوتے ہوئے بھی آداب شاعری اور زبان اور محاورہ کی نگہداشت میں جوش سے پیچھے نہیں تھے۔ چنانچہ جن نوجوان شاعروں کی تربیت انہوں نے کی، ان میں سے چند اب خود اُستاد کے مرتبہ کو پہنچ گئے ہیں۔

پُرانی قومی اور وطنی شاعری صدائے بازگشت اب بھی کئی شعراء کے پاس سُنائی دیتی ہے، مثال کے طور پر اس زمانے میں جموں کے ایک اچھے کہنے والے شاعر اندرجیت شرما ہیں، جو روایتی انداز کی قومی نظمیں لکھتے ہیں۔ ان کی ایک نظم "بھارت ماتا اپنے بیٹے سے" کے عنوان سے شائع ہوئی تھی، جس کے دو بند ذیل میں درج ہیں:۔

مرے شیر، اُٹھ دندناتا چلا جا ۔۔۔ جوانوں کو غیرت دلاتا چلا جا
زمیں کیا، فلک پر بھی چھاتا چلا جا ۔۔۔ شجاعت کا پرچم اڑاتا چلا جا
ہر اک کی نظر میں سماتا چلا جا

مصیبت کے بادل ہٹاتا چلا جا ۔۔۔ اعدا، برق بن، دندناتا چلا جا
تھپیڑے ہواؤں کے کھاتا چلا جا ۔۔۔ شُجاعت کا پرچم اڑاتا چلا جا
ہمالہ پہ جھنڈا اُڑاتا چلا جا

جموں کے ایک اور خوش فکر شاعر، غلام جیلانی اثر تھے۔ وہ تعمیرات میں سب ڈویژنل افسر کے عہدے پر مامور تھے اور شعر سے انہیں گہری دلچسپی تھی۔

پچھلے عہد میں، حفیظ جالندھری کی ریاست سے دلچسپی اور ان کی مشاعروں میں شرکت کی طرف اشارے گذر چکے ہیں۔ حفیظ کی عام رومانی شاعری میں فطرت کی پرستاری کی مخصوص نوعیت کی نظموں کو اگلے عہد میں سارے ہندوستان میں مقبولیت حاصل رہی۔

اسی کا اثر کشمیر کے شاعر غلام رسول آزاد کی نظموں پر بھی نمایاں ہے۔ آزاد محکمۂ جنگلات میں ملازم تھے اور رینجر کے عہدہ پر مامور۔ شعر اچھا کہتے تھے۔ ان کی ایک نظم "موسم بہار" کا اقتباس یہ ہے:۔

یہ موسم بہار دیکھ ہجوم لالہ زار دیکھ
وہ تختۂ گلاب دیکھ بہار پُر شباب دیکھ
وہ دیکھ سبزہ زار پر ردائے آبشار پر
وہ دیکھ جوئے سیم خام ہے کس قدر سُبک خرام

وہ موسم بہار دیکھ
ہجوم لالہ زار دیکھ

آزاد نے مذہبی موضوعات پر بھی نظمیں لکھی ہیں۔ اس طرح کی نظموں میں "معراج کی رات" پسندیدہ نظم ہے۔ اس کے چند شعر ہیں:۔

یہی شب، ہاں یہی شب تھی شبِ معراجِ انسانی
اسی شب کو کھُلا تھا، عبدہٗ کا رازِ پنہانی!
نگہ تھا قدسیوں کو غایتِ تخلیق کا جس کی
اسی کی رفعتوں پر عرش کی تھی جلوہ سامانی
وہی نورِ ازل، تخلیق آدم ابتدا جس کی
حریم کبریائی میں تھی اس کی آج تابانی
مُقدّس آج کے چرچے، مقدس آج کی باتیں
مبارک ساجد و مسجود کی باہم ملاقاتیں

حکیم دوارکا ناتھ حاذق کا وطن پونچھ ہے۔ پہلے جموں میں تعلیم پاتے رہے۔ اس کے بعد

وہ بھی تعلیم کے لئے لاہور گئے۔ جہاں طبیہ کالج میں تعلیم کے دوران انہیں لاہور کے ادبی حلقوں میں اُٹھنے بیٹھنے کے مواقع ملے، جس سے ان کے اندر کا شاعر بیدار ہو گیا اور شعر کہنے لگے اس کے ساتھ ساتھ مضامین بھی لکھتے تھے۔ ایک مضمون طب سے متعلق "لبدڑی کونین اور مسٹر کرنجوہ" کے عنوان سے لکھ کر کالج کی مجلس میں پڑھا تھا، جسے شفاء الملک علامہ حکیم محمد حسن قرشی نے بہت پسند کیا تھا۔ مضمون میں کونین پر ہندوستانی جڑی بوٹی کرنجوہ کو ترجیح دی تھی۔ چراغ حسن حسرت، جن کا تذکرہ گذر چکا ہے، اس زمانے میں لاہور ہی میں تھے، حاذق ان سے مشورہ سخن کرتے رہے۔ حسرت کی صحبتوں میں، انہیں عبدالمجید سالک، غلام رسول مہر، ہری چند اختر، حاجی لق لق وغیرہ سے متعارف ہونے کے مواقع حاصل ہوئے۔ اس وقت پینڈر میں سرکاری طبیب ہیں۔

حاذق اس نئے عہد اور اس کی نئی تحریکوں کے درمیان بھی غزل کی روایت کے پابند ہیں۔ ان کی چند غزلوں کے شعر ہیں:-

رُلایا ہے مجھے اس بیوفا کی یاد نے اب تک　　جلایا ہے مجھے سوزِ دلِ ناشاد نے اب تک

ستایا ہے مجھے میرے ستم ایجاد نے اب تک

دیدار کو ترساتے ہو، معلوم نہیں کیوں　　دل کو مرے تڑپاتے ہو معلوم نہیں کیوں

ہر شئے میں نظر آتے ہو معلوم نہیں کیوں

کچھ نظمیں بھی انہوں نے لکھی ہیں۔ ایک نظم "عزم و ارادہ" کے عنوان سے لکھی تھی، جو کئی بندوں پر حاوی ہے۔ اس کے دو بند ہیں:-

میں راہوں سے کانٹے ہٹاتا چلوں گا

خزاں کو بہاروں میں لاتا چلوں گا

میں درسِ اخوت پڑھاتا چلوں گا

کوئی حُسن دولت کے لالچ میں آکر
چلا ہے کسی کا نشیمن جلا کر
کوئی ہنس رہا ہے کسی کو رُلا کر
میں بدلوں گا سنسار سب کو ہنسا کر

خموشؔ سرحدی، اچھے شاعر ہیں اور انشاء پردازی میں بھی مہارت رکھتے ہیں۔ صحافت سے بھی انہیں دلچسپی رہی۔ سیمابؔ کے کشمیری تلامذہ میں ان کو بڑی مقبولیت حاصل رہی۔ اس صدی کے چوتھے دہے میں وہ کافی لکھتے رہے تھے اور ان کے احباب نے انہیں "خدائے سخن" کے لقب سے بھی سرفراز کیا تھا۔ سری نگر میں جب سیماب لٹریری سوسائٹی قایم ہوئی تو خموشؔ اس کے سیکرٹری منتخب ہوئے تھے۔ ان کا ایک قطعہ ہے :۔

انتظامِ چمنِ دہر ہے بدتر ساقی — اور نشاطِ سحرِ عید ہے بدتر ساقی
تیرے میخانہ میں ہر رنگ کی ڈھلتی دیکھی — امن و آرام کا اک جرعہ عطا کر ساقی

اُردو زبان کی ہمہ گیری اور مقبولیت پر خموشؔ نے ایک اچھی نظم کہی تھی جس میں شاعرانہ انداز زیادہ ہے۔ اس نظم کا اقتباس ذیل میں درج ہے :۔

مشرق کی وادیوں میں مغرب کی محفلوں میں
ہر سمت نغمہ خواں ہے اُردو زباں ہماری
ہر شعبۂ ادب پر اُردو کا ہے تسلّط
دنیا پہ حکمراں ہے، اُردو زباں ہماری
اک حُسنِ جاوداں ہے اک رنگِ بے خزاں ہے
ہر لحظہ نوجواں ہے اُردو زباں ہماری

سو بولیوں کو اس نے آغوش میں لیا ہے
اب ہر زباں کی ماں ہے، اُردو زباں ہماری

خموشؔ نے اسی موضوع پر "اُردو ہندی کے سنگم پر" کے عنوان سے ایک مضمون بھی لکھا تھا، جو ہفتہ وار "وکیل" اسری نگر دسمبر ۱۹۴۹ء) میں شایع ہوا تھا۔ جس میں تقسیمِ ہند کے بعد ہندوستان کے بعض حلقوں میں اُردو کے بارے میں جو شبہات خواہ مخواہ پیدا کئے جا رہے تھے، اس پر تعریض اور تنقید ایک منشیانہ انداز سے کرتے ہوئے لکھتے ہیں :-

"دراصل واقعات اور مشاہدات کا جائزہ نہیں لیا گیا۔۔ خرام وقت مساواتِ انسانی کی طرف عوام کی رہبری کر رہا ہے۔۔۔۔ اس فیصلے کا حشر بھی وہی ہوگا، جو اجتماعیت کے فلسفے کے خلاف نظریۂ پاکستان کا ہو رہا ہے۔۔۔۔۔ ہر انقلاب وقت و حالات کے مطابق علم و ادب کی لسانی قدروں کو چھو سکتا ہے۔۔"

غلام مصطفےٰ، جو عشرتؔ تخلص کرتے ہیں اور عشرتؔ کشتواڑی[۱] کے نام سے عموماً لکھتے ہیں، کاسگنج، ضلع ایٹہ میں پیدا ہوئے لیکن ان کے بزرگوں کا وطن سری نگر ہے۔ تجارت کے سلسلے میں ان کے خاندان کی ایک شاخ کشتواڑ میں اور ایک کاسگنج میں آباد ہو گئی تھی، عشرتؔ کی ولادت کا سنہ ۱۹۱۶ء ہے۔ کم سنی میں وہ کشتواڑ آ گئے تھے، جہاں ان کی ابتدائی تعلیم ہوئی۔ ضلع ڈوڈہ اور پھر سری نگر میں بھی تعلیم پاتے رہے اور ایف۔ اے اور ادیب فاضل کے امتحانات کامیاب کئے۔ اس کے بعد محکمۂ تعلیم میں ملازم ہو گئے، کچھ عرصوں اسکول میں مدرّس کی خدمت انجام دیتے رہے، اس کے بعد بلاک۔ ڈیولپمنٹ افسر کی حیثیت سے ان کا تقرر عمل میں

[۱] عشرتؔ صاحب کئی سال پہلے انتقال کر چکے ہیں۔

میں آیا اور کوئی دس برس یہ خدمت انجام دی۔ ۱۹۶۶ء میں وہ ماہنامہ "دیہات سدھار" کے مدیر کی حیثیت سے بھی کام کرتے رہے۔ ۱۹۶۷ء میں ملازمت ترک کر دی اور عام انتخابات میں ریاست کے قانون سازیہ کے رکن منتخب ہوئے۔

عشرت کو شعر و ادب سے بچپن سے لگاؤ رہا۔ سکول کی ملازمت کی وجہ سے بچوں کے ادب سے دلچسپی پیدا ہو گئی تھی، چنانچہ تین کتابیں "پرستان کی شہزادی" "کتاب کی کہانی" اور "زمین کا تاج" بچوں کے لئے لکھ کر شائع کیں۔ ان کی دوسری اہم تالیفات "تذکرہ فریدیہ" اور "تاریخ کشتواڑ" ہیں۔ تاریخ کشتواڑ اس علاقے کی اہم تاریخوں میں سے ہے اور یہ پنڈت شیوجی در کی تصنیف ہے، جو مہاراجہ رنبیر سنگھ کے زمانے میں یہاں کے کلکٹر مقرر ہوئے تھے۔ تاریخ فارسی میں ہے، عہدِ قدیم سے لے کر ڈوگروں کے ابتدائی دور کے حالات اور واقعات پر مشتمل ہے۔ عشرت نے اسے اپنے مقدمے کے ساتھ مرتب کیا اور کتاب کلچرل اکیڈیمی کی جانب سے شائع ہوئی ہے۔

عشرت، غزل اور نظم دونوں کہتے ہیں، لیکن ان کی غزل میں اساتذۂ قدیم کی سی پختہ کاری ملتی ہے۔ ان کی مختلف غزلوں کے انتخاب یہاں مندرج ہیں:-

ستم نصیب بتِ طرحدار ہیں ہم لوگ — بہت اداس، بہت دلفگار ہیں ہم لوگ

فرشتے نام ادب سے ہمارا لیتے ہیں — بہ عرفِ عام مگر بادہ خوار ہیں ہم لوگ

جفا، فریبِ ستم سے لڑے ہیں ہارے نہیں — وفا، خلوص کے لیکن شکار ہیں ہم لوگ

خود چشمِ تمنا کو آیا ہے حجاب آخر — اس شان سے کھلتے ہیں عارض کے گلاب آخر

واعظ کی پذیرائی اس بزم میں لازم تھی — وہ جام لیے آئے دینے کو شراب آخر

پہنچے ہیں مرے بیٹھے اُٹھ کر کسی کے دیوانے — جائیں تو کہاں جائیں وہ خانہ خراب آخر

شہہ زور کاشمیری پچھلے تیس تیالیس سال سے شعر و ادب کی خدمت میں مصروف ہیں اور اس فن پر قدرت حاصل کرنے میں انہوں نے اتنی ریاضت کی ہے کہ اب نہ صرف کشمیر، بلکہ ہندوستان اور پاکستان کے سخن وروں میں انہیں اُستادی کا مرتبہ حاصل ہو گیا ہے۔ شہہ زور کا اصلی نام غلام قادر ہے اور ان کا تعلق کشمیر کے ایک خوشحال گھرانے سے ہے۔ ان کی ولادت سری نگر میں ۱۹۱۵ء میں ہوئی۔ تعلیم بھی یہیں پائی اور سری پرتاپ کالج سے بی اے کا امتحان پاس کر کے سرکاری ملازمت میں داخل ہو گئے۔ اس وقت وہ محکمہ حسابات میں چیف اکاونٹ آفیسر اور فائنانشل ایڈوایزر کے عہدہ پر مامور ہیں۔

شعر و ادب سے شہہ زور کا لگاؤ بچپن سے رہا اور موسیقی سے بھی انہیں شغف ہے۔ بچپن میں وہ شعر گنگناتے پھرتے تھے تو ان کے والد نے مزاحاً انہیں "شعر پرورده" کے لقب سے مخاطب کرنا شروع کیا تھا۔ موسیقی سے دلچسپی کا واقعہ شہہ زور یہ بیان کرتے ہیں کہ پانچ برس کی عمر میں وہ سخت بیمار پڑ گئے تھے۔ اور علاج سے کوئی فائدہ نہیں ہو رہا تھا۔ اتفاق سے ایک روز ایک فقیر خوش گلوئی کے ساتھ گاتا ہوا، گھر پر سوال کرنے آیا۔ اس کے گانے پر ان کے کان لگ گئے اور لے کانوں میں ایسی رچی کہ موسیقی کے دلدادہ بن گئے۔ یہ اتفاق تھا، یا اعتقاد یا محض خوش بختی کہ اس واقعہ کے بعد انہیں صحت ہو گئی۔

جب وہ دسویں جماعت میں پڑھتے تھے، باضابطہ شعر کہنے لگے تھے۔ مشن سکول کے ہیڈ ماسٹر نے جہاں یہ پڑھتے تھے، ان کے شعر سُن کر ان کی بڑی تعریف کی۔ سری پرتاپ کالج میں تعلیم کے دوران وہ باضابطگی کے ساتھ شعر کہنے لگے تھے اور ان کا کلام کالج کے رسالے "پرتاپ" میں شائع ہونے لگا تھا۔ مولانا محمد عبد الرحمن کا شعر بھی کالج سے نکلتا رہا تھا۔

شہہ زور کا کلام سُن کر وہ بہت متاثر ہوئے اور سیماب اکبر آبادی سے مشورۂ سخن کرنے کی رائے دی۔ سیماب محض شاعر ہی نہیں تھے بلکہ شعر و سخن کا ایک ادارہ بن گئے تھے۔ ان کی تربیت سے جو سخن سنج اُبھرے۔ ان میں شہہ زور کو یہ مرتبہ حاصل ہو گیا کہ اُستاد نے کشمیر اور ملحقہ علاقوں کے لئے انہیں اُستادی کی سند عطا کر دی چنانچہ اس نواح بہت سے نوجوان شاعر ان کے مشوروں سے مستفید ہو رہے ہیں۔ عروض، زبان کے نکات، محاورہ اور شعری اسالیب پر حضرت سیماب کو جو عبور حاصل تھا، اس سے شہہ زور نے پورا استفادہ کیا جس کا نتیجہ یہ ہے کہ انہیں فنی نکات پر جو قدرت حاصل ہو گئی ہے، وہ سیماب کے تلامذہ میں سے بہت کم ہی کو حاصل ہو سکی۔ لیکن شہزور محض فن کے کس بل پر شعر نہیں کہتے۔ بلکہ ان کا فطری ذوق انہیں شعر کہنے پر اُکساتا ہے۔

یہ صحیح ہے کہ شہزور کی ابتدائی تربیت غزل میں ہوئی اور غزل میں وہ اُستادی کا مرتبہ حاصل کر چکے ہیں لیکن ان کا شاعری کا تصور جامد نہیں۔ بلکہ وہ عہد کے ساتھ ساتھ نشوونما پاتا رہا۔ حسن و عشق کی ازلی اور ابدی آویزش حیات کی طرح شعر کی بھی محرک ہے لیکن شہزور کا مذاق سستے تغزل کا کبھی روادار نہیں ہو سکا۔ ان کی غزل محض روپ کے لحاظ سے غزل ہے۔ باقی اس میں انہوں نے اپنے عہد کے فنی اور سماجی شعور کو سمونے کی کوشش کی ہے۔ مثلاً ان کی مختلف غزلوں کے یہ چند شعر ہیں:۔

میرا گوہرِ سخن، جو ترے کان تک نہ پہنچا
مرے کم نصیب فن کا وہی شاہکار کیوں ہو

المدد اے تصورِ جاناں — تا بحدِ نظر ہیں ویرانے
یہ تعلق بھی کیا قیامت ہے — تم غریبوں سے ہو نہ بیگانے

نئی غزل کے اساتذہ کی طرح، شہزور بھی غزل کی رمزیت سے پوری طرح کام لینا چاہتے ہیں۔ ان کی ایک مرصع سی غزل ہے:-

دامانِ گلستاں پر ہے خزاں پھر سایہ فگن اب کیا ہوگا
آغوشِ چمن اور سرو سمن، یارانِ چمن اب کیا ہوگا

میخانہ نیا، ساغر بھی نئے، ساقی بھی نیا میکش بھی نئے
تجھ سے اک کیف نیا حاصل صہبائے کہن اب کیا ہوگا

آتی ہے عروسِ منزل کی زلفوں کی مہک پیہم، لیکن
محسوس عزائم ہونے لگی بے طرح تھکن اب کیا ہوگا

تقریر کی حسرت کیا کہئیے، تحریر پہ بھی جب قدغن ہو
بدخواہِ وطن ہیں، اہلِ وطن اے حُبِ وطن اب کیا ہوگا

ہستی کے تقاضے ناواجب، ایمائے اجل بے ہنگم ہے
کچھ ربط دماغ و دِل میں نہیں اے مشقِ سخن اب کیا ہوگا

طوفانِ خروش بد ذوقی اور زد میں یہ میری بزم
اے گنگ کے نغمو، کچھ تو کہو، اے رقصِ چمن اب کیا ہوگا

خونبار شفق ہے کیا جانے، کتنوں کا سہاگ اترا دن میں
ہے شام کے سر پر کالا کفن، اے شب کی دلہن اب کیا ہوگا

شاہی کا تفاخر رہنے دے، میں فقر پہ اپنے نازاں ہوں
جو نشہ چڑھا ہو ترشی سے وہ نشہ ہرن اب کیا ہوگا

شہزور وہ حق بیں وحق گو، منصور کا جو ہم مشرب ہے
اس سے ہیں خفا یارانِ وطن اے دار و رسن اب کیا ہوگا

قدیم اصنافِ سخن جیسے قطعہ اور رُباعی پر بھی شہزور نے طبع آزمائی کی ہے، لیکن اس میں کسی مخصوص صنف میں کلام چھوڑنے کی خواہش سے زیادہ، ان کی طبیعت کے رجحان کو دخل ہے۔ جب ایک مختصر مربوط خیال بندھنے پر مائل ہو جاتا ہے، تو وہ قطعہ یا رُباعی کی صنف سے کام لیتے ہیں دراصل یہ اصناف میں کلام ایجاز کا فن ہے اور شہزور کی استادانہ طبیعت اس گُر کو اچھی طرح جانتی ہے اور اس کو برتنے پر بھی قدرت رکھتی ہے۔ چند قطعے ہیں :-

جنوں میرا تو میرا ہی جنوں ہے	نہ کیوں حیراں ہوں ارباب ادراک
جنوں کا مظہر اکمل ہوں لیکن	گریباں ہے نہ دامن ہی مرا چاک

حدیث شوق میری مقتضی ہے	کہ اپنی زیست کے ٹکڑے ملاؤں
اگر زحمت نہ ہو اے موت آجا	میں اپنی عمر رفتہ کو منالوں!

ایک دو رُباعیاں ہیں :

بے سود ہے تہدید عقل و دانش	اور راہنما کی یہ جہد و کوشش
ٹھوکر ہی سکھاتی ہے سنبھل کر چلنا	تقویٰ ہے حقیقت میں شعور لغزش

اے بے خبر از موجود لا موجود	ہیں دہر میں لاکھوں دنیا نامشہود
محدود جہان ہو یہ ناممکن ہے	اک ذرہ نہیں اس دنیا میں محدود

شہزور کی شاعری کا عنفوان تھا، جب کشمیر میں ترقی پسندی کی تحریک چلی تھی اور نوجوان ادیب اور شاعر جوق جوق اس کی طرف کھینچ رہے تھے۔ شہزور کو نہ تجدد پسندی کا شوق تھا اور نہ ترقی پسند دور... صنف میں داخل ہو کر نام پیدا کرنے کا خیال، لیکن ان کا شعور

بیدار تھا، وہ طبقاتی کش مکش، اونچ نیچ اور غریب اور دولت مند کے فرق کو ایک اور نقطۂ نظر۔ اخلاقی نقطۂ نظر سے بھی نامناسب جانتے تھے؛ چنانچہ ان کی کئی نظموں اور غزلوں میں اس طرح کے اشارے ملتے ہیں: مثلاً یہ شعر:

حاکم سیل جبر ابھی تُند و تیز ہے — ہر اک دیار آج بھی محکوم خیز ہے
خواجہ پرست آج بھی مزدور ہے یہاں — پائے خُدائے زر یہ گدا سجدہ ریز ہے
خونخوار ذہن قیصر مغفور ہے ابھی — اے وقت! دورِ امن و سکوں دور ہے ابھی

شہزور کی فکر نے وسیع سرمایہ جمع کر رکھا ہے، ان کی نظموں کا ایک مجموعہ کشمیر اور کشمیری مناظر پر لکھی ہوئی نظموں پر مشتمل ہے، جس میں "وادیٔ کشمیر" "شالامار باغ"، "شفق شام جھیل ڈل کے کنارے" بظاہر کشمیر کے تعلق سے روایتی اور رسمی موضوع ہیں، لیکن کشمیر کے اس شاعر کے احساس میں کشمیر بسا ہوا ہے وہ مناظر سے گذر کر کشمیر کی روح تک بھی پہنچنے کی کبھی کوشش کرتا ہے، جس کا مظہر اس کی نظم "روحِ کشمیر" ہے۔ "پری محل" پر چند شاعروں نے نظمیں موزوں کی ہیں، قیصر نے اس پر ایک تصور یہ لکھا ہے۔ شہزور اپنی نظم میں اس اُجڑی عمارت کے موجودہ ماحول کا پورا شعور رکھتے ہوئے، اسے ماضی کی کچھ ایسی یادوں سے بساتے ہیں جو بیک وقت رومانی بھی ہیں اور تاریخی بھی۔ آج کی یہ اُجڑی عمارت کسی زمانہ شہنشاہِ ہندوستان کے جگر گوشے داراشکوہ کے پیر مُلا شاہ بدخشی اور ان کے معتقدین کے صوفیانہ اعمال اور اوراد کا مرکز تھا۔ شہزور اپنے پڑھنے والوں کے ذہن میں یہ تصور اس طرح پیدا کرتے ہیں:

بادۂ تقدیس کے ساغر چھلکتے ہیں یہاں — گُل چٹکتے ہیں یہاں، بُلبل چہکتے ہیں یہاں
عود کی خوشبو سے ہے ساری فضا مہکی ہوئی — انتشارِ کیف سے ساری فضا بہکی ہوئی
سُرخ رنگوں سے ہے یوں خاکِ چمن لپکی ہوئی — ہو چمن میں جس طرح گُل کی قبا دہکی ہوئی

امیرا کدل، سری نگر کا روباری مرکز ہے اور امیرا کدل کم شاعروں کے لئے کوئی دلچسپ موضوع فراہم کر سکا ہے۔ لیکن شہزور کا تخیل اس پل پر سے گذرتی ہوئی مخلوق کا تصور کر کے اسے

عجیب طرح سے رومانی فضا میں منتقل کر دیتا ہے۔ وہ اس فضا کو بیس بردوں کے قہقہوں اور ان کے لہراتے رنگین آنچلوں سے بسا کر بھی اس بنیادی حقیقت کو فراموش نہیں کرپاتے جو اس موضوع کو منتخب کرنے کی غایت ہے۔ وہ افلاس کی اُٹھتی ہوئی نظروں کو زر کے تودوں کی طرف بڑھتے بھی دیکھ لیتا ہے اور نغموں کی تہہ میں دبی دبی کراہ کو بھی سُن سکتا ہے۔ پھر خیالات کا سلسلہ اس حقیقت نفس الامری کی طرف رہبری کرتا ہے کہ:

یوں ہی یہاں سے جانے کتنے گذر گئے ہیں

آئے تھے یہ کہاں سے آکر کدھر گئے ہیں؟

تقسیم ہند کے بعد کے فسادات پر شہزور نے کچھ نظمیں کہی ہیں، جو اس موضوع کی اچھی نظموں میں سے ہیں۔ اقبال سے ہر صاحبِ فکر و نظر سخن سنج کی طرح شہزور بھی متاثر ہیں۔ چنانچہ ایک نظم میں انہیں خراج عقیدت پیش کیا ہے:

حکیم اُمتِ مرحوم، آشنائے راز — تھی جس کے فکر کے طایر کی عرش تک پرواز

وہ جس نے ذہن کی اُفتادگی کو رفعت دی — وہ جس نے فکر کی پژمردگی کو نُزہت دی

بلند جس نے کیا ہند میں نوائے خودی — وہ سارِ شرق کا اقبال، وہ خدائے خودی

شہزور اُردو کے شاعر ہیں اور ان سے بڑھ کر اس زبان کے حُسن اور اس کی اظہاری صلاحیتوں سے کوئی کم ہی واقف ہو سکتا ہے۔ اپنی ایک نظم میں، ان تاثرات کو وہ اُردو کی زبان اس طرح ظاہر کرتے ہیں:

میں نے جذبات کو کونین کی وسعت دی ہے

فکر کو کنگرہ عرش کی رفعت دی ہے

نطق کو کوثر و تسنیم کی عزت دی ہے

اور تخیل کو شادابی جنت دی ہے

تم مجھے قید بہ حدودِ ملک بدر کر دو گے

رہ سے ساغرِ امید مرا بھر دو گے!

سب کو اک مرکزِ اُلفت سے پُکارا میں نے
کیا کوئی روپ ہے ایسا، جو نہ دھارا میں نے
حیف تم غیر سمجھ کر مجھے ٹھکرا دوگے!
میری تذلیل کروگے مجھے شرما دوگے

غلام محمد میر طاؤس، جو غ۔م۔طاؤس کے نام سے ادبی دُنیا میں متعارف ہوئے، کشمیر کے اُن ادیبوں میں سے ہیں جنہوں نے، نئے عہد کے تقاضوں اور ادبی معیاروں کو بڑی خوبی سے جذب کیا۔ اور کشمیر کے ادبی اُفق پر شہاب ثاقب کی طرح نمودار ہوئے۔ اور شعر و ادب کی فضا کو روشن کیا۔ اس وقت بھی، اپنے سرکاری عہدہ کی ذمہ داریوں کے باوجود، شعر و ادب سے ان کا رشتہ منقطع نہیں ہوا۔ ان کے ادبی ذوق کی تربیت میں ماحول کے علاوہ، گھر کی فضا سے بھی بڑی مدد ملی۔ ان کے والد حاجی سیف اللہ میر کو بھی ادب سے دلچسپی رہی تھی، چنانچہ انہوں نے، "الف لیلہ" کی ایک کہانی کا منظوم ترجمہ "بدر الزمان" کے عنوان سے کیا تھا۔ گھر کی اس فضا نے جلد ہی طاؤس کو شعر کہنے پر مائل کیا اور کالج کی تعلیم کے دوران، طاؤس کے ذوق نے بال و پر پیدا کئے۔

طاؤس کی ولادت ۲۲ رمئی ۱۹۱۹ء کو پانپور کے اس قصبہ میں ہوئی جو اپنی کشت زعفران کی بدولت مشہور ہے۔ ۱۹۳۶ء میں جب وہ انٹرمیڈیٹ جماعت کے آخری سال میں تعلیم پا رہے تھے۔ انہوں نے شعر کہنا شروع کر دیا۔ ان کی کہی ہوئی غزلیں اور نظمیں پہلے پہل کالج کے رسالے "پرتاپ" میں اور بعد میں ملک کے رسالوں اور اخباروں میں شایع ہونے لگیں۔ سری پرتاپ کالج میں انہوں نے تعلیم پائی اور اپنے کالج کے رسالے "پرتاپ" کے وہ ایڈیٹر بھی چنے گئے تھے۔ ان کے ایک ہم عصر، شیخ غلام علی بھی ادب اور شاعری سے لگاؤ رکھتے تھے۔ ان دونوں دوستوں نے ایک ساتھ طاؤس اور بلبل کے تخلص اختیار کئے تھے

جس کا محرک اقبال کا یہ مشہور شعر ہوا:

کر بلبل و طاؤس کی تقلید سے توبہ

بلبل فقط آواز ہے، طاؤس فقط رنگ

پہلے پہل یہ مذاق تھا لیکن رفتہ رفتہ جب ان دونوں کے تخلص نے شہرت حاصل کر لی، تو پھر یہ حقیقت بن گیا۔ غلام محمد میر، طاؤس اور شیخ غلام علی، بلبل ہی مشہور ہو گئے۔

بی۔ اے۔ کامیاب کرنے کے بعد طاؤس نے علی گڈھ سے اُردو میں ایم۔ اے اور ایل ایل بی کے امتحانات پاس کئے اور ۱۹۴۷ء میں حلقۂ ملازمت میں داخل ہو گئے۔ پانچ سال نایب تحصیلدار رہے اور پانچ سال تحصیلدار، چار سال، اسسٹنٹ کمشنر، کچھ عرصہ محکمۂ امدادِ باہمی میں جوائینٹ رجسٹرار بھی رہے۔ اس کے بعد ڈپٹی کمشنر اور محکمۂ فوڈ کنٹرول کے ناظم، محکمۂ صنعت و حرفت کے معتمد ہوئے اور اب ریاست کے محکمۂ امورِ داخلہ کے سیکرٹری ہیں۔[1]

طاؤس کی شاعری کی ابتداء غزل سے ہوئی تھی لیکن نئے عہد کے شعور اور نئی تحریکوں کے اثر نے ان کی غزل کو بھی فکر اور اسلوب، ہر لحاظ سے عصری تقاضوں کے ہم آہنگ بنا دیا۔ اسی لئے ان کی ابتدائی غزلوں میں بھی ان کے ذاتی تجربوں اور مشاہدوں کا پَرتو ملتا ہے۔ اپنے عہد کے تقاضوں نے ان کو نظم کہنے پر بھی مایل کیا اور جلد ہی ان کے اپنے ذاتی تجربوں نے نظم کو ایک انفرادی رنگ بخش دیا۔ ان کی فکر اقبال اور کسی حد تک حفیظ جالندھری سے بھی متاثر رہی۔ ایک نظم جو طاؤس نے "آرزو" کے عنوان سے لکھی ہے، اس کی زمین تو غالب کی مشہور زمین ہے۔ لیکن ان کا آہنگ اقبال کا ہے۔ اس نظم میں وہ بھی آبادی سے دور، ایک محفل سجانے کی آرزو کرتے ہیں، جس میں غیر کا گذر نہ ہو اور یہاں وہ سکونِ دل تلاش کرنا چاہتے ہیں:

زندگانی میں میسر ہو مجھے دل کا سکوں　　موت آجائے تو مر کر نوحہ خواں کوئی نہ ہو

اہلِ یورپ کے تہذیب و تمدن کے علمبردار ہونے کے دعویٰ کا انھوں نے اپنی نظم "یورپ اور جنگ"

---

[1] طاؤس اب وظیفہ حُسنِ خدمت پر ہیں اور ان کا شعری مجموعہ "کنج" شائع ہو چکا ہے

ہیں اس طرح مضحکہ اُڑایا ہے:

بسے اہلِ جہاں سرچشمۂ تہذیب کہتے تھے
وہ جس کی خام کاری کو نئی ترکیب کہتے تھے

اُخوت اور آزادی پہ کہتے تھے جو قرباں ہیں
وہی قومیں معاذ اللہ بہم دست و گریباں ہیں

جنہیں دعویٰ تھا دنیا بھر میں اپنی رہنمائی کا
وہ رونا رو رہے ہیں آج اپنی نارسائی کا

بھلا تہذیبِ حاضر کا یہی انجام ہونا تھا
ہزاروں بے گناہ لوگوں کا قتلِ عام ہونا تھا

یہ شاعر جو بعض لمحات میں دُنیا کی محفلوں سے اُکتا گیا تھا، حقیقتاً زندگی کا قدرداں اور اس کا پرستار بھی ہے اور غالب کی طرح جنہوں نے نامساعد حالات میں بھی زندگی کی صحیح قدر جانی تھی، اور کہا تھا:

نغمہ ہائے غم کو بھی، اے دِل غنیمت جانیئے
بے صدا ہو جائے گا یہ سازِ ہستی ایک دِن

طاؤس اپنی ایک نظم میں، جس کا عنواں ہے "مجھے جینے سے اُلفت ہے" ایک حقیقت پرست اہلِ فکر کی طرح، اپنے اطرافِ مظلومی، ناداری اور نارسائی کے مناظر کو دیکھتے ہوئے بھی، زندگی کے امکانات سے منکر نہیں ہیں۔ ان کی یہ نظم، حسین نظموں میں سے ہے۔ چند اشعار میں وہ پہلے ایک پس منظر اس طرح پیدا کرتے ہیں:

قسم اس آہ کی، جو رات کی گہری خموشی میں
کسی مظلوم کے مجروح سینے سے نکلتی ہے

قسم اس آرزو کی جو ہنگام سحر گاہی
ہزاروں حسرتوں کی گود میں کروٹ بدلتی ہے
قسم اس شوق کی جو مضمحل ہوتا ہے منزل پر
قسم اس آس کی جو یاس کے سایہ میں پلتی ہے
قسم اس جبر کی جو روح کو پامال کرتا ہے
قسم اس تیغ کی جو ظلم کے سانچے میں ڈھلتی ہے
قسم اس قوم کی جو آفتوں صدموں کے نرغے میں
یکایک اُٹھ کے گرتی ہے، مگر گر کر سنبھلتی ہے
قسم اس زندگی کی جو وبالِ روشِ ہوتی ہے
قسم اس موت کی جو ہر تمنا کو مسلتی ہے

مجھے اس خاکداں سے پھر بھی بے پایاں محبت ہے
یہ جینا کچھ بھی ہو، لیکن مجھے جینے سے اُلفت ہے

اپنے وطن کی سرزمین کی روایتی اور تاریخی اہمیت اور اس کے زعفران زاروں کے دلکش مناظر پر طاؤس کی ایک عمدہ نظم "چندہ ہار" کے عنوان سے لکھی گئی جس کا مرکزی کردار حبہ خاتون ہے۔ یہ نظم ۲۱ مئی ۱۹۵۸ء ملکہ حبہ خاتون کی یادگار کے طور پر چندہ ہار میں جو دن "حبہ خاتون ڈے" کے نام سے منایا گیا تھا۔ اس موقع کے لئے لکھی گئی تھی۔ اس کے چار بند ہیں۔ پہلا بند ہے:

یہ گاؤں جس میں آج ہمیں یہ جشنِ بہاراں لایا ہے
یہ گاؤں جس کی راہوں پر اک نقش نکھرتا آیا ہے
یہ گاؤں، جس کی مٹی نے اکبر کا رُتبہ پایا ہے
یہ گاؤں جس کو کھو کر ہم نے قسمت سے پھر پایا ہے

اک بار یہاں اک ماہوش نے جب درد کے نغمے گائے تھے   افلاک نے سینہ کھولا تھا، انوار کے سائے چھائے تھے

ان ٹیڑھے، ترچھے کھیتوں پر جب حسنِ بہاراں مچلا تھا
اس گیلی پیلی مٹی نے اک شوخ شرارہ اُگلا تھا
جب آنگن میں اک کٹیا کے اک شہہ کا پاؤں پھسلا تھا
اک درد کا لاوا اُبلا تھا، اک نورِ مجسم پگھلا تھا
اک ساتھ جو دو دل دھڑکے تھے، اگر دونے دیپ کے بجھے تھے   یا چاند زمیں پر اترا تھا آکاش پہ نغمے پھیلے تھے
وہ راتیں اپنی راتیں تھیں، وہ دن تھے گو ارمانوں کے
کچھ قصے شعر و سخن کے تھے یا باغوں کے بستانوں کے
دیوانوں کی نیندوں میں پر سپنے تھے فرزانوں کے
ہاں اپنے غم سے بھی بڑھ کر غم پیارے تھے انسانوں کے
دربار میں طبلے بجتے تھے، سنگیت کی ندیاں بہتی تھیں   سرکار کی پرجا ہنستی تھی اشعار میں دنیا بستی تھی

—— ماضی کے حسین خوابوں سے حال کا شعور اسے جگا دیتا ہے:

پھر آندھی کے اک جھونکے نے اس سارے محل کو ڈھایا تھا
آشاؤں پر اوس پڑی تھی، من کا چمن مرجھایا تھا
صبح کی باتیں ہو ہی رہی تھیں، شام کا سایہ چھایا تھا
کیا جانیں ہم اس نورِ نظر کو، کس کی نظر نے کھایا تھا
پھر فرش کے ذرے، عرش کے تارے، وقت کے دھارے روئے تھے   اک زور کا محشر ٹوٹا تھا، اسلاف ہمارے روئے تھے

طاؤس کی بعض نظموں جیسے "کش مکش" وجود میں حفیظ کی چھوٹی چھوٹی بحروں والی نظموں کی سی پھریری ہے لیکن ایک نظم جو انہوں نے حفیظ کی مشہور نظم "ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا" کی زمین ہی میں کہی ہے، گویا حفیظ کی نظم کا تکملہ کیا ہے۔ غزل میں بھی ان کا جیسا تیکھا انداز نشوونما پایا تھا۔ اس کا اندازہ ایک غزل کے ذیل کے اشعار سے ہو سکے گا۔

اگر بہار آگئی، پھول کھلے ہیں تو ہو   دیکھیے اب تارِ رگ دیکھیے گلستاں ہو

وادیٔ کوہسار میں زمزمہ سنج ہیں طیور! نغمۂ آبشار سے گونج رہے ہیں کوبہ کو
مستی و کیفِ بے خودی سوز و سرور و اشتیاق جام بکف ہے شاخِ گُل، جھوم رہے ہیں لالہ رو
میں ہی ہوں ایک تشنہ کام محفلِ انبساط میں مضطرب و شکستہ جام، منتظر و تہی سبو
آہ کہ تیرے بغیر ہے میرا شباب سوگوار تیرے بغیر نوحہ خواں کشتِ گُل و کنارِ جو

طاؤس کا تنقیدی شعور بھی نکھرا ہوا ہے، اس کے علاوہ وہ اچھے مضمون نگار اور انشائیہ نگار بھی ہیں۔ ان کی تنقیدی صلاحیتوں پر بعض مضامین اور خاص طور پر ان کے اس تعارف سے روشنی پڑتی ہے، جو میر غلام رسول نازکی کے کلام کے مجموعے "دیدہ تر" پر لکھا ہے۔ یہ تعارف جدید تنقیدی شعور اور پاکیزہ ادبی تصورات کا آئینہ دار ہے۔ اس سے طاؤس کے ایک مخصوص اسلوب اور مطالعے کی وسعت پر روشنی پڑتی ہے۔ ایک اقتباس ہے:
مجموعے کی اشاعت کا خیر مقدم کرتے ہوئے لکھتے ہیں :-

"آج پہلی بار، آپ اپنے منتخب کلام کا مجموعہ شایع کروا رہے ہیں اور آج ہی پہلی بار ہمالیہ کی بلندیوں پر جدید اُردو شاعری کی تاریخ کا ایک نیا ورق اُلٹا جا رہا ہے۔"

آگے شاعری کا جائزہ ہے۔ پھر لکھتے ہیں :

"ناکام جوانی اور نامراد زندگی کے ماتم کے ساتھ ساتھ شاعر کا حساس دِل گرد و پیش کے حسین و جمیل مرقعوں سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ فطرت کے میزبان کی انوکھی نوازشات گاہے بہ گاہے روتے رُلاتے مہمان کو بھی اپنی طرف کھینچ ہی لیتی ہے . . . . . ."

جشنِ حبہ خاتون کے موقعہ پر طاؤس نے ایک مضمون بھی لکھا تھا، جس میں شعر و نغمہ کی اس ملکہ اور اسی سرزمین کی ایک اور صاحبِ دِل للہ عارفہ کو خراجِ تحسین پیش کیا ہے۔ ان دونوں کی زندگی میں مماثلتوں پر روشنی ڈالتے ہیں:

”دونوں نے اپنے ناسازگار ماحول کی باتیں اشعار کے روپ میں کہیں.... مگر مجموعی اعتبار سے للہ عارفہ کی شاعری کا رنگ اور ہے اور حبہ خاتون کا اور ـــ ایک نے اُس دُنیا کی باتیں کہیں، دوسری نے اِس دنیا کی. للہ عارفہ نے آسمانی نغمے گائے. حبہ خاتون نے چلتی پھرتی دنیا کی عکاسی کی. حبہ خاتون کے کلام کے پیچھے ابتداء سے آخر تک ایک عورت کا دِل دھڑکتا نظر آتا ہے. اس کی شاعری کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اس دور میں جب شعر گوئی کو عام طور پر تصوّف اور معرفت کے دقیق مسایل بیان کرنے کا ایک ذریعہ سمجھا جاتا تھا. حبہ خاتون نے اُٹھتی، اُبلتی اور مٹتی جوانی کے ترانے گائے ۔

ان کا ایک اور اچھا مضمون جو انشائیہ کا انداز رکھتا ہے ”کش مکش“ کے عنوان سے لکھا گیا ہے[1]

شیخ غلام علی بُلبل، جن کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے، اچھی شعری صلاحیتوں کے مالک ہیں. ان کا وطن بانڈی پور، جو میر غلام رسول نازکی کا بھی وطن ہے اور اس سرزمین سے مختلف اوقات میں قابلِ اعتناء سخن سنج اُٹھے۔ بلبل سری پرتاپ کالج کے ممتاز طلباء میں سے تھے اور اپنے ادبی ذوق کی وجہ سے کالج کے رسالے ”پرتاپ“ کے ایڈیٹر بھی منتخب ہوئے تھے. تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد وہ سکول میں ملازم ہو گئے تھے۔ تقسیم ہند کے زمانے میں وہ بلتستان میں متعین تھے. وہیں سے پاکستان چلے گئے۔ بُلبل بھی زمانۂ طالبِ علمی سے شعر کہنے لگے تھے۔ وہ فارسی اور اُردو دونوں زبانوں میں کہتے ہیں۔ سری پرتاپ کالج کے رسالے ’پرتاپ‘ میں ان کا ابتدائی کلام شایع ہوا ہے. جس کے حصّہ اُردو کے وہ ایڈیٹر بھی رہے. تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد، وہ ریاست کے محکمۂ تعلیم میں ملازم ہوئے۔ تقسیم ہند کے ہنگاموں کے زمانے میں بلبل بلتستان کے ایک سکول میں کام کر رہے تھے۔ اسی زمانے میں پاکستان چلے گئے۔ ان کی غزل کے چند شعر ہیں:۔

---

[1] :۔ طاؤس کا مجموعہ کلام ”موج موج“ ۱۹۸۲ء میں شایع ہو گیا ہے ۔

رو رو کے میں جگاؤں سوتوں کو خوابِ شب سے

اے میری چشمِ گریاں شمع مزار بن جا

اے نارِ اشک بڑھ کر موتی کا ہار بن جا

بلبلؔ نے ایک منظوم خط میر غلام رسول نازکی کے نام لکھا تھا۔ جن سے ان کے گہرے مراسم تھے۔ اس کے ابتدائی دو شعر اور آخری شعر درجِ ذیل ہے:

مجھ سے کیا تقصیر سرزد ہو گئی !	بندہ پرور ظلم کی حد ہو گئی
ڈاکیئے کا راستہ کب تک تکوں	تو ہی کہہ میں صبر کتنا کر سکوں

. . . .

نازکی چشم نثارِ بلبل است	حیف بلبل کشتۂ نازِ گل است

طاؤسؔ اور بلبلؔ کے ہم عصر مفتی ضیاء الدین ضیاؔء پونچھی بھی فارسی اور اردو میں شعر کہتے ہیں اور ان کا کلام بھی کالج کے رسالے "پرتاپ" میں شایع ہوتا رہتا تھا۔ تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد وہ ریاست کی عملی سیاست میں بھی حصہ لیتے رہے۔

کالج کی تعلیم ختم کرنے کے بعد، جب وہ کالج چھوڑ رہے تھے، ضیاؔء نے ایک نظم "الوداع" کے عنوان سے کہی تھی جس کا آغاز اس مصرعے سے ہوتا ہے:

"آسمان علم کے روشن ستارو الوداع"

نظم کا ایک شعر ہے:

کان کھٹ کھٹ سے تمہاری ہونگے اب ناآشنا	اے کالج کے نیر دارو، نجارو الوداع

ثناء اللہ عاجزؔ کاشمیری خوش فکر شاعر ہیں۔ ان کی غزلیں ملتی ہیں اور غزل میں ان کو اچھی دسترس حاصل ہے۔ نفیس نفیس غزلیں کہی ہیں۔ ایک غزل کے شعر ہیں:

برقِ جمالِ طور سے بے خود ہوئے کلیم!

میں کھیلتا ہوں ایسے نظاروں سے رات دن

اک اختلاف مجھ کو بہارِ چمن سے ہے
وابستگی ہے ورنہ بہاروں سے رات دن
کچھ بے خودی سی آگئی بیداریوں میں اب
کیف آشنا جو دل ہے نظاروں سے رات دن

گردھاری لال آنند تمنا، جموں کے شعراء میں اچھے کہنے والوں میں سے ہیں۔ غزل اور نظم دونوں کہتے ہیں۔ ان کی ایک نظم جو "محاذِ جنگ" کے ماتھوں کے عنوان سے لکھی گئی ہے اس کا ایک بند ذیل میں درج ہے۔ یہ ہند کے ایک نوجوان کی زبانی ہے:

میری جرأت پر ہر اک پیر و جواں کو ناز ہے
میرے عزمِ مستقل پر کل جہاں کو ناز ہے
میری ہمت پر زمیں کیا آسماں کو ناز ہے
میرے استقلال پر ہندوستاں کو ناز ہے

مجھ سے اکثر لیتے ہیں بیدادگر راہِ فرار
خس بدنداں ہیں مرے آگے ستمگر بد شعار

تنہا انصاری، جن کا ابھی دو سال قبل انتقال ہوا، وادی کے سربرآوردہ شعراء میں سے ہیں۔ وسیع اصناف میں اور گوناگوں موضوعات پر انہوں نے طبع آزمائی کی۔ غزل اور نظم دونوں میں انہیں اونچا مقام حاصل تھا۔ کلاسیکی انداز کے مرثیوں میں شاید کشمیر وہ واحد سربلند شاعر مانے جاتے تھے۔ تنہا کا پورا نام حسین علی انصاری تھا۔ ولادت ۱۹۰۲ء میں بارہمولہ کے قصبہ دلنہ میں ہوئی۔ ان کے دادا اترپردیش سے تجارت کے سلسلے میں سری نگر آئے اور یہیں رہ گئے تھے۔ انہیں کبھی شعر و سخن سے لگاؤ تھا۔ والد اُردو، فارسی اور عربی میں دستگاہ رکھتے تھے اور ریاست کے ایک سرکاری ہائی سکول میں مُدرّس تھے۔ اس طرح تنہا کا ذوق علم و ادب آبائی تھا۔ ان کی تعلیم پہلے [illegible] میں ہوئی پھر سری نگر میں تکمیل کی [illegible] میٹرک [illegible] منشی فاضل

اور ادیب فاضل کے امتحانات کامیاب کئے۔ بعد میں انگریزی کے امتحانات کامیاب کر کے بی۔اے اور بی ٹی کی سند حاصل کی۔ تعلیم کی تکمیل کے بعد محکمۂ تعلیم سے وابستہ ہو گئے۔ اور عمر بھر درس و تدریس کی خدمت انجام دیتے رہے۔ انتقال کے وقت وہ سوپور کے کلیہ اساتذہ کے صدر تھے۔

گھر کے حالات نامساعد ہونے کے باوجود، تنہاؔ کو بچپن سے شعر و سخن سے لگاؤ رہا۔ ان کی فکرِ شعر کی ابتداء بھی رواج کے مطابق غزل سے ہوئی۔ ابتداء میں رومانی اور روایتی انداز کی غزلیں کہتے تھے لیکن زبان اور اظہار پر قدرت اس وقت بھی نمایاں تھی۔ عہد کے اقتضاء نے ان کی فکر کو نئی راہوں پر لا ڈالا اور اس میں اقبالؔ کے کلام کے مطالعے کا بہت اثر تھا۔ تنہاؔ کی فکر کا دائرہ جب وسیع ہوا۔ تو اس میں اپنے عہد کی ساری تحریکیں سمٹ آئیں۔ ان کی ایک غزل کے چند شعر ہیں:۔

نہ پوچھ ہم جیتے ہیں کیونکر تری رنگین دُنیا میں
سسکتی زندگی ہے اور زباں خاموش ہے ساقی

سمجھ کر بادۂ گلرنگ پی لیتا ہوں خونِ دل
زباں خاموش، زخموں سے جگر گلپوش ہے ساقی

تھے وہ بھی دن کہ اپنے دل میں ہنگامے مچلتے تھے
ہوئی مدت کہ یہ کمبخت بھی خاموش ہے ساقی

وہاں خُم اور یہاں قطرے، ترا انصاف بھی دیکھا
یہ پامالِ ستم تنہاؔ تو دریا نوش ہے ساقی

نئے شعور کے طلوع ہونے کے بعد، بہت سی غزلیں تنہاؔ نے ایسی بھی لکھی ہیں جن میں فکر کا پورا تسلسل نہیں۔ آہنگ کا تسلسل ملتا ہے۔ اس طرح کی ایک غزل "نظر کی نوازش کے اُمیدوار" کے عنوان سے "گلریز" (سرینگر، جولائی ۱۹۵۲ء) میں شائع ہوئی تھی۔ یہ فکر اور اسلوب ہر لحاظ سے

تنہا کی اچھی غزلوں میں سے ہے۔ اس کے کچھ شعر ہیں:

خدا کے حوالے سدھارو سدھارو — مری آرزوؤں کی رنگین بہارو

نہ گھیرو، تصور پہ شبخوں نہ مارو — مچلتے ہوئے آنچلوں کے کنارو

حماقت ہے اب ذکرِ رخسار و گیسو — طلسم محبت کے پروردگارو

تلاشِ نظر اک فریبِ نظر ہے — نظر کی نوازش کے امیدوارو

تنہا نے اپنی بہت سی نظموں میں اپنے ماحول کے منظری احساسات اور مسایل کے ردِ عمل کو بھی جگہ دی ہے اور ترتیب کے لئے تجربوں کے تاثرات بھی ان کی شاعری میں نمونے ملتے ہیں ان کی ایک نظم میں جو "احساسِ بہار" کے عنوان سے لکھی گئی ہے رشاعر کے داخلی ردِ عمل سے بہار کی آمد کے قراین ملتے ہیں۔ یہ نظم طویل ہے اور نو بند پر مشتمل۔ ایسی طویل طویل نظمیں تنہا نے کئی لکھی ہیں لیکن ان کو پڑھتے ہوئے کہیں آورد کا شایبہ نہیں ہوتا۔ مذکورہ بالا نظم کا ایک بند ہے۔

پھر کہیں سے آج بوئے زلفِ یار آئی ہے دوست
بہکی بہکی سی ہوا دیوانہ وار آئی ہے دوست
دعوتِ دیوانگی، پھر اب کی بار آئی ہے دوست
پھر مری دنیا میں دنیائے شرار آئی ہے دوست
ایسا کچھ محسوس ہوتا ہے بہار آئی ہے دوست

اس نظم کے مقابلے میں، چاندنی رات میں جھیل ڈل کی سیر، کشمیر کی حد تک ایک روایتی موضوع ہے لیکن تنہا نے اس میں اپنے ذاتی مشاہدات اور اندازِ بیان سے ایک انفرادیت پیدا کر دی ہے۔ یہ نظم بھی طویل ہے اور اٹھارہ بند پر مشتمل ہے۔ چاندنی رات اور جھیل ڈل کی سیر، کسی ذہن میں بھی رومان کی بھرپور فضا پیدا کر سکتی ہے۔ تنہا کے تاثرات ذیل کا حسین پیرایہ اختیار کرتے ہیں:

اُف، وہ تابندہ جبیں لمحے، نظر افروز رات

وہ سکوں رومان پرور، وہ تغیر بے ثبات
جیسے زد پر حسن کی، آ کر رکی تھی کائنات
ہائے وہ اعجازِ منظر، نغمہ بن جاتی تھی بات
میکدہ بردوش وہ معصوم سیلِ رنگ و بو
دفعتاً چھلکا دیا تھا جس نے جامِ آرزو

"حسینؑ ابن علی کی پھر ضرورت ہے زمانے کو" میں اقبال کے اندازِ فکر اور جوش کا آہنگ ہے۔ اپنے عہد کی "یزیدیت" سے نبرد آزما ہونے کے لئے وہ حسین ابن علی کی ضرورت کو محسوس کرتے ہیں۔ کہتے ہیں:

کمر بستہ ہیں سرگرمِ عمل ابلیس کے چیلے
جہاں میں نقشِ یزداں قلبِ انساں سے مٹانے کو
نظامِ اہرمن چالاک ہے صورت بدلنے میں
نیاں ہے روحِ چنگیزی یہاں قالب میں آنے کو
کہو شبیرؑ سے میداں میں پھر للکارنا نکلے
یزیدِ عصر ہے تیار، خنجر آزمانے کو
یزیدیت، قبا جمہوریت کی زیب تن کر کے
اٹھی ناز و ادا سے پھر نیا اک گل کھلانے کو

تنہا نے کئی اچھے مضامین بھی لکھے ہیں، چند انشائیے اور ایک اہم موضوع پر ان کی تصنیف بھی قابلِ ذکر ہے۔ ان کی کتاب جو "تعلیم زبان" کے نام سے موسوم ہے معلمین کے اسکولوں کے طالب علموں کو زبان کے مطالعے اور اس کی تعلیم کے مقصد سے ۱۹۵۸ء میں چھاپی تھی۔ اس کتاب میں زبان اور اس کی اہمیت پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

"زبان کی قوت نے دنیا میں بڑے بڑے تاریخی، سیاسی، مذہبی اور سماجی

انقلاب پیدا کئے ہیں۔ چنانچہ اس عالمِ آب و گِل میں پیغمبروں، اوتاروں،
اور مذہبی پیشواؤں کی تبلیغ کا اگر کوئی ذریعہ ہے تو وہ زبان ہی کہلاتا ہے،
روئے زمین پر وقت وقت پر پیدا ہونے والے سیاسی رہنما، فلاسفر اور
مُفکر بھی، اسی حربے سے کام لے کر آج تک دنیا والوں کو اپنے خیال، عزم
یا فلسفے سے نہ صرف متاثر کرتے رہے بلکہ انہیں اپنا ہمنوا بھی بناتے رہے۔...“

سرزمین کشتواڑ کے شعر و ادب اور تصنیف و تالیف کا ذوق رکھنے والوں میں غلام رسول
کامگار بھی ہیں وہ حضرت[1] حمزہ کے حلقہ معتقدین سے تعلق رکھتے ہیں، چنانچہ انہوں نے حضرتِ
مخدوم شیخ حمزہؒ کی منقبت میں بابا داؤد خاکی کے مشہور فارسی قصیدہ ”وِردُ المریدین“ کا اُردو
میں منظوم ترجمہ کیا ہے، جو ۱۹۶۶ء میں میرزا کمال الدین شیدا کے مقدمے کے ساتھ شائع ہوا ہے۔
شیدا، کامگار کا تعارف کراتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

”کامگار، ہماری ریاست کے ان چند بزرگوں میں سے ہیں، جن کی قدامت
پسندی، وضعداری، متانتِ طبع اور خوش مذاقی تہذیبِ رفتہ کی آئینہ دار ہے“

کامگار کا اُردو ترجمہ ۳۲۳ اشعار پر مشتمل ہے۔ ترجمے کے ختم پر ”عرضِ مترجم“ کے عنوان
سے لکھتے ہیں:۔

پیشِ سُلطان تحفہ ناچیز لایا کامگار — جیسے اک پائے مَلخ نزدِ سلیماں، مورِ زار
کاشمیری ہوں، مریدِ خاکی عالی تبار — مولد و مسکن ہے اپنا سرزمینِ کشتوار

سالِ ترجمہ کے بارے میں لکھا ہے:۔

ابتدا تو فروری کے آخری ہفتہ میں کی
عین وزا دسین سالِ عیسوی کا ہے شمار

ترجمہ مثنوی کی شکل میں کیا ہے۔ کچھ ابیات ہیں:

کاملینِ فقر کی ساری ظرافت اور ہنسی — حکم پیغمبر سے گویا ہے خدا کی بندگی

---

[1] سروری صاحب کا روئے سخن حضرت مخدوم حمزہ کشمیری کی طرف ہے جو سید نہیں

ان کی خود داری ہے واضح کھول قرآنِ عظیم — ہیں غنی ان کو سمجھتے گرچہ جاہل و لئیم!

بہرِ جماعت تو ہر اک کے واسطے ہے خیر خواہ — ان کے جو دشمن ہیں وہ اپنے عدو ہیں خواہ مخواہ

کامگار اُردو کے علاوہ کشمیری اور فارسی میں بھی شعر کہتے ہیں۔ ان کا تعلق کشتواڑ کے ایک صاحبِ علم و عمل خاندان سے ہے اور حضرتِ شیخ حمزہ مخدوم اور ان کے خلیفہ حضرتِ شیخ بابا داؤد خاکیؒ سے انہیں بے پناہ عقیدت ہے [۲]

غلام احمد فاضل کاشمیری، وادی کے اُردو کہنے والوں میں ایک ممیز مقام رکھتے ہیں۔ ان کی ولادت کا سن ۱۹۱۶ء ہے اور وطن سری نگر۔ ابتدائی تعلیم کی تکمیل کے بعد سری پرتاپ کالج میں داخل ہوئے اور بی۔ اے کی تکمیل یہیں سے کی۔ کالج کی تعلیم کے زمانے ہی سے ان کا ادبی ذوق نمایاں ہونے لگا تھا۔ چنانچہ وہ کالج کے رسالے "پرتاپ" کے حصۂ اُردو اور حصۂ کشمیری کے مدیر بھی رہے اور رسالے کے معیار کو اونچا کرنے کی کوشش کی۔ اس زمانے میں ان کا کلام رسالے میں چھپتا رہا۔ سنہ ۱۹۳۴ء سے لے کر سنہ ۱۹۳۸ء تک کا اُردو کلام مجموعے کی صورت میں "گلدستۂ فاضل" کے عنوان سے شایع ہوا، جو غزلوں اور نظموں پر مشتمل ہے۔

تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد، فاضل محکمۂ تعلیم میں ملازم ہو گئے۔ اسی دوران انہوں نے بی ٹی کا امتحان کامیاب کیا، اور مدرسی سے ترقی کرتے کرتے، ہیڈ ماسٹر کے عہدہ پر مامور رہے۔ اور وظیفہ حسنِ خدمت پر ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔ اس کے بعد وہ فیلڈ پبلسٹی سروے کے محکمے میں کچھ عرصہ کام کرتے رہے، اس وقت بھی انسٹی ٹیوٹ آف ایجوکیشن، سری نگر میں برسرِ خدمت ہیں۔ [۱]

فاضل اب کشمیری میں لکھ رہے ہیں اور اس وقت تک کئی کتابیں اور رسالے تصنیف کر چکے ہیں۔ ان کے اُردو کلام کے مجموعے "گلدستۂ فاضل" کے علاوہ ان کا ایک اور رسالہ جو منثور کلام پر مشتمل ہے، شایع ہو چکا ہے۔ اس رسالے میں وہ اپنے ایک دوست ڈاکٹر کاشی ناتھ

---

[۱] : فاضل صاحب اب سرکاری ملازمت کی پابندیوں سے آزاد ہیں۔

[۲] : کامگار کا چند ماہ پہلے طویل عمر میں انتقال ہو گیا ہے

میڈیکل آفیسر شنگر، اسکردو کو، وطن میں جو دلچسپ ساعتیں باہم گذاری تھیں۔ ان کی یاد دلاتے ہیں۔ ان نثری پاروں میں بھی، فاضل کا شاعرانہ ذہن کارفرما ہے۔ رسالے کا نام "اپنے وطن میں" رکھا ہے۔ اس کا آغاز اس طرح ہوتا ہے:

اپنے وطن میں

شاید بھیگی ہوئی پُر کیف شام شالامار میں !
شاید دھڑکتے ہوئے دِل کے تقاضے پر پہلوئے آبشار میں
شاید پُرسکوں لاجوردی دامنِ کوہسار میں
شاید نَو شگفتہ غنچوں کی انجمن پر بہار میں
بیٹھ کر

اے میرے دوست
ہم اپنی فردوسِ زندگی کی چند گھڑیاں شالامار میں
گذاریں گے، فواروں کا مچلنا ، کلیوں کا چٹکنا
اور عنادِل کا چہکنا ... اُف، دامنِ لالہزار میں
شام رنگیں کی یہ جلوہ آرائیاں اور نیچر کی یہ
بو قلموں رعنائیاں ... وہ ہیں جن کی یاد ہماری
زندگی کے لمحات میں اب تک انگڑائیاں لے رہی ہے

اس طرح وہ مختلف مقامات میں بیتے ہوئے لیل و نہار کی یادیں دلاتے جاتے ہیں۔

فاضل کی ایک اور مبسوط اور مستقل تصنیف "تصویرِ حج" ہے، جس میں حج کے مناسک، اخراجات اور دوسری اہم تفصیلات قلمبند کی ہیں۔ اس کتاب کی وجہ تالیف کے سلسلے میں فاضل نے لکھا ہے کہ ان کے ایک دوست، حاجی عبدالعزیز وگے ساکن ہری پورہ علاقہ حمل، بارہمولہ ۱۹۵۶ء میں حج کے فریضہ سے فراغت پاکر جب وطن لوٹے، تو فاضل ان

سے ملنے گئے۔

" ان کے دیوان خانے میں ملاقاتیوں کا ہجوم تھا۔ میں نے اس موقع پر اپنی ایک نعت " رحمتہ للعالمین " سنا کر فلسفہ حج سے متعلق ایک مختصر سی تقریر کی۔ دل پسیج گیا، آنکھیں بھر آئیں اور اخیر میں لرزتے ہوئے لبوں سے دعا کی۔

" اے دلوں کی خاموش صداؤں کو سننے والے جس طرح تو نے ؤگے صاحب کو حج کی نعمت سے نوازا، اسی طرح مجھے بھی اس عنایت سے سرفراز کر۔ ۔ ۔ "

خیال مستحکم ہونے کے بعد، فاضل نے حج کے مناسک سے متعلق معلومات فراہم کرنے کی کوشش شروع کی، لیکن جو کتابیں انہیں ملیں اور جو معلومات انہیں زبانی فراہم ہوئیں، ان سے تشفی نہیں ہوئی۔ اس طرح اس کتاب کی تصنیف کا آغاز ہوا۔ اور حج سے لوٹ کر اس کی تکمیل کی۔

کشمیری میں فاضل کی نظموں کے کئی مجموعے، رسالے اور ڈرامے شایع ہو چکے ہیں ان میں قابل ذکر " نغمہ زار " " ساغر مستی " " تصویر غم " " شام وطن " ہیں۔

فاضل کو اردو غزل اور نظم دونوں پر یکساں قابو حاصل رہا۔ وہ شعر کی تکنیک، عروض کی پابندیوں اور دوسرے شعری ضروری لوازم کا خاص طور پر لحاظ رکھتے ہیں۔ اسی لئے کلام میں اساتذہ کی سی پختگی ملتی ہے۔ ان کی غزل کے جو نمونے موجود ہیں، وہ ان کی فکر کے ابتدائی نمونے ہیں، اس کے باوجود، ان میں ایک گہرائی اور اسلوب میں ایک قدرت ہے۔ ایک غزل کے چند شعر ہیں:۔

کبھی چھپ کے دیکھ آئے ترے حسن کی تجلی
کبھی تیری انجمن میں گئے مل کے پاسباں سے

مجھے درد دل مٹا دے کہ فنا ہے رازِ ہستی
تو حیاتِ جاوداں ہو مجھے مرگِ ناگہاں سے

یہ تکلفات پیہم ، رہی حسرتِ تکلّم
کہ بصد نیاز مندی، ہیں خموش بے زباں سے

مرے دامن و گریباں کے کئے جنوں نے پُرزے
یہی حال ہے تو فاضلؔ میں سیوں کہاں کہاں سے

روایتی موضوعات ہیں، ان کی انفرادی فکر اور اسلوب کی قدرت کی چند مثالیں ہیں :

حقیقت میں خود حُسن ہی ہے عشق کا باعث
نمائش حُسن کی ہوتی ہے، جب پروانہ آتا ہے

ظُلم پرور تیری عادت، ناشکیبا میرا غم
رحم تیرے دِل میں کم ہے، صبر میرے دِل میں کم

خون بُلبل کو بنا کر غازہ روئے بہار
پتی پتی میں چمن کی، حُسن پیدا کر دیا

تھی مرے دِل کی اُمنگوں ہی سے دنیا کی بہار
دِل پریشان کیا ہوا، ظالم پریشاں ہو گیا

میرے دِل میں پڑ رہی ہے چھوٹ تیرے حُسن کی
یا اس آئینہ میں ہے خود صورتِ آئینہ ساز

غالبؔ کی زمینوں میں بہت سے شعراء نے غزلیں کہی ہیں۔ فاضلؔ نے ان زمینوں میں طبع آزمائی کی ہے۔ ایک غزل بڑی خوب ہوئی ہے۔ اس کے چند شعر ہیں :

اے دل، ٹھہر کہ لکھتا ہوں پھر آج خطِ شوق
خونِ وفا کو زینتِ عنوان کئے ہوئے
پھر لے چلا ہے عشق اسی بزمِ ناز میں
تیرِ نظر سے درد کا ساماں کئے ہوئے
پھر جی میں ہے کہ باغِ تمنا ہرا کروں
مدت ہوئی ہے سیرِ گلستاں کئے ہوئے

ان کی نظموں میں چند اچھی نعتیہ نظموں کے علاوہ ایک دو مناظر پر ہیں، ایک میں اقبال کی فکر و فن کو خراج تحسین ادا کیا ہے اور ایک "جنازہ اقبال" کے عنوان سے ان کے انتقال کے بعد لکھی گئی ہے۔ پہلی نظم جو "خامۂ اقبال" کے عنوان سے لکھی گئی ہے۔ اس کے چند شعر ہیں:

ہے صریرِ نو میں ترے وہ سرورِ دلنواز
محو ہو جاتے ہیں جس کو سنتے ہی نغمہ طراز
ہے ثریا سے بھی بالا تیرا رہوارِ خیال
کہکشاں چھو لے اسے، کیا تاب! اسکی کیا مجال
تو نے وابستہ کیا انجام سے آغاز کو
کر دیا افشاء طلسمِ کُن فکاں کے راز کو
تو جہانِ رنگ و بو کا ہے حقیقت آشنا
فیض سے تیرے یہ فاضل شاہدِ قدرت بنا

"صبحِ تاباں" اور "جہلم" پر لکھی ہوئی نظمیں بھی اچھی نظمیں ہیں۔ ترقی پسند تحریک کے اثر کے تحت انہوں نے "جہلم" کے عنوان سے ایک اچھی نظم لکھی ہے جس میں سرمایہ دار اور مزدور کی کشمکش کی طرف اشارے کئے ہیں۔ اس نظم کا آغاز ہوتا ہے:

گھاٹیوں میں تری ہستی کی صدا آوارہ ہے

دامنِ کوہ ہمالہ میں ترا گہوارہ ہے

آگے جو دور اس کے وجود پر گذرے ہیں۔ اُن پر نظر ڈالتے ہوئے کہتے ہیں:

تونے دیکھی ہے غلط تقسیم زر کی مال کی

اہلِ زر کی خواجگی، مزدور کی بے چارگی

فاضل اچھے خوشنویس بھی ہیں، چنانچہ اپنی تصانیف کی کتابت خود انہوں نے کی ہے۔ مصوری، موسیقی، آئینہ سازی اور گتے اور لکڑی کے کام میں بھی انہیں مہارت ہے۔

طالب امین آبادی، چندن پرکاش نندہ، گوجراں والا کے قصبہ امین آباد میں ۱۹۲۲ء میں پیدا ہوئے۔ ان کے باپ دادا کی وہاں زمینداری تھی۔ طالب کو شعر و سخن سے لگاؤ بچپن سے تھا۔ اور زمانہ طالب علمی سے شعر کہنے لگے تھے۔ جموں سے ان کا تعلق شادی کی بدولت پیدا ہوا، اور جموں کے ادبی حلقوں سے ان کے بہت مراسم قائم ہو گئے۔ ۱۹۴۷ء کے بعد، وہ علاقہ کانگڑہ کے قصبہ دھرم سالہ میں آکر رہ گئے۔ لیکن جموں کے ادیبوں اور ادبی تحریکوں سے یہ برابر مربوط ہیں۔ غزل کہتے ہیں، لیکن بہت کم، نظمیں بھی کہیں ہیں۔ غزل پر گیت کا انداز مسلّط ہے۔

ان کی ایک غزل کے شعر ہیں:

اہلِ گلستاں کے دل دھڑکے — یوں آئے جھونکے پت جھڑ کے

سازش تھی یا بھول کسی کی — ہم جھومے یوں نور کے تڑکے

ہائے وہ کیسے لوگ تھے طالب — چین نہ پایا جن سے بچھڑ کے

ایک اور غزل کے دو شعر ہیں:

پھر پہلو میں درد اُٹھا ہے — ایک یاد کے لاکھ بہانے

کچا دھاگا پیار کسی کا — دل بُنتا ہے، تانے بانے

یہ اندازِ غزل خوانی طالب کا مخصوص انداز بن گیا ہے۔ چنانچہ ایک اور غزل چند شعر بھی پڑھئے

کے لایق ہیں :

اس محفل میں کون ہے ایسا جس کا حال تباہ نہیں
کس کو سُکھ کا سانس میسّر کس کے لب پر آہ نہیں
اے طالب سے کھینچ کر رہنے والو، ذرا خدارا غور کرو
تُم تو پھر اپنے ٹھہرے، وہ دُشمن کا بد خواہ نہیں

طالب، جیسا کہ اوپر کے انتخاب سے ظاہر ہے، روایت کے پابند نہیں ہیں۔ اکثر غزلوں میں ان کے ملایم جذبات اور شریفانہ احساسات مُستحسن انداز میں ظاہر ہوتے ہیں۔ انسان سے ان کو محبت ہے۔ کہتے ہیں :

کتنی دلکش ہے یہ انسانوں کی بستی طالب
ناسمجھ اُلجھیں تو ویرانہ بنا دیتے ہیں

عبدالحق برق، پہلی جنگِ عظیم کے دوران سری نگر کے ایک علمی گھرانے میں پیدا ہوئے۔ نگر میں فارسی اور اُردو کا چرچا تھا۔ گھر ہی پر ابتدائی تعلیم پائی۔ اس کے بعد ڈرائینگ اور مُصوّری سے دلچسپی پیدا ہوگئی اور وہ بریلی گئے، جہاں ان فنون کی تربیت حاصل کی۔ اس کے بعد محکمہ تعلیم میں اُستاد کی حیثیت سے ملازم ہوگئے۔ ان کی تعیناتی کشمیر کے مختلف مقامات پر رہی۔ شعر و سخن سے ابتدا ہی سے لگاؤ پیدا ہوگیا تھا۔ سکول میں کام کرتے ہوئے اپنے ذوق کو ترقی دینے کے انہیں مواقع مل گئے۔ ریڈیو کشمیر سے اسی ذوق کے باعث وہ منسلک ہوگئے۔ اسی دوران منشی فاضل کا امتحان بھی کامیاب کیا۔ ریڈیو کی ملازمت میں وہ ترقی کرتے کرتے پروگرام ایگزیکیٹو کے عہدہ تک پہنچ گئے۔ کشمیر سے باہر جالندھر اور چند اور مقامات میں بھی انہیں کام کرنے کا موقع ملا۔ اس وقت سرینگر ہی میں مقیم ہیں۔

غزل اور نظم دونوں اصناف میں وہ لکھتے ہیں۔ اقبال پر ان کی ایک اچھی نظم "حضرتِ اقبالؒ" کے عنوان سے "گلریز" سری نگر (شمارہ اپریل ۱۹۵۳ء) میں شایع ہوئی تھی۔

اس نظم کا اقتباس ذیل میں درج کیا جاتا ہے:

خود فراموشی کے عالم کو دیا درسِ خودی

سُست گامی کو سُنا دی تیز گامی کی حُدی

سینۂ افلاک کو چیرا نگاہِ تیز سے

صورِ اسرافیل پھونکا بانگ محشر خیز سے

مردِ حق کے نعرہ ہو حق سے تھرّایا جہاں

ششدر و حیراں ہوئے یک لخت سب کون و مکاں

دیدۂ انکار کو بخشا فروغِ مہر و ماہ

نفی بے اثبات پر ڈالی نگاہِ انتباہ

ظُلمتِ شب میں یدِ بیضا بکف خنجر بدست

نعرۂ ہو بر زباں اور دِل سوائے اللہ مست

برق کی ایک اور غزل کے چند شعر ہیں:

عشق بیداری کا حل ہے کوئی خواب نہیں

نشتر و خار ہے یہ بستر سنجاب نہیں

اک ذرا اور ہٹا دے رُخِ روشن سے نقاب

چشمِ مشتاق ابھی دید سے سیراب نہیں

خمِ ابروئے بُتاں، خنجرِ جاناں کی قسم

جس پہ سجدہ نہ کیا وہ کوئی محراب نہیں

العطش، العطش، اے رحمتِ باری مدد دے

برق کو کون کہے ماہی بے آب نہیں

سید اکبر ہاشمی، جو اکبر تخلص کرتے ہیں، کشمیر کے ہاشمی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ خاندان سری نگر میں عربی اور فارسی کے علاوہ طِب میں مہارت کی وجہ سے شہرت رکھتا ہے۔ والد حکیم سید رسول، طبیب تھے۔ اور چچا حکیم سید محمد عرب، طِب کے علاوہ فارسی اور عربی میں بھی دستگاہ رکھتے تھے۔ کشمیری میں وہ شعر بھی کہتے تھے۔ ان کے مرثیے "گل" "خار" "سم" اور "بندوبست" مقبول ہیں۔ اکبر کو بھی عربی اور فارسی کا ذوق خاندان سے ورثے میں ملا ہے۔ ان کی ولادت ۱۹۲۲ء میں سری نگر میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم مکتب میں پائی، پھر سکول میں شریک ہوئے۔ اور میٹرک کا امتحان کامیاب کر کے محکمۂ تعلیم میں مُدرس ہو گئے۔ درس و تدریس میں مشغول رہتے ہوئے ادیب فاضل، منشی فاضل اور پھر ایم اے کے امتحانات کی تکمیل کی اور بی۔ ایڈ کا امتحان بھی کامیاب کیا۔ اس وقت ایک سکول میں ہیڈ ماسٹر کی خدمت انجام دے رہے ہیں۔

شعر و سخن سے دلچسپی زمانہ طالب علمی ہی سے رہی۔ ابتدا میں کشمیری میں کئی مرثیے اور نوحے، سلام اور غزلیں لکھیں۔ اس کے ساتھ ہی اُردو میں بھی کہتے رہے۔ چنانچہ اس وقت ان دونوں زبانوں میں ان کے کلام کے مجموعے شایع ہو چکے ہیں۔ اکبر کو مذہبی اور اخلاقی شاعری سے زیادہ لگاؤ ہے۔ ان کی ایک نعت کے کچھ شعر ہیں۔

اگر پیدا نہ ذاتِ رحمۃ للعالمین ہوتی
نہ پیدا آسمان ہوتے نہ پیدا یہ زمیں ہوتی
تمیزِ بندہ و آقا مٹاتا کون دُنیا سے
غلاموں کی جگہ کب اپنے آقا کے قریں ہوتی

اکبر کے ایک نوحے کے شعر ہیں:

نینوا میں تین دن تشنہ رہے آلِ نبیؐ — یہ ستم، اے چرخِ نا انصاف دیکھا ہے کبھی؟
بہہ رہے تھے روبرو ان کے فرات و علقمہ — پھر بھی باقی رہ گئی اصغر کی وہ تشنہ لبی
دیکھ لاشے کو علی اصغر کے بانو نے کہا — کیا کسی ماں نے بھی دیکھا ہے ستم ایسا کبھی

اکبر کی قومی نظموں میں ایک مُسدّس جو" ابھی دور منزل سے یہ کارواں ہے" کے عنوان سے لکھا ہے۔ وہ مسلمانوں میں بعض اخلاقی عیوب کا تذکرہ کرتے ہوئے، انہیں اپنی اصلاح کی طرف متوجہ کرتے ہیں۔ یہ مُسدّس کی شکل میں لکھی گئی ہے۔ اور اس پر حالی کا اثر ہے۔ اس نظم کا آخری بند ہے:

رہا ہے نمایاں ہماری ادا سے — نمائش ٹپکتی ہے شاہ و گدا سے
ہمیں واسطہ کیا ہے، رسول و خُدا سے — کہ عاشق ہیں ہم ذاتِ پری سدا سے

مقدر کا شکوہ ہی وِردِ زباں ہے
ابھی دور منزل سے یہ کارواں ہے

ایک نظم اکبر نے "فیشن" کے عنوان سے بھی لکھی ہے، جس میں قوم کے نوجوانوں کے مذموم اطوار اور اوضاع پر تنقید کی ہے۔ کہتے ہیں:

ہم اپنے فسانے کو جب بھول گئے دِل سے
تب سے ہی زبانوں پر غیروں کا فسانہ ہے
ہم فلم کے رسیا ہیں، مسجد کو کہاں جائیں
سورۃ کی جگہ لب پر ایکٹر کا ترانہ ہے

سیف الدین سیفی، جو سیفی سوپوری کے نام سے لکھتے ہیں، کہنہ مشق شاعر ہیں۔ ان کا تعلق سوپور کے ایک مشہور مسعودی خاندان ارشاد و ہدایت سے ہے۔ مولانا محمد انور شاہ جن کا حال لکھا جا چکا ہے، اسی خاندان سے تھے۔ سیفی کی ولادت سوپور ہی میں سنہ ۱۹۲۲ء میں ہوئی۔ ان کے والد مولوی غلام رسول، عربی اور فارسی کے اچھے عالم ہیں اور ارشاد و ہدایت ان کا مشغلہ ہے۔ سیفی کی ابتدائی تعلیم گھر ہی پر ہوئی۔ اس کے بعد سوپور کے ہائی سکول میں داخل ہوئے اور میٹرک کا امتحان کامیاب کیا۔ پھر فارسی عربی کی تعلیم کیلئے امرتسر گئے جہاں سے انہوں نے منشی فاضل کا امتحان کامیاب کیا اور بی اے کی تکمیل کی۔

محکمۂ تعلیم میں مُدرّس کی حیثیت سے ملازم ہوئے اور بی ٹی کی تربیت حاصل کرکے ڈگری پائی۔ محکمہ میں ترقی کرتے کرتے تحصیل ایجوکیشن آفیسر ہوگئے۔ اس وقت ضلع کے سکولوں کے انسپکٹر ہیں۔

سیفی کا شمار اس وقت وادی کے صاحبِ فن شعراء میں ہوتا ہے، روایات کے مطابق، ان کی شاعری کا آغاز بھی غزل سے ہوا۔ جب وہ دسویں جماعت میں پڑھتے تھے، شعر کہنے لگے تھے۔ لیکن عہد کے تقاضے نے ان سے اچھی اچھی نظمیں بھی کہلوائی ہیں غزل میں ان کا انداز اساتذہ کی طرح پختہ ہے اور وہ غزل کے موضوعات کامیابی کے ساتھ برتنے پر پوری قدرت رکھتے ہیں۔ مثلاً ان کی ایک غزل کے چند شعر ہیں:

خاموشی میری بہ اندازِ فغاں ہے کہ نہیں
دِل کی ہر بات نگاہوں سے عیاں ہے کہ نہیں
ترے ہونٹوں پہ تبسم کی دمکتی تحریر
ایک منہ بولتا منشورِ اماں ہے کہ نہیں
پھونک ڈالا تھا کبھی جس نے مرے دِل کا سکون
اب وہ آتش بہ جگر، شعلہ بجاں ہے کہ نہیں
شمعِ اُمید سے تھوڑی سی ضیاء قائم ہے
ورنہ تاریک مرے دِل کا جہاں ہے، کہ نہیں
کوئی منزل کا طلبگار نہ آیا، سیفی
آج بھی راہ طلب نوحہ کناں ہے کہ نہیں

چھوٹی چھوٹی بحروں میں، سیفی نے بڑے رواں شعر کہے ہیں۔ کچھ مثالیں ذیل میں درج ہیں،

فدا جن پہ ہوں آسماں کے ستارے
نظر میں کچھ ایسے بھی ہیں ماہ پارے
ہے سرمایہ زندگی، یادِ اُن کی
جو لمحے ترے ساتھ ہم نے گزارے

بساطِ محبت پہ ہُشیار سیفی — جو اک بار جیتے، تو سو بار ہارے

ایک اور غزل کے دو شعر ہیں، جن میں آخری شعر کے اخلاقی تیور قابلِ اعتناء ہیں:

پھر آنکھوں سے آنسو ڈھلکے — کتنی بار، یہ ساغر چھلکے

اوروں پر کیا پتھر پھینکیں — رہنے والے شیش محل کے

سیفی کی ایک نظم "مسافر" کا اقتباس درج ذیل ہے:

وہ دیکھیئے، شام ہو چکی ہے

غروب کے بعد سحر کی وادی میں چپکے چپکے سیاہی شب اُتر رہی ہے

جو لغمے تھے، خاموش ہو گئے ہیں۔

ہوا بھی ساکت ہے، جیسے تھک کر ٹھہر گئی ہو۔

سائف کھوردی نئے عہد کے اچھے شعراء میں سے ہیں سنجیدہ اور مزاحیہ دونوں انداز میں کہتے ہیں۔ ان کی ایک مزاحیہ انداز کی نظم جو انشاء کی مشہور اور مقبول زمین میں لکھی گئی ہے۔ اس کے چند شعر ذیل میں درج ہیں۔ اس نظم کا "عنوان" "اسمبلی" ہے اور یہ جون ۱۹۵۳ء کے شمارہ "گلریز" (سرینگر) میں چھپی تھی۔

کہاں جوشِ الیکشن اور کہاں سودائے رُکنیت

میاں! رد پیٹ کر ان سب کو ہم یکبار بیٹھے ہیں

کیا مجبور اک آوٹ کرنے پر پیہم شکستوں نے

بہت آگے گئے، باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں

نہ ہے سائف سے شکوہ اور نہ انشاء سے شکایت ہے

غرض کچھ اور دُھن میں اس گھڑی میخوار بیٹھے ہیں

محمد امین کامل، جو ادبی حلقوں میں امین کامل کے نام سے مشہور ہیں، کشمیری کے ممتاز شاعروں میں شمار ہوتے ہیں لیکن ان کے اور بہت سے معاصرین کی طرح ان کی ادبی زندگی کا آغاز بھی اُردو سے ہوا۔ کامل ۱۹۲۴ء میں پیدا ہوئے۔ کشمیر میں جنوبی ضلع کا ایک گاؤں کاپرن ان کی جائے پیدائش ہے۔ بی۔ اے تک تعلیم کشمیر ہی میں پائی۔ بی۔ اے کامیاب کرنے کے بعد علی گڑھ گئے اور مسلم یونیورسٹی سے ایل۔ ایل۔ بی کا امتحان کامیاب کیا۔ وطن لوٹنے کے بعد کچھ عرصہ وکالت کی، دو سال اُردو لیکچرار کی حیثیت سے بھی کام کیا۔ اب کلچرل اکادمی میں برسرِ خدمت ہیں۔[۱]

کامل نے جب اُردو میں شعر کہنا شروع کیا تو پروفیسر نندلال طالب سے رجوع کیا، سری پرتاپ کالج میں بی۔ اے کی تعلیم کے زمانے میں ان کے اُستاد تھے۔ پہلے غریق تخلص کرتے تھے لیکن بعد میں کامل تخلص اختیار کیا۔ ابتداء میں غزل ان کے لئے مشقِ سخن کا ذریعہ بنی اور جلد ہی غزل میں اتنی مہارت پیدا کرلی کہ کشمیر میں اور باہر، اخبار اور رسالے، ان کا کلام بڑے چاؤ سے حاصل اور شایع کرتے تھے۔ ۱۹۴۰ء سے لے کر ۱۹۴۶ء تک اتنا کلام اکٹھا ہو گیا تھا کہ ایک مجموعہ تیار ہو گیا۔ یہ مجموعہ غلام الدین وانی کے پاس تھا، جو مسلم کانفرنس آزاد کشمیر کے جنرل سکریٹری تھے۔ یہ مجموعہ اُن ہی کے پاس رہ گیا۔ ۱۹۴۷ء کے بعد جو کلام سرانجام پایا، وہ رسالوں میں بکھرا پڑا ہے۔

کامل کی ابتدائی دور کی غزل، روایت کی پابند تھی، لیکن ریاست میں ترقی پسند ادب کی تحریک شروع ہونے کے بعد، اپنے کئی معاصر سخن سنجوں کے ساتھ، کامل بھی اس سے وابستہ ہو گئے اور نئے انداز میں شعر کہنے لگے اور کئی اچھی فکر انگیز نظمیں لکھیں۔ اس تحریک نے اور شعراء کی طرح کامل کو بھی ایک نیا آدرش دیا، جس کا محور انسان تھا اور جس میں تخیل کی کارفرمائی کے مقابلے میں حقایق زندگی سے وابستگی نمایاں تھی۔ لیکن نئی روش کو اختیار کرنے سے پہلے، وہ ایک تذبذب کے دور سے بھی گزرے جس کا پرتو ان کی نظم

---

[۱] : کامل صاحب اب ملازمت کی بندشوں سے نکل چکے ہیں۔

"خلش" میں ملتا ہے، کہتے ہیں:

اک کٹھن منزل سی ہے پیشِ نظر
اور بلا کی کش مکش ہے، کیا کروں
ایک جانب ہے نئی طرزِ روش
اک طرف کہنہ روش ہے، کیا کروں

یہ صحیح ہے کہ نئی روش کا کوئی شاندار پس منظر، فی الحال نئے لکھنے والوں کے لئے موجود نہیں تھا، تاہم، نئی روش اب ایک تحریک بن گئی تھی اور زندگی کے مسائل کے ساتھ ساتھ، فکرِ شعر کے لئے بھی ایک مستحسن محرک ثابت ہونے لگی تھی۔ اس لئے کاملؔ اپنے دوسرے ساتھیوں کی طرح بالآخر نئے انداز پر لکھنے لگے، تاہم غزل سے بھی اپنا ناطہ نہیں توڑا، لیکن غزل میں بھی نئے اثرات سرایت کرنے لگے تھے۔ چنانچہ بعض وقت ان کی غزل اور ان کی نظم میں بہت سا تفاوت باقی رہ جاتا تھا۔ ان کا ایک اسلوب بھی نشو و نما پا رہا تھا، جس میں فکر کی تندی کے ساتھ ترنم بھی موجود تھا، مثلاً ان کی ایک نظم کے کچھ شعر ہیں:

جو آگ لگائیں کھیتوں میں	مُنہ بند کریں برساتوں کا
اُس امن کی پیاسی دھرتی پر	کیا کام ہے ان بدذاتوں کا
کیا ان کو سُہانی صبحوں کے	نورانی نظارے ڈستے ہیں
سناٹا انہیں کیا بھاتا ہے	سنسان اندھیری راتوں کا
کیا مائیں پنگوڑے جُھل نہ سکیں	کیا ہنستی یہ کلیاں کھُل نہ سکیں
ہر نگری میں، ہر گاؤں میں	کیا شور مچے ہیہاتوں کا
اب کیا یہ امن کی باتیں سُنیں	یہ لوگ تو جنگ پر تُل ہی گئے
وہ بھوت نہ مانے باتوں سے	جو بھوت ہو قابل لاتوں کا

"میں کھڑکی میں کھڑا ہوں" کاملؔ کی ایک اور اچھی نظم ہے۔ جس میں اپنے عہد کے تضادات

پر وہ زہر خند کرتے ہیں۔ نظم میں 'شاعر' کچھ ایسی حقیقتوں سے نبرد آزما نظر آتا ہے، جن کو بدلنا، تنہا اس کے بس کی بات نہیں، پھر بھی وہ سعی سے ہاتھ اُٹھانا نہیں چاہتا اور شاعر کا یہ عزم قاری کے دل میں شاعر کے لئے بے پناہ ہمدردی کے جذبات کو اُبھارتا ہے۔

"مسجد داراشکوہ" فکر اور فن دونوں لحاظ سے کامل کی اچھی نظموں میں سے ہے، جو ۱۹۴۸ء میں لکھی گئی تھی۔ یہ مسجد داراشکوہ نے ہاری پربت پر اپنے پیر مُلّا محمد شاہ بدخشی خراسانی کے لئے بنوائی تھی۔ لیکن اب یہ ویران ہے۔ اس نظم کا پس منظر ماضی کی شاندار یادیں ہیں۔ مسجد کی موجودہ خستہ حالی پر شاعر کا دل مسوستا ہے اور اُس کی تباہی میں اُس کو ایک عہد کی تاراجی نظر آتی ہے، اس کے ذہن پر یہ اٹل حقیقت ہوا ہو جاتی ہے کہ

مرگ و ہستی کے تسلسل کا تغیّر نام ہے

اس تغیّر سے نہیں بچنے کی ہے کوئی بھی شئے

نظم میں اقبال کی مسجد قرطبہ والی نظم کا سا آہنگ پیدا ہو جاتا ہے۔ عالمگیر کے خوف سے مُلّا شاہ کے وادی سے رختِ سفر باندھنے پر مجبور ہونے کے واقعے تک پہنچ کر کامل کے جذبات مخدوم محی الدین کی طرح اُبل پڑتے ہیں۔ جس نے کہا تھا!

آندھیو آؤ اُبلتے ہوئے لاوؤ آؤ

کامل حادثوں کو اور آندھیوں کو بُلاتے ہیں!

کروٹیں لو حادثو، اے آندھیو پیہم چلو

بجلیو برساؤ آتش، پھٹ پڑو لے زلزلو

ایسی دنیا جس میں" دانائے راز" موردِ قہر و غضب ہوں،

اس زمین پر سانپ اور اژدر برسنے چاہئیں

برق گرنی چاہیئے پتھر برسنے چاہئیں

ایسی ذہنی تناد اور کھنچاؤ کے بیچ بیچ میں رومانی لمحات بھی آجاتے ہیں جب کامل

"وہ" "وہ لمحہ" جیسی نظموں میں پناہ لیتے ہیں۔ یہ فضا وہ ہے جہاں :

مہکتی زلفیں ہیں اس کی مہکتا ماتھا ہے

کہ روح صبح چمن ہے رواں شام ہے وہ

اور

تری نظر کا تبسّم تری جبیں کی جھلک — اُمید بن کے نکھرتی ہے میری آہوں میں

کامل کی فکر وفن کے موجودہ مراحل انکی کشمیری شاعری میں صرف ہو رہے ہیں، اور وہ اس دور میں کشمیری کے سربرآوردہ شعرا میں شمار ہونے لگے ہیں۔ ان کے کلام کے مجموعے "یُو تہٕ پٔرۄ" پر ۱۹۶۸ء کا ساہتیہ اکادمی کا انعام بھی عطا ہوا ہے۔

کامل اچھے نقاد ہیں اور ذوقِ تحقیق بھی رکھتے ہیں۔ ان کا ایک اہم کارنامہ حضرت نورالدین ریشی کے کشمیری کلام" نورنامہ" کی ترتیب ہے جس کے لئے ۴۸ صفحات کا مقدمہ ہے۔ اُردو میں بھی ان کے کئی تنقیدی اور تحقیقی مضامین شایع ہوتے رہتے ہیں۔ ان کا ایک اچھا مضمون" پنچ تنتر اور ہر مہت کنھا" کے بارے میں" شیرازہ" (مارچ ۱۹۶۴ء) میں شایع ہوا تھا۔ اس مضمون کا محرک، جیسا کہ انہوں نے بتایا ہے، ڈاکٹر ذاکر حسین کے بارے میں عثمانیہ یونیورسٹی، حیدرآباد کی ایک اُستاد اُردو، ڈاکٹر ثمینہ شوکت کا ایک مضمون تھا جو" ذاکر صاحب — تخلیق یا تکمیل" کے عنوان سے" شیرازہ" میں شایع ہوا تھا۔ مضمون ان کارناموں کا ذکر تھا۔ کامل" پنچ تنتر" کے مصنف کے بارے میں لکھتے ہیں :

"اس کا مصنف گناڈھیہ نام کا ایک کشمیری تھا، جس نے اُسے کشمیری (پشاچی) میں لکھا تھا جسے برہمنوں نے بھوتوں کی بولی کا نام دیا ہے اس کتاب کے سات حصے تھے، جن میں ایک باقی رہ گیا ہے اور باقی ضایع ہو گئے ہیں۔"

امین کامل نے کچھ کشمیری افسانوں کے ترجمے بھی اُردو میں کئے ہیں اور خود انہوں نے کئی کشمیری

افسانے بھی لکھے ہیں :

حبیب کامران بھی اس عہد کے اچھے شعراء میں سے ہیں۔ جن کی زیادہ غزلیں رسالوں میں شائع ہوتی رہی ہیں۔ غزل روایتی انداز کی کہتے ہیں۔ گو اس کے آداب و لوازم پر ان کی نظر ہے۔ ایک غزل کے کچھ شعر ہیں،

گلہ تو میں نہیں کرتا، مگر تجھ کو خبر بھی ہے
جہاں ناوک فگن تو ہے وہیں میرا جگر بھی ہے
ترا لطف و کرم ساقی بہت ہی عام ہے، لیکن
نگہ اک اس طرف کو بھی کہ اک پیاسا ادھر بھی ہے
چلو، مانا کہ بربادی لکھی تھی میری قسمت میں
مگر الزام تو تیری نگاہِ ناز پر بھی ہے

ذیل کے شعر میں نئے خیال کی کرن پھوٹتی دکھائی دیتی ہے :

رہیں سرخوش ابھی ظلمت کے متوالے مگر سن لیں
کہ تاریکی کے بعد آتی تو اک رنگیں سحر بھی ہے

اندرجیت لطف گوندلاں والا میں پیدا ہوئے۔ ولادت کا سنہ ۱۹۲۴ء ہے۔ کالج کی تعلیم امرتسر کے ہندو سبھا کالج میں پائی اور اسی زمانے میں ادبی ذوق نمایاں ہونے لگا تھا۔ چنانچہ کالج کے رسالے کے حصہ اردو کے وہ ایڈیٹر بھی رہے۔ کالج چھوڑنے کے بعد فلم کے لئے لکھنے کی کوشش کرتے رہے، لیکن اس میں انہیں نمایاں کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔ وہ لاہور میں بھی رہے اور مجاز اور ساحر لدھیانوی کے ساتھ صحبتیں رہیں۔ ۱۹۴۷ء میں وہ جموں آ گئے اور فوج میں ٹھیکے کا کام کرتے ہیں۔

لطف، غزل گو شاعر ہیں، بلکہ اس عہد کے خصوصی غزل گو شعراء میں انہیں شمار کرنا چاہیئے۔ نظم اور نئی شاعری کے انداز کی دعوت مبارزت نے بھی، غزل کے بارے میں

ان کے عقیدوں کو متزلزل نہیں کیا۔ اب ان کی غزل بڑی پختہ اور اُستادانہ ہو گئی ہے۔
اس کا ایک اہم سبب یہ بھی ہے کہ ان کے گھرانے میں شعر و سخن کا چرچا رہا۔ چنانچہ ان کے چچا
دلیس راج یکتاؔ، مشہور شاعر ہیں۔

لطفؔ کی غزلوں کا ایک مجموعہ " بربطِ دل " شائع ہو چکا ہے۔ کچھ انتخاب ذیل میں
درج کیا جاتا ہے:

بخشش کے تمنائی نہ رحمت کے طلبگار — کس شان سے بیٹھے ہیں سرِ حشر گنہگار

دیکھیے تو کوئی شوقِ شہادت کا یہ عالم — ہنستے ہیں سرِ دار محبت کے گنہگار
کہنے کو غزل کہتا ہوں اب بھی مگر اے لطفؔ — پہلی سی کہاں شوخی و رنگینیٔ گفتار

چھوٹی بحروں میں بڑے رواں شعر نکلتے ہیں۔ مثلاً:

دوستوں کی نوازشیں ہیں کہ اب — دردِ دل اپنا کم نہیں ہوتا
کس قدر بد نصیب ہوتے ہیں — جن پہ تیرا ستم نہیں ہوتا

ایک مقبول زمین میں ان کے دو شعر ہیں:

دل کی حالت عجیب ہے پیارے — تو جو میرے قریب ہے پیارے
تو نگاہوں سے دور ہے بے شک — دل سے لیکن قریب ہے پیارے

بے وفائی، فریب، مکاری — لوگ دنیا میں کیا نہیں کرتے

کبھی پرواز کرتا ہے فلک پر — کبھی سائے سے ڈر جاتا ہے انساں

اظہار کے کچھ اچھے تیور بھی ان کی غزل میں ملتے ہیں۔ مثلاً:

خدا کے [illegible] اس انداز سے کہئیے — تمہاری شکل کچھ بگڑی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔

رنج و الم کو جان رکھوں کیوں نہ میں عزیز
بخشی ہوئی حضور کی یہ کائنات ہے
تجھ سے شرابِ ناب کی لذت میں کیا کہوں
پی کر تو دیکھ، شیخ، یہ آبِ حیات ہے

کروں تعریف کیا اس مہ جبیں کی — مرے شعروں سے بھی بڑھ کر حسیں ہے

عقل و دانائی کی باتوں کو وہ بڑی گھلاوٹ کے انداز میں کہہ جاتے ہیں۔ چند شعر ہیں:

فکرِ فردا، ذکرِ ماضی ہے فضول — حال کے غم کا مداوا کیجیے
بارِ غم ہی جب اٹھانا ہے ضرور — بارِ غم، ہنس کر اٹھایا کیجیے

لطفؔ ماضی کی تلخ یادوں کو — دل میں رکھا، برا کیا تم نے

اے رہ نوردِ آبلہ پائی کا ذکر چھوڑ — راہِ طلب میں ہمتِ مرداں کی بات کر
تنگ آ گیا ہوں حسن و جوانی کے ذکر سے — للہ اب نہ خوابِ پریشاں کی بات کر

اس رومان نگار شاعر کے لئے جشنِ آزادی جو مفہوم رکھتا ہے۔ وہ اپنے مطلب کی بات کہتا ہے۔ کشمیر کے بارے میں ان کے تاثرات کا پرتو ایک نظم میں ملتا ہے، جس کا ایک شعر ہے:

اگلتی ہے جہاں مٹی بھی سونا
مرے کشمیر کی وہ سر زمیں ہے

لطفؔ کی ذیل کی غزل غالباً ان کے لئے اردو کے نغز گو شعرا میں مقام پیدا کر دے گی:

بہ فیضِ جذبۂ کامل یہاں تک بات آ پہنچی
کہ ان کے دل کی اب ان کی زباں تک بات آ پہنچی
گریباں سی کے میں نے پھر گریباں چاک کر ڈالا

مری دیوانگی کی اب یہاں تک بات آپہنچی

ذرا سی برق چمکی اور پھر اے لطف گلشن میں

یکایک میری شاخِ آشیاں تک بات آپہنچی

۱۹۲۴ء کا سنہ کشمیر کے ایک اور شاعر کی پیدائش کا بھی سنہ ہے۔ یہ غلام محمد ملک شوریدہ کاشمیری ہیں۔ ان کی ولادت شوپیان کے قریب ایک موضع ہیجورہ میں ہوئی۔ ان کا خاندان زراعت پیشہ ہے۔ شوریدہ نے اپنے شوق اور ذوق سے تعلیم حاصل کی۔ پنجاب یونیورسٹی سے فارسی میں اور علی گڈھ سے اُردو میں ایم۔ اے کیا۔ ان کی ملازمت کی ابتداء سکول کی مُعلمی سے ہوئی تھی لیکن اب اُردو کے لیکچرار کی خدمت انجام دے رہے ہیں اور ریاست کے کئی کالجوں میں متعین رہ چکے ہیں۔ حال میں انہیں تحقیقی کام کا خیال ہوا اور علی گڈھ میں پی ایچ ڈی کے لئے داخلہ حاصل کیا اور مقالہ لکھ رہے ہیں۔

شوریدہ شعر میں بڑا انہماک رکھتے ہیں اور کافی کلام اس وقت تک سرانجام کر چکے ہیں۔ انہیں سنجیدہ اور مزاحیہ دونوں انداز پر دسترس حاصل ہے۔ وہ عرصہ تک اثر صہبائی سے مشورہ سخن کرتے رہے اور اب وادی کے اچھے صاحب فکر شعراء میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ کئی اصناف میں ان کا کلام موجود ہے۔ غزل سے انہیں زیادہ لگاؤ رہا ہے۔ ایک شعر کے کچھ شعر ہیں:

حجاباتِ تعصب کاش ہٹ جائیں نگاہوں سے

ہُنر میں عیب ظاہر، عیب میں ہوگا ہُنر پیدا

تگ و تازِ جنوں اے دل، نہیں محدود صحرا تک

مکان و لامکاں میں بھی کر اپنی رہ گذر پیدا

شہودِ غیب کے جلوے نظر آئیں گے شوریدہ

جو ہو داغِ جگر، سودائے سر، ذوقِ نظر پیدا

شوریدہ کی فکر سنجیدہ سے مزاحیہ اور مزاحیہ سے سنجیدہ نگاری میں تبدیلی ہوتی رہتی ہے

اور جہاں وہ شعوری طور پر مزاحیہ نہیں لکھتے، کوئی پہلو، کوئی اندازِ شوخی کا اُبھر آتا ہے۔ ان کی ایک غزل کے تین شعر ہیں:

سوزِ پنہاں سے دل کباب ہوا — آشیانہ ترا خراب ہوا

حسن نظارہ سوز نے مارا — بے حجابی میں بھی حجاب ہوا

ملتے وہ اولیں نگاہ کہ جب — دل میں برپا اک انقلاب ہوا

میکش کاشمیری جن کا پورا نام کیلاش ناتھ کول ہے، کلاسیکی انداز پر غزل کہتے ہیں اور اس کے سارے لوازم پر نظر رکھ کر کہتے ہیں کہ چنانچہ جب وہ مشاعرے میں غزل سُناتے ہیں تو ان کے اندازِ غزل خوانی اور خود غزل میں اساتذہ کا سا رکھ رکھاؤ، ایک سماں پیدا کر دیتا ہے۔

میکش کا وطن کشمیر ہے۔ ان کی ولادت سری نگر میں ہوئی اور تعلیم بھی یہیں پائی۔ اس وقت ریڈیو کشمیر جموں میں کارگذار ہیں۔ غزل کے علاوہ انہوں نے کچھ نظمیں بھی کہی ہیں۔ جن میں سے ایک غالب پر" کہتے ہیں کہ غالب کا ہے انداز بیان اور" کے عنوان سے" خدمت" میں شایع ہوئی۔ دوسری نظم جو ڈاکٹر ذاکر حسین کے انتقال پر لکھی گئی تھی۔ وہ بھی اسی روزنامے میں شائع ہوئی ہے۔

پونچھ کے ایک شاعر، گردھاری لال برقؔی کا سنہ پیدائش بھی ۱۹۲۴ء ہے۔ میٹرک کی تعلیم حاصل کر رہے تھے کہ ان کے والد کا انتقال ہو گیا۔ والد کے انتقال کے بعد گھر کی ذمہ داری ان پر آن پڑی اور وہ حویلی تحصیل کے موضع ہوتر میں جو اب پاکستان کے علاقے میں شامل ہے وہ ۱۹۴۷ء تک تجارت کرتے رہے۔ ۱۹۴۷ء کے ہنگاموں میں وطن ہوتر ترک کر کے پونچھ آ گئے اور ہنگامی انتظامات میں ایک وارڈ کے سیکرٹری کا کام کرتے رہے۔ حالات سازگار ہونے پر دوبارہ پونچھ میں کاروبار شروع کیا۔

برقؔ کو شعر گوئی کا چسکہ اوائل عمر سے تھا۔ جو نامساعد حالات، اور غیر ادبی ماحول میں بھی جاری رہا۔ پونچھ کے شعراء جیسے تحسین جعفری، سرشن ناتھ آفتاب، دینا ناتھ رفیق کو کلام

دکھاتے رہے۔ لکھنے سے زیادہ برق کو نامی شعراء کا کلام سننے اور ان کی صحبتوں میں بیٹھنے اٹھنے کا شوق رہا اور اس کا تہذیبی اثر خود ان کے کہنے کے انداز پر بھی پڑا۔ غزل، قطعہ اور نظم تینوں اصناف میں طبع آزمائی کرتے ہیں۔ ایک غزل سے چند شعر یہاں درج ہیں :

بشر نے سینکڑوں ساماں کئے ہیں زیست کی خاطر
مرے کانوں میں چپکے سے قضا کچھ اور کہتی ہے

یہ مانا دیدۂ تر سے رواں ہیں پیار کے آنسو
ترے رنگین ہاتھوں کی حنا کچھ اور کہتی ہے

ہٹا دوں چاند سے رُخ سے سیاہ زُلفوں کی بدلی کو
مگر اے برق نظروں سے حیا کچھ اور کہتی ہے

برق نے جو نظمیں کہی ہیں۔ وہ زیادہ تر وطنی اور قومی ہیں۔ آزادی کے بعد انہوں نے ایک کہی تھی جس میں وہ آزادی کے بعد تعمیر نو کی دعوت نوجوانوں کو دیتے ہیں۔ اس کا پہلا اور آخری شعر ہے :

صیاد کے ظالم ہاتھوں سے گلشن ہے مرا آزاد ہوا
اے اہل چمن اب فرض ہے یہ تزئین گلستاں ہو جائے

اے برق تمنا اتنی ہے مرجھائی کلیاں کھل جائیں
گلشن میں جلوہ طور کا ہو فردوس گلستاں ہو جائے

عرش صہبائی، ریاست کے موجودہ غزل گو شعراء میں نمایاں ہیں، کہنے کو وہ نظم پر بھی طبع آزمائی کرتے ہیں اور خارجی انداز کی شاعری بھی کی ہے۔ لیکن ان کا مخصوص فن غزل کا فن ہے اور داخلیت ان کا شعری رجحان ــــ اس سے تجاوز کی انہوں نے کوشش بھی کم کی، اسی لئے غزلیہ انداز کی شاعری میں انہیں خصوصیت حاصل ہو گئی ہے۔

عرش کا پورا نام ہنس راج ہے اور ایک ولی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں جو جموں کا

ایک معتبر خاندان ہے لیکن اب نام کو شاید بہت کم لوگ جانتے ہیں۔ وہ عرش صہبائی مشہور ہیں۔ جموں ہی میں پیدا ہوئے اور یہیں تعلیم بھی پائی۔ انٹرمیڈیٹ کامیاب کرنے کے بعد ملازم ہوگئے۔ ۱۹۵۷ء سے ریڈیو کشمیر جموں میں برسرِ خدمت ہیں اور جموں کی موجودہ ادبی اور شعری تحریکوں میں ان کا بڑا حصّہ رہتا ہے۔ ایک ادبی ادارہ جو پیر میٹھا میں قائم ہے۔ اس کے وہ روحِ رواں ہیں اور وہ وقتاً فوقتاً شعری محفلوں کا اہتمام کرتے ہیں۔

عرش کو شعر سے لگاؤ زمانہ طالب علمی ہی سے رہا۔ غزل میں ان کی تربیت ہوئی اور غزل ہی پر انہوں نے زیادہ توجہ صرف کی۔ اس صنف میں انہیں اب ایک مقام حاصل ہو چکا ہے۔ غزل کے آداب اور لوازم عرش کو پوری آگاہی ہے اور اظہار کے اسالیب پر بھی انہیں اچھی قدرت حاصل ہے۔ ان کے بیان کے انداز میں حُسن بھی ہے اور فنی رچاؤ بھی۔

عرش کی غزل کا مرکزی موضوع حُسن اور عشق ہے۔ لیکن وہ نئے عہد کے غزل گو ہیں۔ اور نئے تصورات اندازِ فکر کا پرتو ان کی غزل میں جگہ جگہ ملتا ہے۔ ان کے کلام کے دو مجموعے "شکستِ جام" اور "شگفتِ گُل" شایع ہو چکے ہیں۔ تیسرا مجموعہ "چشم نیم باز" مرتب کر چکے ہیں۔ "شگفتِ گُل" پر کلچرل اکادمی کی جانب سے ۱۹۶۱ء میں انعام بھی عطا ہوا۔ اپنے معاصر شعراء کا ایک مختصر تذکرہ بھی "انجم کدہ" کے نام سے مرتب کیا ہے جو اُن کے مکتبہ اُردو ادب، جموں کی جانب سے ۱۹۶۳ء میں شایع ہوا۔ شعری مجموعوں میں زیادہ تر غزلیں شامل ہیں۔ "شگفتِ گُل" میں کچھ نظمیں بھی شامل ہیں۔

عرش شعر میں اظہار اور آہنگ کا بڑا لحاظ رکھتے ہیں۔ اور صوتِ تکرار سے ان کے یہاں خصوصیت نمایاں ہوتی ہے۔ مثلاً ان کے کچھ شعر ہیں:

آپ کچھ خوش تو ہوئے۔ آپ کو تسکین تو ہوئی
پھونک کر دن کے اُجالوں میں فسوں راتوں کا

روداد ہم اے دیدۂ تر کچھ نہیں کہتے
کہنے کو بہت کچھ ہے مگر کچھ نہیں کہتے

جنس اخلاص و وفا کی قدر کر　　　　جنس اخلاص و وفا نایاب ہے

رہِ حیات میں ہر گام پر ہے حرص اور طمع
رہِ حیات میں ہر گام پر ہے دانہ و دام

حیران ہوں ان کے دیدۂ حیراں کو کیا کہوں
دیوانے ہو گئے مجھے حیران دیکھ کر !

فقط اک دل بڑھانے کو، فقط اک بات رکھنے کو
کبھی اہلِ جنوں، اہلِ خرد کی مان لیتے ہیں

اسی سلسلے میں ان کی مترنم بحریں بھی قابلِ ذکر ہیں۔ جن کی تعداد کافی ہے۔ کچھ مثالیں درج ذیل ہیں:

کچھ نشترِ غم کی خلش بھی ہے، کچھ لطفِ مئے گلفام بھی ہے
اس ایک نظر کی جنبش میں، تکلیف بھی ہے آرام بھی ہے
ہم محفل بادہ و ساغر سے اٹھے تو ہیں پیاسے ہی لیکن
آوازِ شکستِ دل میں نہاں، آوازِ شکستِ جام بھی ہے

پھول ہی پھول ہیں جس طرف دیکھیے، پھول ہی پھول ہیں جس طرف جائیے
اور کبھی پرکشش ہو ہر اک رہ گذر وہ جو ہوں ہم سفر چاندنی رات میں

مترنم بحریں اور شگفتہ زمینیں، عرشی کی شاعری کی خصوصیت ہے لیکن محض صوری

محاسن ہی ان کی شاعری کی اہم خصوصیت نہیں۔ وہ زبان، محاورے، طرزِ ادا اور شعری محاسن کی نگہداشت کے ساتھ ساتھ معنی کی خوبیوں کا بھی دھیان رکھتے ہیں۔ حیات اور کردارِ حیات کے بارے میں ان کے اپنے کچھ تجربات اور مشاہدات ہیں۔ یہ موضوع غزل کی شاعری کے لئے نئے نہیں۔ لیکن جب شاعر کا ذاتی احساس اس کو دہراتا ہے، تو وہ نئے معلوم ہونے لگتے ہیں۔ مثلاً غالب کی طرح، جو زندگی کو بندِ غم جانتے ہوئے بھی، ایک عملی مفکر کی طرح اس کے امکانات سے چشم پوشی نہیں کر سکتے تھے۔ اور اسے عدم زندگی پر بہرحال فوقیت دینے پر مجبور تھے۔ عرشؔ بھی زندگی تلاشِ راحت و عشرت میں ناکام رہ کر بھی، زندگی کے قدردان ہیں۔ کہتے ہیں:

اس سے بڑھ کر اور کیا ہوں گی نظر کی پستیاں
زندگی کو کم نظر بارِ گراں کہتے رہے

زندگی کی ہر ادا ہے دل نشیں　　　　زندگی کی ہر ادا کی قدر کر

زندگی ایک نعمتِ خداداد ہوتے ہوئے بھی، اپنے حدود اور اپنے موانعات رکھتی ہے اور جو اس حقیقت سے بے خبر ہیں۔ وہ منزلِ مقصود سے بہت دور ہیں۔ ان کا شعر ہے:

کیا پہنچتے منزلِ مقصود پر　　　　جو رہِ پُر خار سے تنگ آ گئے

غالب نے وفاداری کا ایک معیار بنایا تھا، عرشؔ اربابِ وفا کی پہچان بتلاتے ہیں:

اے عرشؔ! یہ پہچان ہے اربابِ وفا کی
ہر حال میں جیتے ہیں، مگر کچھ نہیں کہتے

عرشؔ کو اس کا شعور ہے کہ انسان جب گرتا ہے تو، کس پستی تک پہنچ جاتا ہے:

عقل خود حیراں ہے وحشت پرستی دیکھ کر
اشرفُ المخلوق کی اس درجہ پستی دیکھ کر

لیکن اس سے ذاتِ انسانی کا احترام ان کی نظر سے اوجھل نہیں ہونے پاتا۔ وہ جب نوع

انسانی کو' انسان کا شکار دیکھتے ہیں، تو ہمارے ترقی پسند شاعروں کے ساتھ ان کا جذبہ خودداری ابھر آتا ہے اور کہہ اٹھتے ہیں:

اے جذبہ خودداری، اے حسرت مختاری　　انسان درِ انساں پر فریاد کناں کب تک

اے اہلِ ستم تم بھی یہ بات ذرا سوچو　　رہتے ہیں ستم خوردہ محروم زباں کب تک

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ عرشؔ کی غزل سے دل بستگی، غزل کے بعض مخالفین کے عقیدے کے مطابق شاعر کو اپنے ماحول اور مسائل سے بے خبر اور برجِ عاج میں بند نہیں رکھتی۔ تبدیلی جو فطرت کائنات ہے اس سے اپنے آپ کو خبردار کرنا چاہتے ہیں:

دیکھ کر رکھیئے قدم اس دور میں

عرشؔ ہے یہ دور، دورِ انقلاب

تبدیلی اور انقلاب کے اس احساس کے ساتھ، زندگی کے نظام اور اپنے تصورات کو رفتارِ انقلاب سے ہم آہنگ رکھنا ضروری سمجھتے ہیں، کہتے ہیں:

بدلنا ہے، مجھے اے عرشؔ، زندگی کا نظام

بلا سے لاکھ رسومِ کہن کے پہرے ہوں

عرشؔ کی غزل، نئے تصورات کے ساتھ، نئے اسالیب اور بعض وقت نئی علامتوں کی ضرورت کا احساس بھی ظاہر کرتی ہے۔ مثلاً ان کے یہ اشعار:

مئے فریب و دغا اب مجھے نہیں درکار　　مئے خلوص و وفا سے بھرا ہے دِل کا جام

سمٹ کے خود ہی چلی آئی منزلِ مقصود　　نہ چلنے پائے تھے اہلِ جنوں، ابھی دو گام

عرشؔ جب دیر و حرم میں نہ مِلا اس کو سکوں

زندگی چپکے سے میخانے چلی آئی ہے

عرشؔ کی شعر و ادب کے ساتھ لگن اور اردو ادب کی اظہاری صلاحیتوں کی وجہ سے اس سے وابستگی، انہیں اپنے بعض اخوان و امثال کی طرح، ادبی دنیا میں نمایاں رکھتی ہے اور جب وہ یہ کہتے ہیں کہ:

یہ آرزو ہے کہ میں خدمتِ ادب ہی کروں
یقین کیجئے، مجھ کو نہیں ہے، خواہشِ نام

تو کوئی اسے تصنع نہیں کہہ سکتا۔

عرشؔ کو بعض وقت اپنی گمنامی کا دکھ بھی ہوتا ہے، لیکن ایسا اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی گمنامی سے لذت یاب بھی ہیں۔ "شگفتِ گل" کے ساتھ چنچل شرما کا تعارف شامل ہے۔ لیکن ان کا اپنے بارے میں ایک لفظ شامل نہیں ہے "انجم کدہ" خود انہوں نے مرتب کیا ہے۔ اور بیس پچیس سے زیادہ معاصر شعرا کے حالات جمع کر کے لکھے ہیں۔ لیکن اپنے بارے میں وہی باتیں لکھی ہیں، جو سب کو معلوم ہیں اور کلام کے انتخاب کو جگہ کی کمی کا عذر کر کے ٹال دیا ہے۔

عرشؔ کی نظموں کی طرف ابتداء میں اشارہ کیا گیا تھا۔ "شگفتِ گل" میں شعراء کی سنت پوری کرنے کے لئے کشمیر پر ایک نظم "مرے کشمیر میں" کے عنوان سے لکھ کر شامل کی ہے۔ اس نظم پر بھی غزل کا سایہ موجود ہے۔ چند شعر اس غزل کے یہ ہیں:

دلبرانہ ہے ہر گلِ رعنا مرے کشمیر میں
موجزن ہے حسن کا دریا مرے کشمیر میں

روشنی ہی روشنی پھیلی ہوئی ہے چارسو
ہو گیا عالم چراغاں کا مرے کشمیر میں

چارسو پھیلی ہوئی ہیں کیف زا رنگینیاں
جا بجا ہے مستیٔ صہبا مرے کشمیر میں

زندگی بھی ہے محبت بھی ہے اہلِ دل بھی ہیں
کیا بتاؤں میں کہ ہے کیا کیا مرے کشمیر میں

جس طرف اٹھتی ہیں نظریں مسکراتی ہے حیات
اب نہیں ہے موت کا کھٹکا مرے کشمیر میں

اسی مجموعے کے آخر میں ایک نظم "وہ دو آنکھیں" بھی شامل ہیں، جو جدید عہد کی اچھی نظموں

میں شمار ہو سکتی ہے۔ یہ تین بند کی نظم ہے۔ اس کا پہلا بند ہے:

وہ دو آنکھیں جو اکثر اجنبی انداز سے مجھ کو
برابر دیکھتی ہیں اور کچھ اقرار کرتی ہیں
نہ جانے کون سے ارمان پنہاں ہیں ان آنکھوں میں
نہ جانے کون سے جذبات کا اظہار کرتی ہیں

عرشؔ نے "سانیٹ" کی صنف پر بھی طبع آزمائی کی ہے اور اظہارِ قدرت نے اس کو بھی اچھا نمونہ بنا دیا ہے۔

زندگی آج یہ کس موڑ پہ لے آئی ہے
دل میں اب تیری محبت کا تلاطم بھی نہیں
لبِ افسردہ پہ اک موجِ تبسم بھی نہیں
اک مری ذات ہے یا عالمِ تنہائی ہے
چاند نکلا ہے، مگر چاندنی مغموم سی ہے
کتنے رنگین نظارے ہیں، مگر کچھ بھی نہیں
مست موسم کے اشارے ہیں، مگر کچھ بھی نہیں
دل پریشان سا ہے، زندگی مغموم سی ہے
تیری محفل سے بہت دور چلا آیا ہوں
اب پلٹ جاؤں یہاں سے کوئی امکان نہیں
دل کو آرام میسر ہو یہ آسان نہیں
ایک طوفان حوادث کا اُٹھا لایا ہوں!
کوئی عالم ہو مگر یاد تری آئے گی
دل کو ہر حال میں، ہر رنگ میں تڑپائے گی

مہندر ریہ ایک اور غزل سرا ہیں۔ جو وادی سے عشق رکھتے ہیں۔ ان کا وطن سرینگر

ہے۔ ان کی نشو ونما بھی غزل کی فضا میں ہوئی۔ ان کے والد کو بھی شاعری کا ذوق تھا، چنانچہ
اس علاقے میں تھیٹر کمپنیوں کے جو گانے مقبول تھے، انہیں کتابچہ کی صورت میں جمع اور شائع
کیا تھا۔ اس کی طرف اشارہ کیا جا چکا ہے۔ اس فضا میں تعجب نہیں کہ رینہ کو بچپن سے،
یعنی جب وہ چھٹی جماعت میں پڑھتے تھے، تک بندی کا شوق پیدا ہو گیا تھا۔ لیکن والد
مکند رام کا مذاق منجھ گیا تھا۔ وہ صاحب زادے کے شعر سن کر خوش نہیں ہوتے تھے اور اس
دلچسپی کو ان کی تعلیم میں ہارج سمجھتے تھے۔ بعض وقت باپ نے بیٹے کو ڈانٹا بھی، لیکن سپوت
بیٹے نے اس ڈانٹ ڈپٹ کو سن کر، شعر کہنے سے پرہیز کرنے کی بجائے، خود اس واقعہ پر
ایک نظم لکھ ڈالی۔ شفیق باپ کے خدشے اپنی جگہ شاید بجا تھے، لیکن بیٹے کا شوق، تعلیم کے
ساتھ پروان چڑھتا رہا۔

مہندر رینہ کی ولادت سری نگر کے محلہ حبہ کدل میں ۲۳ جون ۱۹۲۳ء کو ہوئی۔ ۱۹۳۷ء
میں میٹرک کا امتحان کامیاب کیا اور سری پرتاپ کالج میں داخل ہوئے۔ کالج کی فضا ذوقِ
شعر گوئی کے لئے سازگار ثابت ہوئی اور وہ غزل کہہ کر "مارتنڈ" اور دوسرے اخباروں میں چھپوانے
لگے۔ اسی زمانے میں پنڈت دینا ناتھ نادم سے ان کا تعارف ہوا۔ جو ایک پختہ کار شاعر کی
حیثیت سے منظرِ عام پر آ چکے تھے۔ رینہ انہیں اپنا کلام دکھانے لگے۔ وہ اس زمانے شاد تخلص
کرتے تھے اور نادم کے ساتھ علامہ عامل درویش کی شعری محفلوں اور بزمِ ساغر میں اپنی غزل
سنا کر داد پاتے تھے۔ کالج کے رسالے میں بھی ان کا کلام شائع ہوتا تھا۔

۱۹۴۳ء میں رینہ بی۔ اے کا امتحان کامیاب کیا اور ایم۔ اے کی تعلیم حاصل کرنا
چاہتے تھے، لیکن گھر کے حالات نے انہیں ملازمت قبول کرنے پر مجبور کر دیا اور اٹھارہ روپیہ
ماہوار پر ہندو ہائی سکول میں معلمی کی خدمت قبول کرنی پڑی۔ اس دوران بھی شعر گوئی کا
مشغلہ جاری رہا اور وہ شہر کی ادبی سرگرمیوں میں برابر حصہ لیتے رہے۔ اسی زمانے میں انجمن ترقی
پسند مصنفین کی بنیاد پڑی اور رینہ اس تحریک کے ساتھ وابستہ ہو گئے اور انجمن کے

معتمد بھی منتخب ہوئے۔ ہندو ہائی سکول کی ملازمت انہوں نے جلد ترک کر دی اور ایک خانگی فرم میں تیس روپے ماہوار پر کچھ عرصہ ملازمت کی، پھر روزنامہ "ہمدرد" میں کام کرنے لگے۔ اس تعلق سے رینہ کو صحافت سے بھی لگاؤ پیدا ہو گیا اور وہ ۱۹۴۷ء میں دہلی چلے گئے۔ جہاں "کرم دیر" اور "بندے ماترم" میں کام کرتے رہے۔ نئی دہلی کے محکمۂ بلدیہ میں کچھ دن کلرکی کی خدمت انجام دی۔ ۱۹۴۹ء میں وہ سری نگر لوٹے اور روزنامہ "خدمت" کے مددگار مدیر مقرر ہو گئے۔ ۱۹۵۱ء میں دفتر انتخابات میں ان کا تقرر ہوا اور اب ریاست کی قانون ساز کونسل میں چیف مترجم کی خدمت انجام دے رہے ہیں۔

مہندر رینہ کی متنوع ادبی اور صحافتی دلبستگیوں نے ان کے ذوقِ شعر و ادب کو بھی نکھارا اور ان کی فکر و فن ابھارا۔ ترقی پسند تحریک سے وابستگی کے باوجود قدیم اساتذہ کے کلام سے ان کی دلچسپی قائم رہی اور قدیم اور جدید دونوں انداز کو اپنی شاعری میں سمونے کی کوشش کی اور اب وہ نئی غزل کے اچھے کہنے والوں میں شمار ہوتے ہیں۔ ان کی ایک غزل کے چند شعر یہاں منقول ہیں:

وسعتِ قلب و نظر تو بخش دی — اور جہاں آب و گِل محدود ہے
کر رہا ہوں طے خلا کے راستے — پھر بھی کیا میرا جنوں بے سود ہے
اک ذرا ذوقِ نظر کی ہے کمی — ورنہ کیا ہے جو یہاں مفقود ہے
بڑھ رہا ہے آدمی ہر راہ پر — گو اسیرِ فکرِ ہست و بود ہے

رینہ کی غزل، اپنے رجائی رجحانات کی بدولت ایک امتیاز رکھتی ہے۔ ان کی ایک مترنم غزل کے چند شعر ہیں:

چھوڑو بھی خزاں کے یہ قصے تعمیرِ چمن کی بات کریں
کچھ لالہ و گُل کا ذکر کریں، کچھ سرو سمن کی بات کریں

آ جائے گا آخر موسمِ گُل، اکسیر بنے گی خاکِ چمن

ہر شاخ سے نغمے پھوٹیں گے، اک ایسے قرن کی بات کریں

مانا ہے، مسلّط رات ابھی، پُر ہول اندھیرے چھائے ہیں

جو نورِ سحر کی خالق ہے، اُس شوخ کرن کی بات کریں

پوری غزل میں رمز و کنایہ کا یہی انداز ہے۔ اسی غزل میں وہ اپنی سرزمین کے سخن سنجوں سے ایک چُبھتی ہوئی بات کہتے ہیں:

اے دوست، تعجب ہوتا ہے، ان لوگوں کی بد ذوقی پر

کشمیر کے شاعر ہو کر بھی جو نجد و ختن کی بات کریں

اور مقطع ہے:

سُنتے ہیں کہ ریناؔ کانٹوں سے ہر چاک جگر کو سیتا ہے

اس سوختہ جاں، اس سوختہ دل، اس سوختہ تن کی بات کریں

غزل کے رمزیہ انداز سے ہٹ کر، ریناؔ نے جہاں اپنے ترقی پسند ساتھیوں کی ہمنوائی کی ہے، ان سارے مسائل اور موضوعات پر براہِ راست خیال آرائی کی ہے۔ جو عام طور پہ ترقی پسند شعراء کے یہاں ملتے ہیں۔ نادار اور سرمایہ دار کی آویزش، کسان اور مزدور کی زبوں حالی، جنگ اور امن کے اذکار، حیات اور اس کے مخصوص پہلوؤں کی پیش کشی ریناؔ بھی بڑی خوبی سے کرتے ہیں۔ شودان سنگھ چوہان ان کی فکر اور فن پر تنقید کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "جب وہ ایک افسانوی انداز میں، مظلوم عوام کی زندگی کے مرقعے پیش کرتے ہیں۔ تو انہیں ایک گہرے انسانیت نواز جذبے اور ہمدردی سے لبریز کر دیتے ہیں"

"نیا معبود" "مشعل امن" "زندگی" "زرد چناروں کے نیچے" "میں پوچھتا ہوں" ہندر ریناؔ کی اچھی نظموں میں سے ہیں۔ انہیں پابند اور آزاد دونوں طرح کی نظموں اور ان کی تیکنک پر قدرت حاصل ہے۔ "میں پوچھتا ہوں" کافی طویل اور خیال زا نظم ہے۔ اس میں وہ عشق کی زندگی بسر کرنے والے سرمایہ داروں کو بڑے بلیغ پیرایہ میں یہ احساس

دلانے کی کوشش کرتے ہیں کہ ان کی ساری خوش حالی مزدور کی محنت کا نتیجہ ہے۔

نظم کا اقتباس ہے:

یہ کھیتیاں
یہ لہلہاتی کھیتیاں
یہ مدبھری جواں سال کھیتیاں

. . . .

ہے زندگی رواں دواں
ہے شادمان و نغمہ خواں

. . . .

جو کام کاج سے بچا رہا
جو تلخئ حیات سے بچا رہا

. . . .

مرا تو مدتوں سے بس اسی زمیں سے عشق ہے
اسی کے کھیت سے
اسی کے ہر پہاڑ سے
اسی لئے
اسی لئے میں پوچھتا ہوں کس کی ہیں
یہ کھیتیاں

. . . .

"مشعل امن" شاعر کے تصور امن کی تصویر ہے، امن جو شاعر کا آدرش ہے اس کے کچھ خدوخال ہیں:

امن ایسا کہ ہم تم بھی آزاد ہوں
امن ایسا کہ دھرتی اُگلنے لگے سیم و زر
امن ایسا کہ انسان کا آئین ہو انسانیت

رینہ اور نوعمر شاعروں کی طرح انسان اور اس کی صلاحیتوں کے امکانات کے بارے میں خوش عقیدہ ہیں۔ اسی لئے وہ انسانیت اور اس کی عظمت کے نغمہ خواں ہیں۔ عوام انسانیت کا سرچشمہ ہیں اور یہی در اصل مستقبل کے پروردگار اور حیات کو بنانے اور سنوارنے کے ذمہ دار ہیں۔ انسان ہی حقیقت میں معبود ہے ـــ نیا معبود ـــ اس عنوان سے لکھی ہوئی نظم میں انہوں نے معبود کے پرانے تصور کو ایک داستانِ پارینہ بتایا ہے۔ یہ نیا معبود، حقیقت ہے اور پرانے معبود، جنہیں کسی نے نہیں دیکھا، سات پردوں کے اندر چھپے بیٹھے ہیں۔

"بہاؤ" بھی رینہ کی عمدہ نظموں میں سے ہے۔ یہ بھی کافی طویل نظم ہے اور اقتباس کی متحمل نہیں۔ شاعر کہتا ہے:

ایک ٹوٹے سے دریچے میں بڑی دیر سے ہیں
اپنی بے خواب نگاہوں میں، کئی خواب لئے
کتنے ان دیکھے سوالوں میں ہوں کھویا کھویا

اسی دوران کہیں سے گھڑیال کی آواز آتی ہے اور شاعر کا ذہن فوراً وقت کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ گذراں وقت، رواں دواں وقت، آخر یہ کیا ہے؟ اس کی حقیقت کیا ہے؟ یہ ساکن ہے یا متحرک؟ اور اس تعلق سے یہ سوال کہ وقت کا تعلق شاعر کی ذات سے کیا ہے؟ اسی اثناء میں اس کی نظر آسمان کی طرف جاتی ہے، جس ابر کے ٹکڑے پھیلے ہوئے تھے۔ ان کی مختلف شکلوں کو دیکھ کر کائنات کی پیدائش اور اُجڑنے کی طرف منتقل ہو جاتا ہے اور سلسلہ اس خیال پر ٹوٹتا ہے:

وقت ساکن ہے اسے کرم سے تعلق کیا ہے

صرف ہم ہیں جو گذر جاتے ہیں کھو جاتے ہیں

ارضِ کشمیر کی مدح سرائی میں بھی رینہ کسی اور سخن سنج سے پیچھے نہیں ہیں۔ ایک نظم "کشمیر" کے عنوان سے لکھی ہے اور کئی بند پر مشتمل ہے، اس کا پہلا بند ہے :

ارض کشمیر پکاروں تجھے کس نام سے میں

ماں کہوں، پیار کہوں، پیار کا ساماں کہوں

تجھ کو محبوب کہوں یا کہ نگار گیتی

یا مسیحائے زماں درد کا درماں کہوں

اس کے اور بند ہیں :

ابنِ آدم نے تجھے جنتِ ارضی جانا　　حُسن کاروں نے تجھے حُسن کا ساماں جانا

دیدۂ عشق نے بھی بزمِ نگاراں جانا　　نو بہاروں نے تجھے، جانِ بہاراں جانا

دودھیا چشمے مچلتے ہوئے کہساروں میں

زینتِ شعر بنے، نُطق بنے، ساز بنے

سروِ شمشاد نے بخشا تری قامت کو وقار

لالہ و گُل سے ترے حُسن کے انداز بنے

دور تا حدِ نظر دھان کے کھیتوں کی قطار

جیسے فطرت کی حسینہ کا مچلتا آنچل

صاف شفاف سی جھیلوں کا سماں کیا کہیے

جن میں رقصیدہ ہیں، رنگین دل آویز کنول

اور جہلم کی روانی کہ خرامِ محبوب ‌ ‌ کھینچ لیتی ہے جو انسان کے دِل کا دامن

سلسلۂ کوہ پہ پھیلی ہوئی پیاری مرگیں ‌ ‌ جن کے پہلو میں لہکتے ہیں سہانے گلشن

غلام محمد تسنیم کاشمیری بھی خوش فکر شعراء میں سے ہیں۔ غزل اور نظم دونوں صنفوں میں لکھتے ہیں۔ ان کی ایک غزل کے شعر ہیں:

جانے تیری مے فشاں آنکھوں نے کیا جادو کیا

رُک گئی جو جام کی گردش بھی میخانے میں آج

آؤ، یارو، ہم منا ہی لیں گے اب جشنِ بہار

پھول زخموں کے کھِلے ہیں، دِل کے ویرانے میں آج

حسرتوں کے خون کا اک فیض ہے تسنیم یہ

بھر گیا جو رنگ الیسا مرے افسانے میں آج

ایک اور غزل کے کچھ شعر ہیں:

سایہ ترے جمال کا شمس و قمر میں ہے

ہاں تیری نغمگی ہی نسیم سحر میں ہے

ٹھہرے گا جا کے موت کی منزل میں جانے کب

سانسوں کا کارواں جو پیہم سفر میں ہے

ساقی حدیثِ جام سے مُنکر نہیں ہوں میں

لذّت ہی اور کچھ مرے خونِ جگر میں ہے

"ڈل کے کنارے" ان کی ایک نظم "ہمارا ادب" (۱۹۶۵ء) میں چھپی تھی۔ اس میں چاندنی رات میں ڈل کا منظر پیش کیا ہے:

محوِ سکوں، چاندنی اور جھیل ڈل

یہ فضا یہ خامشی اور جھیلِ ڈل

اور اس روماں خیز فضا میں شاعر کو :

یاد آتا ہے تری جنوں کا ساز

بشارت سلیم بھی غزل اور نظم لکھتے ہیں۔ ان کی نظم "ہیجان" کے کچھ شعر ہیں :

خیال گاہ نظر میں ہیجان بن گیا ہے جمالِ جاناں !
تو اک پری وش، غزالِ صحرا، بہارِ بستاں، جوابِ نکہاں

یہ جسمِ سیمیں، دراز قامت کہ ہو فروزاں بہار جیسے
شبابِ رنگیں پہ رقص کرتی ہو چاندنی کی پھوار جیسے

زمانہ گذرا کہ میرے سینائے شوق پر برقِ حُسن چمکی !
ابھی تلک منتظر ہیں نظریں، خبر تو لو میری چشمِ نم کی

زمانہ بھر میں کہیں نہ کوئی ملا ہے ہمدم دلِ تپاں کا
ابھی وہ عنواں نہیں ملا ہے جو رکھ سکوں اپنی داستاں کا

یہ حادثہ زلیت کا ہے مبہم ہوا ہے دل کیسے نذرِ کُلفت
ہے دل میں انبوہ حسرتوں کا، اسی کو کہہ لیجئے محبت

رحمان راہی، جن کا پورا نام عبدالرحمان اور تخلص راہی ہے۔ کشمیر بھر میں رحمٰن راہی کے نام سے مشہور ہیں اور ایک سنجیدہ فکر ادیب کی حیثیت سے، کشمیر سے باہر کے ادبی حلقوں سے بھی کافی طور پر روشناس ہیں، اس صدی کے چوتھے دہے میں، کشمیر اور ہندوستان کے ترقی پسند شعراء میں نمایاں حیثیت حاصل کر چکے تھے اور اپنی فکری خصوصیات اور نئے شعری تصورات سے اپنے مخصوص شخصی رجحانات کے ساتھ وابستگی کی بدولت ایک امتیازی مقام بھی حاصل کر چکے تھے۔ وہ سری نگر کے ایک متوسط الحال خاندان میں ۱۹۲۵ء میں پیدا ہوئے

لہ : شاید سرِ [illegible] کا مطلب [illegible] کہ یہ بات صحیح ہے

سری نگر میں تعلیم کی تکمیل کی اور فارسی اور انگریزی میں ایم ۔ اے میں امتیاز کے ساتھ کامیابی حاصل کی۔ شعر گوئی کا ذوق ابتداءِ عمر سے رہا اور اُردو میں شعر کہنے لگے۔ اس کے علاوہ تنقیدی مضامین اور کہانیاں بھی لکھتے رہے۔ ان کی قلمی صلاحیتوں کو پاکر، روزنامہ" خدمت " کے ارباب بست وکشاد نے انہیں اپنے ادارہ میں لے لیا اور وہ اس روزنامہ کی ادارت کے فرائض انجام دیتے رہے۔ اسی دوران جموں وکشمیر یونیورسٹی کے شعبۂ فارسی میں ان کا انتخاب لیکچرار کی حیثیت سے ہوگیا۔ اور اُس وقت وہ کشمیر یونیورسٹی میں یہ خدمت انجام دے رہے ہیں۔

راؔہی کی ذہنی نشوونما کے زمانے میں ملک آزاد ہوا۔ اور اہلِ کشمیر کی آزادی اور ذمہ دار حکومت کی سالہا سال کی جدوجہد بارآور ہوئی۔ آزادی کی جدوجہد کے قایدین کی طرح کشمیر کے اہلِ قلم نوجوانوں کے گھٹے ہوئے جذبات بھی نئی فضا میں اُبھرنے کے لئے مچل رہے تھے۔ قایدین نے نئے سیاسی، سماجی اور اقتصادی مسائل سے عہدہ برآ ہونے کے لئے، جہاں نیا کشمیر کا آئین مرتب کیا، ادبی اور فنی سرگرمیوں کو نئی راہوں پر ڈالنے کے لئے کلچرل فرنٹ اور پھر کلچرل کانگریس اور اس کے ذیلی شعبوں کو تشکیل دے کر جو رہنمائی کی۔ اس کی تفصیل گذر چکی ہے۔ راؔہی بھی اپنے سلجھے ہوئے ادبی ذوق کی بدولت نوجوان ادیبوں کے اس گروہ میں شامل تھے، جنہوں نے نئے اداروں سے رہنمائی پائی۔

راؔہی نے جب اُردو میں شعر کہنا شروع کیا، وہ بھی یقیناً روایتی انداز کی غزل کہتے رہے ہوں گے لیکن ان کا ابتدائی کلام اب ہمارے سامنے نہیں ہے۔ ان کے ذوق کی نشوونما کے ابتدائی مرحلے ہی میں نئی ادبی تحریکیں برپا ہونے لگی تھیں۔ انجمن ترقی پسند مصنفین قایم ہوئی، جس کے ساتھ راؔہی بھی اپنے دوسرے معاصرین کی طرح جلد وابستہ ہوگئے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نئی تحریک سے وابستہ ہونے کے ساتھ ہی انہوں نے ماضی سے اپنا رشتہ پورا منقطع کرلیا۔ چنانچہ اس وقت ان کی غزل کے بھی جو نمونے ہمارے پیش نظر ہیں، ان میں رومانی فضا بہت ۔ اور نئی تحریکوں کا اثر زیادہ ہے۔ اس طرح ان کی غزل بھی نئے

عہد کی غزل ہے۔ جس کی رومانی فضا میں بھی نئے اندازِ فکر اور اسالیب کے اثرات در آئے ہیں۔ مثلاً ان کی غزل کے کچھ اقتباسات سے اس کا پتہ چلایا جاسکتا ہے :

یہ کس کے نرم رو قدموں کی مدھم چاپ آئی ہے
کہ محفل میں چراغِ صبح کی لَو تھرتھرائی ہے
پریشاں زلف، چہرہ فق، نظر کچھ کھوئی کھوئی سی
وفورِ شوق نے تیری بھی کیا صورت بنائی ہے!
ٹپکتی ہے ہر اک جانب سے ویرانی سی ویرانی
فضاؤں کو خدا جانے یہ کس کی یاد آئی ہے

یاد پھر اس شعلہ رو کی آگئی — آگئی اور آگ سی بھڑکا گئی
وہ لچک کر رہ گئی قوسِ قزح — یا کوئی نازک کمر بل کھا گئی
دل کی بربادی کا راہی کچھ نہ پوچھ — کھلتے کھلتے اک کلی مرجھا گئی

کیا جانیں وہ، کیا قہر ہے سیلابِ محبت
ساحل سے جو طوفاں کا سماں دیکھ رہے ہیں

جچتی نہیں حورانِ بہشت ان کی نظر میں
ساقی، جو ترا حُسنِ جواں دیکھ رہے ہیں

میں بہک گیا تو بہک گئی مری کائنات بھی سربسر
تھا عجب اثر تھی عجب کشش تری بہکی بہکی نگاہ میں
وہ اُفق پہ چھا گئی بدلیاں، وہ لگا ٹپکنے خمار سا

مرے عزم تو بہ سلام ہے، میں چلا گنہ کی پناہ میں

رہِ تیرہ شبی کا قیام گذرا، خیامِ انجم اُلٹ گئے ہیں
اُفق کے تیور بتا رہے ہیں طلوع نیا آفتاب ہوگا
یہ اُٹھتے اُٹھتے ہی آج موجِ حیات اعلان کر گئی ہے
جو ستمگرِ رہ بن کے سر اُٹھائے فنا وہ سرکش حباب ہوگا
اُلٹ کے رہ جائے گی بساطِ نظامِ عالم یقین مانو
زمانہ بدلے گا چال اپنی، جہاں میں وہ انقلاب ہوگا

غزل کو مخصوص ترقی پسند تصورات کے اظہار کے لئے راہی نے جس طرح برتا ہے۔ اس کی کچھ مثالیں اور ہیں :۔

نقیب نو نے نئے دن کا صور پھونک دیا	اندھیرا ٹوٹ چکا سونے والوں کو تو جگاؤ
قبول جنتِ فردا کا وعدہ، آج مگر	مرے جہاں میں جفا کے جہنموں کو بجھاؤ
زمانہ تھام چکا ہے بغاوتوں کا علم	قدم ملا کے رفیقو، قدم بڑھاؤ بڑھاؤ
اگرچہ رہ بھی خطرناک ہے سفر بھی دراز	مرے شفیق بزرگو، مجھے ابھی نہ ڈراؤ

نہ بجھ سکے گا کبھی آندھیوں سے اب یہ چراغ
حیات نے نئی منزل کا پا لیا ہے سراغ
فسانہائے غمِ دہر، طول کھینچ گئے
ہنسی، حیات کی چھلکا رہی ہے اپنے دماغ
گلوں کو مل ہی گئی آخرش نویدِ بہار

خزاں کے لاکھ جتن پر بھی لہلہائیں گے باغ

نوائے وقت ہے راہی کی ہر صدائے جواں

نفس نفس میں جل اُٹھے ہیں آج اس سے چراغ

جن نئی اور خطرناک راہوں اور دراز سفر کا سامنا شاعر محسوس کر رہا تھا۔ اس پر قدم رکھنے سے پہلے اسے سوچنا پڑا تھا اور جب اس نے فیصلہ کر لیا تو اس کا اعلان، نظم "فیصلہ" میں اس طرح کرتا ہے :۔

ساتھیو، میں نے اب فیصلہ کر لیا

میں بھی اب گیت گاؤں گا مزدور کے

اور جمہور کے

. . . .

کوئی سمجھے نہ سمجھے

کوئی مانے نہ مانے

اب مرا فیصلہ ہے اٹل فیصلہ

آگے اس فیصلے کی وضاحت ہے اور ساتھیوں کو ساتھ چلنے کی ترغیب دلاتے ہیں :۔

آؤ تم بھی مرے ساتھ

آؤ، تم بھی مرے ہاتھ میں ہاتھ دے کر بہ بانگِ دہل آج اعلان کر دو

ہم جو فنکار ہیں

ہم نے ساری اضافی حدیں توڑ کر

اُن سے منہ موڑ کر

آج یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ ہم اپنی فنکاریاں

زندگی کے کھیے پر نچھاور کریں گے

اور گائیں گے مزدور کے ساز پر

"یہ فیصلہ" ایک عذر نامہ ہے، جو ترقی پسند شعراء کی سنّت بن گیا ہے۔

راہی کے فکر و فن کا اصلی سرمایہ ان کی نظمیں ہیں۔ ان کی غزلوں میں بھی جو تعداد میں کُل دس بارہ سے زیادہ نہیں، ان کے مخصوص رجحانات کا پرتو ملتا ہے، لیکن یہ پالے، نئے سنجیدہ اور دور رس اثر رکھنے والے مسایل سے ان کی نبرد آزمائی کے دوران، شاعر کی ذہنی تفریح کے خیابان ہیں۔ ان کی نظمیں بھی کل چودہ پندرہ سے زیادہ نہیں ہیں، ان کے علاوہ کچھ قطعات ہیں۔ اس مختصر سرمایہ کے ساتھ بھی، راہی نے اپنے گردہ شعراء میں ایک نمایاں جگہ حاصل کر لی تھی۔

ماضی سے بے تعلقی، انقلاب کا شعور، حیات کے تقاضوں کا ساتھ دینے کی خواہش، مزدور اور سرمایہ دار کی آویزش، انسانی عظمت کا احساس اور اس کا احترام، راہی کی نظموں کے وہ موضوع ہیں جن سے ہم دوسرے ترقی پسند شعراء کے یہاں بھی دوچار ہوتے ہیں لیکن مسائل سے نبرد آزمائی کا راہی کا طریقہ ان کا اپنا ہے، جسے ہم ان کے فن سے بھی تعبیر کر سکتے ہیں۔ "قہقہہ زر افشاں" ان کی ایک نظم ہے، جس کا موضوع، نئے عہد کے مزدور کا اپنی خودی کو پا لینے پر، جوش اور ولولہ اور ماضی میں اس کے استحصال کی، امیروں سے شکایت ملے رنگین ہیں۔ نظم تغیر کے اٹل ہونے کے تمہیدی تاثرات سے شروع ہوتی ہے۔ نئے عہد کے امکانات کا شعور، مزدور سے کہلواتا ہے:

مردِ مزدور ہوں، سرمایہ پرستوں سے ڈروں؟

آج للکار کے کہتا ہوں، جو کہنا ہے مجھے ـــ

اب وہ احکامِ زباں بندی کی باتیں نہ رہیں

سالہا سال خموشی میں گذارے میں نے

اب تقاضا ہے کہ ایں بڑھ کے کوئی بات کروں

تلخیٔ زیست کے اسباب پہ انگلی رکھ دوں

اپنے آقاؤں سے دو چار سوالات کروں

بولو کیا حق ہے تمہیں، اپنے تعیش کے لئے

مجھ کو دم لینے کے ساماں سے محروم بھی کرو

اور پھر یہ اعلان کر دیتا ہے :

آج سے تم مرے آقا نہیں، دشمن ہو سبھی

نئی تحریک کے ساتھ وابستگی نے راہی کو نیا اندازِ نظر عطا کیا، اور نئے اندازِ نظر نے ان کے تنقیدی شعور کو جگایا۔ اپنے زمرہ کے بہت سے سخن سنجوں کی طرح وہ بھی ماضی سے خوش نہیں تھے، چنانچہ ان کی تنقید کی زد میں ماضی کے سارے سیاسی، ثقافتی، سماجی اور علمی ادارے آگئے ہیں۔ مثلاً کہتے ہیں :

جہل کے قبضے میں ہیں ملک کی دانش گاہیں

. . . .

کیا تمدن کی حفاظت کے یہی معنی ہیں

علم و آگاہی کے دروازے مقفل ہو جائیں

جیب میں سکوں کی جھنکار نہ ہونے کے سبب

آج اٹھتے ہوئے انساں کے ارادے سو جائیں

راہی کی دو نظمیں معرکتہ الآرا ہیں۔ ایک "فنکار" دوسری "موت اور دوشیزہ"۔ پہلی نظم ان کی طبع زاد ہے اور دوسری گورکی نظم "ڈیتھ اینڈ دی میڈن" کا ترجمہ۔ پہلی نظم کا محرک بظاہر اقبال کی "ابلیس کی مجلس شوریٰ" ہے، لیکن موضوع اور ترتیب ان کی اپنی ہے۔ یہ معتدل طول کا ایک ڈرامائی مکالمہ ہے، جس کے تین کردار ہیں : ابلیس، اس کا ایک نوعمر شاگرد اور ایک رسیدہ شاگرد اور موضوع "فن برائے فن" کے پرستاروں کی تضحیک۔ نظم کا آغاز ایک منظر سے

ہوتا ہے، جس میں ہند کے فرنگی سامراج سے نجات ملنے پر خوشیاں منا رہے ہیں۔ ابلیس کے کمسن
شاگرد کو اس خوشی منانے کا سبب سمجھ میں نہیں آتا۔ وہ اپنے کمسن ساتھی سے پوچھتا ہے:

یہ کیسا شور ہے ساتھی، یہ کیسا ہنگامہ آرائی
یہ آدھی رات کو کیسا چراغاں کیسی شہنائی

فضائے ہند میں یہ ناگہاں کیا انقلاب آیا
یکایک آج لی کس فتنۂ دوراں نے انگڑائی

ان سات سوالیہ اشعار میں راہی نے شعری محاسن بڑی خوبی سے صرف کئے ہیں۔ اپنے نوعمر ساتھی
کی یہ حیرانی دیکھ کر، کمسن شاگرد اسے سمجھانا چاہتا ہے۔ اسی دوران لوگ جلوس کی شکل میں اشعار
پڑھتے اور آزادیٔ ہند کے راگ گاتے گذرتے ہیں۔ یہ کمسن شاگرد کی حیرانی میں اور اضافہ کر دیتے
ہیں۔ وہ سارا ماجرا سمجھ جاتا ہے اور ساتھی سے کہتا ہے:

کچھ سُنا، تم نے، مرے ساتھی سُنا! — ہند کہتے ہیں، غلامی سے چھٹا
مرے ساتھی یہ فرنگی کی شکست — ہے حقیقت میں ہماری ہی شکست
اب ہماری وہ جہانبانی گئی — سطوتِ شیطان و شیطانی گئی

ایسے میں ابلیس نمودار ہوتا ہے، وہ نوعمر شاگرد کی تادیب کرتا ہے کہ:

کون شاہی کا مقابل ہو ہے یہ کس کی مجال
تا ابد قائم و دائم ہے فرنگی کا جلال

لیکن فنکار کی انقلاب پسندی کا خیال اسے گھبرا دیتا ہے:

اُف، یہ فنکار، یہ تغیّر و تبدّل کا نقیب
یہ ترقی خواہ یہ، رجعت پسندوں کا رقیب

وہ اپنے شاگردوں کو سمجھاتا ہے کہ فنکار کو تم:

"فن برائے فن کے نعرے کا پرستار بنادو — تیغِ بُرّاں کو سمجھ، کاٹھ کی تلوار بناؤ

نظم مختصر ہے، پھر بھی اس کی ترتیب اور تکمیل میں کلاسیکی معیاروں کا رچاؤ ہے۔

'موت اور دوشیزہ' فنی تکمیل کے لحاظ سے اس پایہ کی نظم نہیں، تاہم اس کی اہمیت اس کے موضوع کی عظمت، فکر کی گہرائی اور گمبھیر انداز میں ہے۔ یہ آزاد نظم ہے۔ زارِ روس جنگ میں غنیم سے شکست کھا کر لوٹ رہا ہے۔ راستے میں ایک گاؤں کے پاس درختوں کی اوٹ سے اسے قہقہہ کی آواز سنائی دیتی ہے۔ وہ جھلا اٹھتا ہے کہ کون میری ناکامی کا مذاق اڑا رہا ہے مصاحبین جا کر دیکھتے ہیں تو درخت کی آڑ میں ایک دوشیزہ کو اپنے محبوب کے ساتھ محوِ راز و نیاز پاتے ہیں۔ وہ زار کو غضبناک دیکھ کر کہتی ہے۔

میرے بزرگوار شاہ زار اپنی راہ لے   میں اپنے دلربا سے ہمکلام ہوں   اور دونوں شادماں ہیں ہم

اس پر زار بھڑ اٹھتا ہے اور مصاحبین کو اس کا گلا گھونٹ دینے کا حکم دیتا ہے۔ موت کو بھی اس دوشیزہ کے حسنِ معصوم پر ترس آجاتا ہے اور محبوب کے ساتھ گذارنے کے لئے ایک رات کی مہلت دے دیتی ہے۔ جب وہ انتظار میں بیٹھی ہوئی تھی۔ اس حسنِ معصوم کی مستی اس پر بھی باوجود پیرانہ سالی، چھا جاتی ہے۔ اور آخر کار خود بھی محبت کا شکار ہو جاتی ہے۔

موت نے آخر محبت کو سہارا دے دیا

شیو دان سنگھ چوہان نے راہی کی شاعری کا تعارف کراتے ہوئے اس کی بعض خصوصیات پر روشنی ڈالی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ راہی کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ وہ اپنے انقلابی تاثرات اور خیالات کو ایسی لطیف اور لچیلی تصویر کشی کے ذریعے بیان کرتے ہیں، جو حسین ہونے کے ساتھ توانا بھی ہوتی ہے اور چونکہ یہ تصویریں حسیہ اور زندگی آمیز ہوتی ہیں۔ اس لئے ان میں جذبات کی شدت بھی ہوتی ہے:

'راہی کی اردو شاعری، باوجود اس میں بہت سی خوبیوں اور مضمر امکانات کے ان کی شاعرانہ شخصیت کی مکمل تصویر نہیں، ان کے ذہنی ارتقاء کے مابعد مراحل کشمیری میں طے ہوئے ہیں، اور اب کشمیری کے سرآوردہ شاعروں میں شمار ہوتے ہیں۔ کشمیری میں ان کی نظموں کے

تین مجموعے شایع ہو چکے ہیں اور آخری مجموعے "تو روزِ صبا" کو ساہتیہ اکادمی کا انعام بھی عطا ہو چکا ہے۔

راہی اچھے نقاد بھی ہیں اور ان کی تنقیدی صلاحیتوں کو انگریزی ادب سے اچھی واقفیت کے سبب بڑا سہارا حاصل ہے۔ ان کے کئی اچھے تنقیدی مطالعے ادبی رسالوں میں شایع ہوتے رہتے ہیں۔ عام ادبی مسائل اور کشمیری شاعری کی تاریخ پر ان کے کچھ مضامین حوالے کی چیز بن گئے ہیں۔ وہ "آجکل" (اردو) کی مجلسِ مشاورت کے رکن بھی رہے اور کشمیر یونیورسٹی کے شعبہ اردو اور فارسی کے ترجمان "ادبیات" کا ایک شمارہ انہوں نے بڑے سلیقہ اور خوش اسلوبی سے ترتیب دیا تھا۔ ان کا ایک خیال آفریں مضمون "شاعری میں ابہام کے موضوع" "آئینہ" ہفتہ وار (شمارہ ۲۳ اپریل ۱۹۶۶ء) میں شایع ہوا تھا۔ اس کا ایک اقتباس ذیل میں درج ہے، جس سے اس اہم ادبی مسئلے کے بارے میں ان کے تصورات کا اندازہ ہوتا ہے۔ لکھتے ہیں:۔

"محض ابہام کی بناء پر کسی شعری کارنامے کی قدر و قیمت سے انکار کرنے والے، شاید اس حقیقت کو بھول جاتے ہیں کہ ابہام ایک لحاظ سے شاعرانہ عمل کا خاصہ ہے۔ . . . ."

"سوال یہ ہے کہ شاعر سیدھے سادھے بات کیوں نہیں کرتا، وہ دو اور دو چار کیوں نہیں بتاتا"

میر، غالب، اقبال، کالرج، ملارمے، ڈلن ٹامس کے یہاں ابہام کی طرف اشارہ کرنے کے بعد کہتے ہیں:

"شاعر سیدھے سادھے بات نہیں کرتا، اس لئے کہ وہ ایسا نہیں کر سکتا، وہ ایسا کرے تو اپنی مخصوص بات، احساس، خیال، تجربے اور اپنی مخصوص لے کو کما حقہ ادا نہیں کر سکتا۔ اس کا تخیل جس قدر دور رس ہوگا۔ اس کا تجربہ جس قدر اچھوتا اور نرالا ہوگا، اسی قدر عام استعمال کی صاف اور واضح منطقی زبان اس

کا ساتھ دینے سے معذور ہو گی۔"

حکیم جلال الدین غازی تیتم کے اجداد ایرانی الاصل تھے۔ تعلیم اور تبلیغ کے سلسلے میں اسکردو آئے اور یہیں مقیم ہو گئے۔ دادا الحاج قاسم علی خان غازی، کشمیر آئے اور سرینگر میں مقیم ہو گئے۔ طبابت میں وہ شہرت رکھتے تھے۔ والد الحاج حکیم صفدر علی کو بھی طب میں مہارت تھی۔ مبتلم ۱۹۲۶ء میں پیدا ہوئے۔ تعلیم سری نگر، علی گڈھ اور پنجاب میں پائی اور عربی میں پنجاب یونیورسٹی سے ایم۔ اے کامیاب کیا۔ تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد انجمن لنفرۃ الاسلام، سری نگر کے مدرسہ میں مدرس مقرر ہوئے۔ اس کے بعد جامعہ باب العلم کے صدر ہو گئے، اس وقت جامعہ میں نایب صدر کی خدمت انجام دے رہے ہیں۔ ادب اور شاعری سے گہرا لگاؤ ہے، فارسی، عربی، کشمیری اور اردو چاروں زبانوں میں شعر کہتے ہیں۔ لیکن ان کی شاعری، نعت اور منقبت تک محدود ہے۔ کلام سے انتخاب ذیل میں درج ہے:

شبِ فرقت، قیامت پر قیامت، دل پہ ڈھاتی ہے
ہٹا دے رُخ سے تو زُلفیں کہ عید دید ہو جائے
جو جل کر لذت دعویٰ راکھ کا اک ڈھیر ہو جائیں
مزاج ہے کہ باطل کی یونہی تردید ہو جائے

ایک مرثیہ کے دو شعر ہیں:

عباسؑ نے جو مشک و علم دوش پر لیا — لڑنے کی تاب کس کو تھی ایسے جری کے ساتھ
زینبؑ نے باہیں ڈال دیں گھوڑے کی یال میں — یہ الوداع تھی آپ کی سبطِ نبی کے ساتھ

ڈاکٹر کاشی ناتھ پنڈت، کشمیر یونیورسٹی میں شعبۂ فارسی کے اُستاد ہیں۔ شاعری، تنقید اور تحقیق سے انہیں گہرا لگاؤ رہا ہے۔ فارسی میں بھی کہتے ہیں۔ پنڈت کی ولادت بارہمولہ کے ایک گاؤں خواجہ باغ میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم گاؤں کے مدرسہ میں پائی اور نیشنل ہائی سکول بارہمولہ

سے میٹرک اور سینٹ جوزفس کالج بارہ مولہ سے بی اے کیا اور ۱۹۵۵ء میں پنجاب یونیورسٹی سے فارسی میں ایم اے کیا۔ اس کے دو سال بعد اُردو میں ایم۔ اے کا امتحان کامیاب کیا اور کالج میں لیکچرار مقرر ہوئے۔ ۱۹۶۱ء میں حکومت ہند نے انہیں ایران روانہ کیا۔ جہاں تہران یونیورسٹی میں بیدل عظیم آبادی پر مقالہ مرتب کر کے ڈاکٹریٹ حاصل کی۔ ۱۹۶۴ء میں جموں و کشمیر یونیورسٹی کے شعبۂ فارسی میں لیکچرار مقرر ہوئے اور اُسی وقت کشمیر یونیورسٹی کے شعبۂ فارسی میں برسرِ کار ہیں۔

ڈاکٹر پنڈت فارسی اور اُردو دونوں زبانوں میں شعر کہتے ہیں۔ تحقیق کے علاوہ تنقید اور تصنیف سے بھی دلچسپی ہے۔ ان کے تنقیدی مضامین رسالوں میں شایع ہوتے رہتے ہیں۔ ڈاکٹر پنڈت کا ایک اہم کام کے دانش کدہ ادبیات کے مشہور اُستاد ڈاکٹر صفا کی تصنیف "تاریخ علوم عقلی در تمدن اسلامی" کا ترجمہ اُردو میں مکمل کر لیا ہے۔ ڈاکٹر صفا کی 'تاریخ ادبیاتِ ایران' کا جو تین جلدوں میں شایع ہوئی ہے، اُردو میں ترجمہ کر رہے ہیں۔ ان کی ایک طبعزاد تصنیف حافظ کے بارے میں مرتب ہو رہی ہے۔ ڈاکٹر پنڈت نے گاندھی جی پر ایک نظم لکھی تھی، جو چار بند پر مشتمل ہے۔ اس کا ایک بند ذیل میں درج ہے:

لحد انجام شہیدِ ناز ہو سکتی نہیں — زندگی ذوقِ نمو کا راز کھو سکتی نہیں
نغمۂ تجدید سے ہے ربط و ضبطِ زندگی — اہلِ دانش مرگ کو کہتے ہیں شرطِ زندگی
غلغلہ افلاک میں ہے نغمۂ توحید سے — خود یہ نغمہ، نغمہ زا ہے بربطِ تجدید سے
بوئے گل ہے یا فغانِ بلبلِ دیوانہ ہے — کارفرما اس جنوں میں صورتِ جانانہ ہے
بشکن ایں بنیاد را ایں خانہ را ویرانہ کن — در حریمِ دیگر آ یک لغزشِ مستانہ کن

ڈاکٹر پنڈت اُردو میں غزل کہتے ہیں۔ اُردو غزل میں جدید عہد کے اسلوب کی جھلک موجود ہے۔ اس سے اُردو شاعروں کے کلام کے وسیع مطالعے کا اندازہ ہوتا ہے۔ ایک غزل کے شعر ہیں:

چھیڑ کر یادِ عشق تری انکار جبر — فسوں کو شیۂ ان شوخ نے کیا ہے

ساقی کو دیا منصب کونین نمائی میخواروں کو ارباب نظر ہم نے کیا ہے
ہاں، اُن کو جلا دے جو ہیں دو چار یہ تنکے اے برق! نشیمن سے حذر ہم نے کیا ہے

ایک اور غزل کے چند شعر ہیں:

ہم خضر کو بتلاتے مرنے کا مزہ کیا ہے
اک بار اگر ہم سے اے کاش ملا ہوتا
پہلے جو سکھا دیتے آداب محبت تو
ہونٹوں کو سیا ہوتا، اشکوں کو پیا ہوتا
صحبت میں گلوں کی بھی کچھ وقت بسر کرتے
کانٹوں سے اگر ہم نے پیماں نہ کیا ہوتا

قیصر قلندر، وادی کشمیر کے ان سخن سنجوں میں سے ہیں، جن کی مساعی اُردو شاعری کو نئی اصناف سے روشناس کرانے میں بڑی حد تک مشکور ہوئیں۔ غنائیے اور تصوریئے (فینٹاسیٹا) ان کی فکر کے خاص طور پر محور رہے ہیں۔ یوں وہ غزل بھی اچھی کہتے ہیں اور نظم پر بھی انہیں بڑی قدرت حاصل ہے۔ قیصر قلندر ایک قدیم علمی خاندان سے ہیں۔ ان کے جد امجد سید محمد شاہ صادق قلندر بخارا سے شاہ جہاں کے عہد میں کشمیر آئے تھے۔ ان کا انتقال یہیں ۱۰۹۱ھ میں ہوا۔ یہ صوفی منش بزرگ تھے۔ اور فارسی کے اچھے شاعر بھی تھے۔ ان کی اولاد میں سید رسول شاہ قلندر، سید بہار شاہ قلندر اور سید نورالدین قلندر عالم اور فاضل گذرے ہیں۔ قیصر کے نام کے ساتھ قلندر کی نسبت، اپنے جد امجد سے ہے۔ سید نورالدین کا مکتب تھا، جہاں وہ فارسی اور عربی کا درس دیا کرتے تھے۔ قیصر کے بڑے بھائی سید قطب الدین قلندر، جو الیس۔ کیو قلندر کے نام سے لکھتے تھے اہلِ صحافت میں ایک مقام رکھتے تھے۔ وہ "صداقت" (ہفتہ وار) نکالتے تھے۔ اس کے بعد مسلم کانفرنس کے اخبار "حقیقت" کے بھی ایڈیٹر رہے۔ جب "حقیقت" بند

ہوگیا۔ تو پھر انہوں نے ہفت روزہ "جہاں گیر" جاری کیا تھا۔ انہیں کے اثر سے قیصر کو بھی صحافت سے گہری دلچسپی پیدا ہوگئی تھی۔

قیصر کی ولادت ۱۹۲۶ء کو ہوئی۔ ابتدائی تعلیم قاری نصر کے مکتب میں پائی بعد میں انگریزی تعلیم کے لئے اسلامیہ سکول میں داخل ہوئے۔ اس زمانے میں مدرسہ کے ہیڈ ماسٹر قاضی ظفر الحسن تھے۔ جو لاہور سے آئے تھے۔ اور علم و ادب کا اچھا ذوق رکھتے تھے۔ مدرسہ کے ایک اُستاد محمد عاصم بھی لاہور سے آئے تھے۔ وہ شعر بھی کہتے تھے۔ قیصر پر ان اساتذہ کے ذوق کا اثر پڑا۔ اعلیٰ تعلیم کے لئے جب وہ سری پرتاپ کالج میں داخل ہوئے اور بعد میں امر سنگھ کالج میں تعلیم کی تکمیل کی۔ مشہور فلسفی، عالم اور صاحبِ ذوق شاعر، خلیفہ عبدالحکیم جنہوں نے اس سے پہلے جامعہ عثمانیہ حیدر آباد میں اُستاد فلسفہ کی حیثیت سے اہم خدمات انجام دی تھیں۔ اُس وقت امر سنگھ کالج کے پرنسپل تھے۔ محمود ہاشمی، جو ترقی پسند تحریک سے متاثر تھے۔ اور اچھے نقاد اور ڈراما نگار تھے۔ اُردو پڑھاتے تھے۔ قیصر جب سری پرتاپ کالج میں پڑھتے تھے، ان کے ادبی ذوق کے مدنظر کالج کے رسالے "پرتاپ" کا ایڈیٹر منتخب کیا گیا تھا۔ امر سنگھ کالج میں تعلیم کے دوران وہ کالج کے رسالے "لالہ رخ" کے بھی ایڈیٹر رہے۔ ۱۹۴۶ء میں انہوں نے پنجاب یونیورسٹی سے بی۔ اے کا امتحان کامیاب کیا اور بعد میں روزنامہ "خدمت" کے ایڈیٹر مقرر ہوگئے۔

قیصر کو اقبال کی "بانگِ درا" پہلے پہل پڑھنے کو ملی، تو وہ اس سے ایسے متاثر ہوئے کہ خود شعر موزون کرنے کی کوشش کرنے لگے۔ پہلے انہوں نے علمبردار تخلص اختیار کیا تھا، پھر کچھ عرصہ قامر تخلص سے لکھتے رہے لیکن بعد میں قیصر تخلص اختیار کیا۔ شعر گوئی کے ساتھ ساتھ وہ مضامین بھی لکھتے رہے۔ چنانچہ ان کے مضامین اُس زمانے میں "ہمدرد" ہفتہ وار "دلشاد" وغیرہ اخباروں اور جموں کے ماہنامہ "پریم" میں بھی شائع ہوتے رہے۔ اُردو سبھا سے بھی ان کا تعلق رہا۔ اور اس تعلق کی بدولت وہ ڈاکٹر محمد دین تاثیر سے بھی متعارف ہوئے تھے۔ حلقہ اربابِ ذوق اور ۱۹۴۳ء میں انجمن ترقی پسند مصنفین سے بھی وہ وابستہ رہے۔ اس وقت

انجمن کے سیکرٹری سوم ناتھ زتشی تھے۔ ۱۹۵۶ء میں قیصر نے ایک نئی بزم اُردو قایم کی جس کے اجتماع حال تک بھی ہوتے تھے۔ ۱۹۵۲ء میں ایک لیکھک سبھا جموں میں قایم ہوئی تھی۔ جو ۱۹۵۶ء تک قایم رہی۔ قیصر کا تعلق اس سبھا سے بھی رہا۔

۱۹۴۷ء میں قیصر "خدمت" کی ادارت سے علیحدہ ہوئے اور ۱۹۴۸ء میں کشمیر بیورو آف انفارمیشن، دہلی میں، پہلی بار سرکاری ملازمت اختیار کی اور سینئر اسسٹنٹ انفارمیشن آفیسر مقرر ہوئے۔ اسی سال ریڈیو کشمیر سے منسلک ہو کر وہ سری نگر آئے اور موسیقی، ڈراما اور تقاریر کا شعبہ ان کے سپرد ہوا۔ کچھ عرصہ جموں کے شعبہ میں بھی مُتعین رہے اور پھر اندور ریڈیو میں پروگرام ایگزیکیٹو کی حیثیت سے کام کرتے رہے، اس وقت ریڈیو کشمیر، سری نگر میں اسسٹنٹ اسٹیشن ڈایریکٹر ہیں۔[1]

قیصر کے ادبی اور شعری کردار کی تعمیر میں تین نمایاں عناصر کا حصہ ہے۔ شعر گوئی کا ذوق انہیں گویا وراثتاً ملا تھا، ریڈیو کی ملازمت کے سلسلے میں موسیقی اور ڈراما سے انہیں گہرا لگاؤ رہا، اس طرح غیر شعوری طور پر شاعری، موسیقی اور ڈراما کے تینوں عناصر ان کی تخلیقات کے محرک بن گئے۔ اسی کا نتیجہ ان کے غنائیے اور تصوریے ہیں۔ قیصر غزل بھی کہتے ہیں اور ان کی غزل میں نئے عہد کی فکر و فن کے خط و خال نمایاں ہیں۔ غنائیہ اور تصوریہ شاعری کے لئے انہیں نئے انداز اظہار اور نئے رمز اور نئی علامتوں سے کام لینے کی ضرورت لاحق تھی، اور یہ رمز اور علامتیں ان کی غزل اور نظم میں بھی دَر آتی ہیں۔ جس سے ان کے اسلوب میں ایک نُدرت سی پیدا ہو جاتی ہے اور بعض وقت وہ اجنبی سا لگتا ہے قیصر کی شاعری میں موسیقی سے ان کے لگاؤ طرح طرح سے نمایاں ہوا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کائینات ان کی نظر میں خود ایک بسیط نغمہ ہے اور اس نغمگی کے آثار وہ زندگی کے بہت سے پہلوؤں میں پاتے ہیں اور انہیں علایم میں ڈھالتے ہیں۔ مثلاً ان کی غزل کا ایک شعر ہے:

---

[1] قیصر اب آل انڈیا ریڈیو کے ایک ڈپٹی ڈائریکٹر جنرل تھے۔

کو بنفتی حُسن کی موجیں تھیں، کچھ آنکھوں میں کچھ پیالوں میں

جو ساحل دل تک آئی ہیں یادوں کے ایک سفینے میں

وہ غزل جس سے یہ شعر منتخب کیا گیا ہے۔ قیصر کی عمدہ غزل ہے۔ جس سے ان کے فکر اور اسلوب کا نکھار بخوبی واضح ہوتا ہے۔ اس کے اور شعر ہیں:

جب درد کی شمعیں جلتی ہیں، احساس کے نازک سینے میں

اک حُسن سا شامل ہوتا ہے پھر تنہا تنہا جینے میں

آغوش تمنا چھو آئیں جب زُلفِ یار کی خوشبوئیں

آنکھوں میں ساون لہرایا، دیپک سے سُلگے سینے میں

پلکوں کے سُلگتے تاروں سے میں رات کی افشاں نہ سکا

شعلوں کو چھپائے پھرتا ہوں، میں دل کے ایک نگینے میں

بہ رنگِ حیا، احساسِ طرب، آئینہ رُخ میں عکس فگن

اک تابش ترے چہرے کی اک آنچ سی میرے سینے میں

ایک اور غزل کے شعر ہیں:

پھول سی باتوں کا چلتا ہے ہمیشہ جادو

نیم خواب آنکھوں میں پلتا ہے ہمیشہ جادو

جیسے احساس کی رگ رگ سے شرارے ٹپکیں

یاد کی آگ سے جلتا ہے ہمیشہ جادو

جاگتے لمحوں میں تلخابۂ شیریں کے سبو

رات کا دل بھی نگلتا ہے ہمیشہ جادو

زلف کے ساتھ مہکتا رہا افسونِ غزل

شعر قیصر سے سنبھلتا ہے ہمیشہ جادو

قیصر کی شاعری پر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پچاسویں دہے کے اواخر تک پنجاب کے حلقہ شعرا اور خاص طور پر حفیظ جالندھری کی ہلکے پھلکے انداز کی نظموں کا اثر گہرا رہا۔ چنانچہ اس دوران جو نظمیں انہوں نے لکھی ہیں ان میں رواں بحروں اور لفظی ترنم پر زیادہ زور ملتا ہے۔ "شام شالیمار" اسی زمانے کی لکھی ہوئی نظم ہے، جس کا پہلا بند ہے۔

حیات نغمہ زار ہے، خیال زر نگار ہے
برس رہی ہیں مستیاں فضا پہ اک خمار ہے
چمن چمن گلوں کی آگ کتنی خوشگوار ہے
رباب چنگ، ہیچ ہیں، سرودِ آبشار ہے
ہوا کبھی عطر بیز ہے
دِلوں کی چال تیز ہے
سکوت نغمہ ریز ہے
یہ شام حشر خیز ہے

سکوت کی نغمہ ریزی کے تصوّر کے علاوہ، جو ان کا محبوب رجحان ہے، ان کا مخصوص انداز ایسی نظموں میں نہیں ملتا۔ "عروس شعر و نغمہ کے حضور میں" کو پڑھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ یونانی دیوی "میوز" ان کے احساس پر چھانے لگی ہے جس کا نتیجہ نظم کلاسیکی سا انداز ہے۔ یہ طویل نظم ہے، جس کا آغاز اس شعر سے ہوتا ہے:

گھٹا اس کا کل پُر پیچ کی برسات لے آئی
عروس شعر و نغمہ ساتھ اپنے رات لے آئی
اس کے جلو میں
گداز نیم شب، آہوں کے نغمے، بر لبط انجم
صبا کا لوچ، غنچوں کا تبسم، بادۂ شبنم

مئے افکار دبزمِ ماہ و مینا تے غزل لائی

لبوں کے احمریں مصرعے دِل آرائے غزل ہوئی

آگے تخیل کا سلسلہ دراز ہوتا جاتا ہے:

"لال چوک" جو "ہمارا ادب" (۶۲-۱۹۶۱) میں شائع ہوئی ہے، جدید انداز کے علاوہ قیصر کے مخصوص اسلوب اور علائم کی حامل ہے۔ یہ ان کی بہت اچھی نظموں میں سے ہے۔ یہ نظم بھی طویل ہے۔ لال چوک سری نگر کا قلب، اور سری نگر، وادی کشمیر کا قلب، سالہا سال سے گذرنے والا زندگی کا قافلہ، یہیں سے گذرا اور ہر برس دھوپ چھاؤں کے قافلے یہاں سے گذرتے ہیں۔ اس احساس کا علامتوں اور استعاروں میں اس سے بہتر اظہار لال چوک کے بارے میں شاید ہی ہو سکا ہے۔ نظم کے اجزاء کی گہری چسپیدگی، اقتباس کی اجازت نہیں دیتی اور اس سفینہ کی محدود وسعت، پوری نظم کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ نظم کا آغاز ہوتا ہے:

زندگی مُدتوں سے رہی مضطرب پردۂ ساز میں جیسے نغموں کے دِل

وقت کے جسم ہی میں دھڑکتے رہے سخت حالات اور نرم لمحوں کے دِل

گیسو و گُل کی خوشبو پریشاں رہی اور پتنگے جلے، جیسے شمعوں کے دِل

دم بخود منتظر تھی کوئی مہ جبیں شمع اُمید کو دِل میں روشن کئے

آرزو سر بہ زانو تھی مغموم تھی چاک تارِ نظر سے کسی نے سیئے

. . . .

انجم شام سے منزلِ شب تلک آدمی تھا یہاں نوحہ خواں نوحہ خواں

. . . .

دفعتاً زندگی پر تبسم کِھلا اُٹھی انگڑائی لے کر نگارِ چمن

جشن انبوہ تھا پھر اسی چوک میں سازِ جمہور پر مرود زن، نغمہ زن

یول رُوف کے فضا میں بکھرتے رہے پھر سنورتی رہی زندگی کی دُلہن

اس طرح دوہرا استعارہ اور دوہرا رمز سا نظم میں پیدا ہوگیا ہے۔ "ایک حادثہ" قیصر کی ایک اور ایک رمزیہ نظم ہے۔ اسی سال ٹیلی وژن کی تربیت کے لئے برسلز بھیجے گئے ہیں۔ وہاں سے ایک نظم "برسلز کی ایک شام" کے عنوان سے لکھ کر ہفت روزہ "آئینہ" (۲۰ ستمبر ۱۹۷۰ء) میں شائع کرنے کے لئے بھیجی ہے۔ یہ نظم ایک ایسے ماحول میں لکھی گئی ہے، جو ان کے عادتی ماحول سے مختلف تھا۔ اس نظم میں برسلز کی زندگی کے ایمائی خاکے ملتے ہیں۔ اس کے کچھ شعر ہیں:

آنگن آنگن پھول کھلے ہیں خوشبوؤں کی بارش ہے
شام کی وادی میں کہتے ہیں ارمانوں کی سازش ہے

روپ کے رسیا، رستے رستے چوستے ہیں رس پھولوں کا
گھر کو لوٹنے والوں کو کچھ دھیان نہیں مشغولوں کا

راہوں کی بے تاب نگاہوں نے کیا منظر دیکھے ہیں
رعنا لمحوں، نازک سوچوں کے کیا پیکر دیکھے ہیں

اونچے اونچے کاشانوں میں رہتا تو ہے ایک ہجوم
انسانوں کے ارمانوں کی دنیا کیا ہے، کیا معلوم

جینے کی ہر آسایش میں بے چینی تنہائی کی
بھاگتے لمحوں میں اب کس کو فکر پڑی انگڑائی کی

قیصر کے تصوّریے دراصل اُردو کو ان کی خاص دین ہے "فنتاسیا" کے لئے، "تصوّریہ" کی اصطلاح بھی انہیں کی تجویز کی ہوئی ہے۔ علی جواد زیدی نے جو اُس زمانے میں کشمیر ہی میں تھے۔ ان تصوّریوں کے بارے میں لکھا ہے کہ "قیصر ایک فنکار اور تجربہ پسند فنکار ہیں۔" اور "قیصر کی تجربہ پسند طبیعت نے ایک نیا گوشہ ڈھونڈا ہے۔"[۱۲] انہوں نے بارہ تصوریے لکھے ہیں، جن میں سات "شمع راہ"، "موت کا مسافر"، "ایک شام"، "خوابِ نا تمنا"، "تلاشِ آدم"، "دیپک جل کا خواب"، اور "تلاشِ سکون"، ایک مجموعے کی صورت میں "سازِ جمال" کے نام سے ۱۹۶۲ء

میں شائع ہوئے ہیں۔ ان کے علاوہ ایک اور طویل تصوریہ "گلریز" اور ایک "کائناتِ گُل نغمہ" رسالوں میں شائع ہو چکے ہیں۔ ان کو شامل کر کے ایک اور مجموعہ قیصر "سازِ آرزو" کے نام سے مُرتب کر رہے ہیں۔

"سازِ جمال" کے دو تصوریئے ماخوذ ہیں۔ "شمع ہدایت" بائیرن سے اور "موت کا مسافر" کولرج سے۔ "خواب زارِ تمنا" "تلاشِ آدم" "تلاشِ سکون" میں اپنے عہد کے بعض مسائل کو موضوع بنایا ہے۔ "پری محل کا خواب" ایک تاریخی پس منظر رکھتا ہے۔ یہ دارا شکوہ کا خواب ہے۔ اس میں تین سو سال پہلے کی تاریخی فضا کا شعور پیدا کرنا آسان نہیں تھا۔ تاہم قیصر نے اپنے تخیّل خداداد کی مدد سے پری محل کی روح اور شاعر کے مکالموں کی صورت میں ایک ماحول پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ دارا شکوہ کی تصوّف اور ویدانت سے دلچسپی مشہور ہے اس کی زبان سے شاعر نے جو شعر کہلوائے ہیں، وہ اس کے کردار کے مظہر ہیں:

ساز ایام اُٹھاؤ کہ سُنیں نغمہ گُل — عمر رفتہ کو ذرا لاؤ کہ ہم آئے ہیں
چار سو جلوہ معبود کی رعنائی ہے — عشق کی گرمی و تندی سے ہوا ہے ظاہر
خود ہی شاہد ہے وہ معبود کہ عبد اور معبود — گلشنِ خواجہ بطحیٰ سے کئی گل پھوٹے
کوہِ ماراں بکمر لعلِ بدخشاں دارد — ایں چنیں بخت کجا تختِ سلیماں دارد

اُردو شاعری میں یہ راہ نئی تھی، لیکن قیصر قلندر نے اپنی ذہانت کے سہارے، اس راہ کو ہموار بنانے کی سعی بلیغ کی ہے۔ وہ لفظوں کے صوتی حُسن اور بحروں کی تبدیلی سے، اپنے ذہنی تاثرات کو نمایاں کیا ہے اور جیسا کہ پروفیسر سید احتشام حسین نے لکھا ہے ــ "اکثر تصوریئے ضمیر انسانی کی گہرائیوں تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش کا پتہ دیتے ہیں ــ" مجتبیٰ حسین نے ان تصوریوں کا بڑا اچھا تجزیہ کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"قیصر قلندر کا روّیہ 'قنوطی' کا نہیں بلکہ ایک 'رجائی' کا سا ہے۔ وہ زندگی میں خوبصورتی اور حُسن کی تلاش کرتے ہیں اور تصور یکانا [illegible]

خوبصورتی اور حُسن کے اطراف ہی بنایا جاتا ہے۔ قیصر قلندر کے ان کامیاب تصوریوں کے پیچھے خود ان کی شخصیت جھلک رہی ہے...... جہاں پری محل کا خواب" اور" ایک شام" جیسے رومانی تصور یئے لکھے ہیں، وہیں انہوں نے 'تلاشِ آدم' اور 'تلاشِ سکون' جیسے تصور یئے بھی لکھے ہیں"۔

قیصر نے کئی تاریخی اور تنقیدی مضامین بھی لکھے ہیں۔ بچوں کی دلچسپی کے موضوعات پر ان کی تین مختصر کتابیں" حبہ خاتون" " للہ عارفہ" اور" امرناتھ یاترا" شایع ہو چکی ہیں۔ ان کے تنقیدی اور تاریخی مضامین ہیں، "کشمیر میں اُردو" ایک مختصر مگر حاوی جایزہ ہے۔ صحافت کے موضوع پر بھی ان کے مضامین شایع ہوئے ہیں اور اپنی خاص دلچسپی کے موضوع، موسیقی اور کشمیری موسیقی پر انہوں نے کئی مضامین شایع کئے، جن کو کتاب کی صورت میں مرتب کر رہے ہیں۔

اکبر جے پوری، پچھلے پندرہ بیس برس سے شعر و ادب کے میدان میں کام کر رہے ہیں۔ یہ اپنے آپ کو جے پوری اس لئے لکھتے ہیں کہ ان کے اسلاف میں میر سید علی تلاشِ معاش میں اتر پردیش کی طرف چلے گئے تھے۔ آخر وہ جے پور گئے جہاں مہاراجہ مادھو سنگھ نے ان کی قدر دانی کی۔ میر سید علی، عربی اور فارسی کے عالم تھے اور لکھنؤ کے مدرسۃ الواعظین سے استفادہ کر چکے تھے۔ ان کا سلسلہ نسب حضرت سید علی ہمدانی تک پہنچتا ہے۔ اکبر جے پور ہی میں ۱۹۲۶ء سنہ میں پیدا ہوئے اور وہیں تعلیم پائی، شعر و سخن سے لگاؤ پیدا ہوا تو سید معشوق حسین اطہر سے مشورہ سخن کرنے لگے۔ وہ اچھی غزل کہتے ہیں اور اپنے زمانے کے بعض واقعات پر کئی نظمیں بھی لکھی ہیں۔

۱۹۴۷ء سنہ میں اکبر اپنے خاندان کے ساتھ کشمیر لوٹے اور اپنی تعلیم کی تکمیل کرتے رہے۔ پنجاب یونیورسٹی سے منشی فاضل کا امتحان کامیاب کیا اور جموں اور کشمیر یونیورسٹی کے ادیب فاضل کا امتحان بھی پاس کیا۔ کشمیر میں وہ محکمہ تعلیم میں ملازم رہے، ساتھ ساتھ

ذوقِ سخن کی کمی ان کی غزل پر لکھنو کے دورِ متاخر کے شعراء کا اثر زیادہ ہے، تاہم اپنے عصر کی تحریکوں کا ردِعمل غزل میں کہیں کہیں نمایاں ہو جاتا ہے۔ مثلاً یہ اشعار :

ہنسی گلوں کی خزاں کو قریب لاتی ہے
سلیقہ چاہیئے اے دوست مسکرانے کا

ہر شام کے پردے میں ہوتی ہے سحر پنہاں
مرنا بھی حقیقت میں جینے کا بہانہ ہے

ہر طرف پھیلا ہوا ہے حسن کا دامِ فریب!
پاؤں، اس وادی میں رکھنا، دیکھ، اے دل، دیکھ کر

اکبر کے اندازِ تغزل پر ان دو شعروں سے روشنی پڑ سکتی ہے :

اے دل نہ جائے ہاتھ سے میدانِ اضطراب
بحث آ پڑی ہے برق سے، اے جانِ اضطراب

گدگدا کر، آپ، دل کو ناخنِ شمشیر سے
ہر دہانِ زخم کا پھر مسکرانا دیکھیئے

نظمیں اکبر نے کئی لکھی ہیں۔ ان میں چند نظمیں کشمیر پر ہیں۔ جیسے "جنتِ کاشمر" اور "تنظیمِ نوبہار" کا پس منظر بھی کشمیر ہی ہے۔ "جنتِ کاشمر" کا ایک اقتباس ہے :

روکشِ انہارِ فردوس آبشارِ کاشمر
نازشِ گلزارِ جنت لالہ زارِ کاشمر

نخل طوبیٰ پست از شاخِ چنارِ کاشمر

فرعِ سدرہ شرمگیں از برگ و بار کاشمر

سرنگوں نہ آسماں از گلستانِ کاشمر

حوضِ کوثر آب آب از رود بارِ کاشمر

یہ سچ ہے کہ یہ کشمیر کے حسن و خوبی کی قصیدہ کے مبالغہ آمیز انداز کی شاعری ہے، تاہم شاعر کے جذباتِ عقیدت ان میں نمایاں ہیں۔ ۱۹۵۹ء میں جہلم میں شدید طغیانی برپا ہوئی تھی، جس کے نتیجے میں بہت سے خانماں تباہ ہوئے اور بہت سا مالی نقصان بھی ہوا۔ اس موقع پر اکبر نے "سیلاب" کے عنوان سے ایک نظم لکھی تھی۔ جس میں سیلاب کی تباہ کاریوں پر آنسو بہائے ہیں۔ اس نظم کا ایک اقتباس ہے:

خونابہ ریز کیوں ہے مری چشمِ تر نہ پوچھ

وجہ شکستگیٔ دلِ نوحہ گر نہ پوچھ

پنہاں مرے سکوت میں ہے داستانِ غم

جس کو بیاں میں کر نہ سکوں وہ خبر نہ پوچھ

گرداب زندگی میں کچھ اس طرح گھر گئے

ڈوبے ہوئے اُبھر نہ سکے عمر بھر نہ پوچھ

طوفانِ [illegible]رح بن گیا جہلم کا پیچ و تاب

کیسا زمانہ ہوگیا زیر و زبر نہ پوچھ

مہجور پر بھی اکبر نے ایک اچھی نظم لکھی ہے، جس سے کشمیری کے اس عظیم شاعر کے ساتھ ان کی عقیدت کا اندازہ ہوتا ہے۔ اکبر نے مرثیئے اور سلام بھی لکھے ہیں۔ ان کی بعض نظمیں جو مرثیہ کے انداز میں لکھی گئی ہیں، وہ ایک قدرت رکھتی ہیں۔ اکبر نے اب تک مختلف اصناف میں کافی کلام اکٹھا کرلیا ہے اور اس سے انتخا[illegible] کر کے ایک مختصر مجموعہ "سازِ شکستہ" کے نام سے

۱۹۶۵ء میں شایع کیا تھا۔ اس پر ایک پیش لفظ کے علاوہ بشیشور پرشاد منور لکھنوی کا بھی ایک تعارف درج ہے:

اکبر جے پوری کی ہمشیرہ شہزادی کلثوم کو بھی شاعری، مضمون نگاری اور تصنیف و تالیف سے لگاؤ تھا۔ وہ شعر کہتی تھیں اور ان کے مضامین جو زیادہ تر خواتین کی دلچسپی سے متعلق ہیں، "نبات"، "خاتونِ مشرق"، "عصمت" اور دوسرے رسالوں میں شایع ہوتے تھے۔ وہ بھی جے پور میں ۱۹۲۸ء میں پیدا ہوئی تھیں۔ تعلیم وہیں پائی اور سولہ سال کی عمر میں خاندان کے ساتھ کشمیر آئیں۔ یہاں ان کی شادی ان کے برادر عم زاد سید مظفر الزماں سے ہوئی۔ شادی کے چار سال بعد ۱۹۴۹ء میں ان کا انتقال ہو گیا۔ ان کے دو رسالے "شمع حرم" اور "شاعرات اور اقبال" ان کی زندگی میں چھپ چکے تھے۔ ایک اور رسالہ "معرکہ کربلا میں صنفِ نسواں کا حصہ" ان کے انتقال کے بعد، اکبر جے پوری نے شایع کیا۔

شہزادی کلثوم، اچھی انشا پردازانہ صلاحیتوں کی مالک تھیں، لیکن ان صلاحیتوں کے شباب پر پہنچنے سے پہلے ہی، یہ سلسلہ منقطع ہو گیا۔ ایک مضمون سے اقتباس ذیل میں درج ہے:

> "شبِ چہار دہم، چاندنی رات ہیں، گلشنِ فاطمہؑ کے بکھرے ہوئے پھول، نوخیز غنچے کربلا کی سُرخ زمین پر قیامت کا منظر پیش کر رہے ہیں، خاموشی کا عالم ہے، فرات کا سُرخی مایل پانی اپنے غیر معمولی سکون سے پیاسوں کی موت پر پریشانی کا اظہار کر رہا ہے۔"

شہزادی کلثوم نے اپنے کلام کا اچھا خاصہ سرمایہ چھوڑا ہے۔ جسے اکبر جے پوری نے مرتب کر کے ۱۹۶۳ء میں شایع کیا ہے، اس مجموعے میں مرحوم نصیر الدین ہاشمی (حیدر آباد) ڈاکٹر شکیل الرحمٰن، ملقیس [illegible] (الہ آباد) [illegible] آبادی اور سیدہ جعفر (حیدر آباد)

کی تقریظیں بھی شامل ہیں۔ مجموعے میں غزلیں، اسلام اور کچھ منقبتیں شامل ہیں۔ کلام
کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ شہزادی کلثوم نے شعر میں ایک اچھا معیار حاصل کرلیا
تھا۔ ان کی غزل میں روحانیت برائے نام ہے بلکہ وہ عشق و محبت کے جذبات کو ایک
نیا موڑ دینے کی کوشش کرتی ہیں۔ مثال کے لئے یہ اشعار:

رُخ بدل دو آج حسن و عشق کی تصویر کا
تم بھی دامن تھام لو اب اپنے دامن گیر کا

جب اہلِ دل کو عشق کا عرفان ہو گیا
حُسنِ فریب کار پشیمان ہو گیا

جس دل میں نہاں عشق کا سودا نہیں ہوتا
اُس دل پہ عیاں جلوۂ مولیٰ نہیں ہوتا

اقتدارِ عشق کا جب مجھ کو عرفاں ہو گیا
جلوۂ حُسنِ ازل محشر بداماں ہو گیا

ہوں غبارِ کارواں منزلِ عشقِ علیؓ   خاک ہے نظروں میں میری مرتبہ اکسیر کا

غزل کی صنف کو انہوں نے زیادہ تر اخلاق کی تربیت کے واسطے کے طور پر برتا ہے، مثلاً:

غیروں پہ بھروسہ ہو، تعجب کا محل ہے
اپنے بھی بُرے وقت میں اپنا نہیں ہوتا

دشمن پہ بھی اللہ، بُرا وقت نہ ڈالے
غربت میں تو سایہ بھی ہمارا نہیں ہوتا

اے غمِ عشق مانگنے والے — اک دلِ دردآشنا بھی مانگ
اے پرستارِ رنگ و بوئے گل — بے خزاں باغِ مدعا بھی مانگ

جگہ جگہ حقائق کی پیش کشی بھی بڑے سلیقے سے کی ہے۔ کچھ شعر ہیں:

برق بھی باغ میں وہیں پہ گری — جس جگہ میرا آشیانہ تھا

شادی و غم کا ہے مجموعہ بہارِ زندگی
آدمی گلدستہ ہے نیرنگیٔ تقدیر کا

تصورِ قیامت تھا وہ طور کا ہنگامہ — بکھرے ہوئے جلوے تھے کھویا ہوا سائل تھا

شہزادی کلثوم کی غزل اس اعتبار سے، ایک انفرادیت رکھتی ہے کہ انہوں نے بعض اور خواتین شاعروں کی طرح تذکیر کے پردے میں اپنے آپ کو چھپانے کی کوشش نہیں کی ہے۔ مثلاً:

دیکھتی ہوں میں ہر اک شے میں تجھی کو جلوہ گر
کون کہتا ہے کہ تو پردے میں پنہاں ہو گیا

فاروق نازکی، غلام رسول نازکی کے صاحبزادے، جدید انداز کے شاعر ہیں۔ سرینگر میں ان کی ولادت ہوئی اور یہیں تعلیم کی تکمیل کی۔ جموں و کشمیر یونیورسٹی سے اردو میں ایم اے کیا۔ اور اس وقت ریڈیو کشمیر سری نگر میں خدمت انجام دے رہے ہیں۔ شعر و ادب کا ذوق ان کا

موروثی سرمایہ ہے۔ غزل بھی کہتے ہیں لیکن بہت کم اور جو غزلیں کہی ہیں۔ ان میں کلاسیکی انداز سے زیادہ ہمارے اپنے عہد کے اسالیب اور مسایل ہیں۔ ایک غزل کے چند شعر ہیں:

مہوشان چمن کی بات کرو	زلیست کے بانکپن کی بات کرو
آج تلخی بہت زیادہ ہے	جام توبہ شکن کی بات کرو
گلعذاروں سے پیار کرنے دو	نرگس و نسترن کی بات کرو
بت کدوں کے چراغ جاگ اٹھیں	اس بت سیم تن کی بات کرو

فاروق نازکی کی فکر کا موضوع زیادہ تر، حیات کے موجودہ مسایل ہیں۔ جنہیں وہ جدید نظم کی تیکنک اور علامتوں کے پیرایہ میں پیش کرنے پر بڑی قدرت حاصل کر چکے ہیں۔ "ایک احساس" اور "تثلیث" ان کے انداز فکر کے اچھے نمونے ہیں۔ ان کی نظموں کا معنوی دروبست اقتباس کا متحمل نہیں ہوسکتا۔ تاہم "تثلیث" کا حصہ یہاں درج کیا جاتا ہے:

میں کہ ہوں امن کے گلشن کا شفق رنگ گلاب

میرے ہونٹوں پہ ہے شبنم کی ملائم تحریر

میرے اوراق پہ مرقوم ہے الفت کی کتھا

قصہ ذوق نظر

قصہ نغمۂ وصل

اور ملاقات کی شاموں کے سہانے قصے

آتش لالہ و گل مجھ سے جلا پانی ہے

چشم نرگس کو دیا میرے ہی جلوؤں نے خمار

میں ہوں پیغمبر گل اور بہاروں کا رسول

میری خوشبو سے صبا اپنا بدن دھوتی ہے

پیکرِ شاخ سے جب کوئی ہٹاتا ہے مجھے

تو کسی شوخ کے جوڑے میں سجا رہتا ہوں

میں کہ تہذیبِ محبت سے ہوں وابستہ کئی صدیوں سے

میں وفاؤں کی علامت ہوں، جفاؤں کا رقیب

میں کہ ہوں امن کے گلشن کا شفق رنگ گلاب

کس نے سوچا ہے کہ لوٹے مرے عظمت کا شباب

آتشِ گل سے وہ بد ذوق جھلس جائے گا۔

شیولال رینہ آزاد، پونچھ کے متوطن ہیں اور شعر و سخن کا ذوق بچپن سے رکھتے ہیں۔ ۱۹۲۸ء ان کی ولادت کا سنہ ہے۔ میٹرک کا امتحان پاس کر کے محکمۂ تعلیم میں ملازم ہو گئے۔ اس وقت گورنمنٹ کالج پونچھ کے دفتر میں کارگذار ہیں۔ جب زمانے آزاد کو شعر گوئی کا شوق ہوا، پونچھ میں تحسین جعفری اپنی سخن فہمی اور شعری دلچسپی کی بدولت شہرت رکھتے تھے۔ آزاد نے انہیں سے رجوع کیا اور ان کے پاکستان جانے تک انہیں کو اپنا کلام دکھاتے رہے۔ غزل اور نظم دونوں میں ان کی طبیعت یکساں رواں ہے۔ ایک نظم کے منتخب شعر ہیں:

اس دورِ انقلاب سے گھبرا نہ اے ندیم

ہر فرد زیرِ گردشِ دوراں ہے آجکل

ہم کو وفا پہ ناز ہے، ان کو جفا پہ ناز

اپنے پہ آپ ہر کوئی نازاں ہے آجکل

آزاد اک دیا نہ تھا جن کو کبھی نصیب

ان کے بھی گھر میں جشنِ چراغاں ہے آجکل

ایک غزل کے چند شعر ہیں:

آپ کے سامنے بات کیسے کروں یعنی اظہارِ جذبات کیسے کروں
لوگ تنگ آ چکے ہیں بدعات سے پیروئی رسومات کیسے کروں
ربطِ ملت سے قائم ہے ہستی مری عزم ترکِ موالات کیسے کروں

آزاد نے قطعات بھی اچھے کہے ہیں۔ جن میں وہ اپنے زمانے کے حالات کے بارے میں اپنے تاثرات کو مؤثر انداز میں پیش کرتے ہیں۔ ایک قطعہ ہے:

جہانِ رنگ و بو ہے خوب لیکن عجب دستور ہے یہ آسمانی
خوشی کے چند لمحے دے دیئے ہیں الم کو دی حیاتِ جاودانی

یش۔ شرما، جموں میں پیدا ہوئے، وہیں تعلیم پائی۔ بی۔ اے میں پڑھ رہے تھے کہ ملازم ہو گئے۔ اور اس وقت ریڈیو کشمیر، جموں میں اناؤنسر کی خدمت انجام دے رہے ہیں۔ کشمیر کلچرل کانفرنس کے ساتھ شرما بھی منسلک رہے اور ترقی پسند تحریک سے متاثر۔ پہلے ہندی میں شعر کہنے لگے، پھر ڈوگری میں کہا اور اردو میں بھی کہتے ہیں۔ کئی ڈرامے بھی انہوں نے لکھے ہیں۔ جن میں سے کچھ ریڈیو سے نشر ہوئے۔ ان کی شعر خوانی کا انداز بہت مؤثر ہے۔ ان کا ایک گیت "میرے گیت" کے عنوان سے "کونگ پوش" (جون ۱۹۵۴ء) میں شائع ہوا تھا۔ اس میں ہندی کا انداز غالب ہے۔ گیت ہے:

کیا تم میرے گیت نہیں ہو
پہچانو تو ذرا غور سے
کیا میں وہ ہی نہیں جو اکثر
روز ملا کرتا ہوں تم سے
کیا تم میرے گیت نہیں ہو
میرے گیتوں میں پریہ سی کی
پیار بھری مسکان نہیں ہے

پائل کی جھنکار نہیں ہے
میرے گیتوں میں آنسو ہیں
میرے گیتوں میں آہیں ہیں
میرے گیتوں میں پیڑا ہے
میرے گیتوں میں ہیں کراہیں
میں نے ان گیتوں میں دیکھے
کھارے آنسو مجبوری کے
میں نے کتنے دیکھے پیسے
گربھ وتی کی مزدوری کے
کیا یہ میرے گیت نہیں ہیں . . .

منظور ہاشمی، غزل اور نظم دونوں کہتے ہیں، لیکن ان کی نظم پر بھی غزل کا سایہ ہوتا ہے۔ ایک غزل کے دو شعر ہیں؛

بھولے سے ان کا رُخ سے اُلٹنا نقاب کا
منظر سا میرے سامنے ہے ماہتاب کا
ان سا کوئی کہاں سے ملے کوئی بتاؤ!
لائے جواب کوئی کہاں لاجواب کا

امین اشرف، نہایت خوش فکر شاعر ہیں اور عموماً غزل کہتے ہیں۔ غزل میں بحروں اور مترنم الفاظ کے انتخاب سے اثر پیدا کرنے کے گُر پر انہیں بڑی قدرت حاصل ہے۔ ان کا کلام اکثر رسالوں میں شایع ہوتا رہا ہے۔ ا

ایک غزل کے دو شعر ہیں:

رنگ انوکھا، روپ نرالا، کچھ جانا پہچانا سا ہے

دلکش قامت بالا، رنگین رُخسار جانانہ ہے

آنکھ شرابی، ہونٹ گلابی، چال عجب مستانہ ہے

دور میں ساغر، رقص میں صہبا، گردش میں پیمانہ ہے

ڈاکٹر حبیب اللہ حامدی، کشمیر یونیورسٹی کے اُستادِ اُردو، اس عہد میں، وادی کے لکھنے والوں میں اپنی وسیع اور متنوع ادبی دلچسپیوں کی بدولت ایک ممتاز مقام رکھتے ہیں۔ وہ حامدی کاشمیری کے نام سے لکھتے ہیں اور کشمیر میں اور کشمیر سے باہر کے ادبی حلقوں سے متعارف ہیں۔ شاعری، افسانہ، ناول، ڈراما، اور ادبی تنقید، ہر شعبۂ ادب میں ان کا کام اور کلام موجود ہے۔

ڈاکٹر حامدی، سری نگر کے ایک معتبر خاندان میں ۱۹۳۲ء میں پیدا ہوئے۔ تعلیم سری پرتاپ کالج میں پائی اور ۱۹۵۴ء میں انگریزی میں ایم۔ اے کا امتحان کامیاب کیا۔ ۱۹۵۸ء میں اُردو میں بھی ایم۔ اے۔ کر لیا۔ ان کی ملازمت کا آغاز کالج کی لیکچراری سے ہوا۔ پہلے وہ انگریزی کے لیکچرار مقرر ہوئے۔ اسی دوران حیدر آباد کے سنٹرل انسٹی ٹیوٹ آف انگلش میں انگریزی زبان اور ادب کی تدریس کی تربیت حاصل کی۔ کچھ عرصہ وہ جموں وکشمیر کلچرل اکادمی میں مددگار معتمد کی حیثیت سے بھی کام کرتے رہے۔ ۱۹۶۲ء میں ان کا انتخاب جموں وکشمیر یونیورسٹی کے پوسٹ گریجویٹ شعبۂ اُردو میں لیکچرار کی حیثیت سے عمل میں آیا۔ اور اس وقت کشمیر یونیورسٹی کے اس شعبہ میں کارگذار ہیں۔ ۱۹۶۶ء میں "جدید اُردو نظم اور یورپی اثرات" کے موضوع پر مقالہ مرتب کر کے، جموں وکشمیر یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی[1]

---

[1] : جب سے ڈاکٹر حامدی کی تنقید پر کئی کتابیں "غالب کے تخلیقی سرچشمے" "اقبال اور غالب"، "نئی حیثیت اور اردو ادب" "کارگہِ شیشہ گری" اور شعری مجموعہ "نایافت" بھی شائع ہو چکے ہیں۔

ڈاکٹر حامدی، افسانہ نگاری اور شاعری کا شوق کم عمری سے رکھتے تھے۔ ابتداء میں وہ شہزور کاشمیری سے مشورہ کرتے رہے۔ پہلے پہل وہ افسانہ نگار کی حیثیت سے ادبی دُنیا سے روشناس ہوئے۔ ان کے افسانوں کا پہلا مجموعہ "وادی کے پھول" کے نام سے شایع ہوا تھا۔ دو ناول "بہاروں میں شعلے" اور "پگھلتے خواب" اس کے بعد شایع ہوتے۔ اب تک افسانوں کے دو اور مجموعے "برف میں آگ" اور "سراب" اور ایک نیا ناول "بلندیوں کے خواب" شایع کر چکے ہیں۔ حامدی کے کلام کا پہلا مجموعہ "عروسِ تمنا" ۱۹۶۱ء میں شایع ہوا تھا۔ ان مجموعوں کی اشاعت کے بعد بھی، انہوں نے کئی افسانے اور ناولٹ لکھے اور کلام بھی ریاست کے اور باہر کے رسالوں میں شایع ہوا ہے۔ "عروسِ تمنا" کو کلچرل اکادمی کی جانب سے انعام بھی ملا۔

"عروسِ تمنا" میں ان کے عنفوان کا کلام شامل ہے۔ یہ غزلوں اور نظموں پر مشتمل ہے۔ اس ابتدائی دور کے کلام میں بھی انداز غزل گوئی کے کچھ نئے تاثرات اور نظموں میں فکر اور اسلوب کے کچھ جدید آثار سے ہم روشناس ہوتے ہیں۔ ان کی فکر اور ان کے تجربے اپنے لئے اظہار کے نئے سانچے پیدا کرتے ہیں۔ مثلاً مختلف غزلوں سے چند منتخب اشعار یہاں درج کئے جاتے ہیں۔

قبائیں چاک پھولوں کی، تو بلبل شعلہ آواز
قیامت خیز ہے دوشیزۂ فطرت کی انگڑائی

تمنا مسکرائی، آرزو کے پھول مہکے ہیں
تو پاس آئی مرے ویرانہ دِل میں بہار آئی

فلک سے آ ہی گیا میری آہ کا یہ جواب
وہ دل ہی کیا کہ جو سوزِ الم کا لائق تھا

تری نظر ہی پہ غالب ہیں صد حجابِ قیود
کہا یہ کس نے کہ حُسنِ ازل ہے زیرِ حجاب
یہی ہے زیست تو تجھ کو ہی یہ مبارک ہو
اُبھر کے مٹتے ہیں بحرِ جہاں میں مثلِ حباب

یہ صحیح ہے کہ حامدی کا طرزِ سخن اس زمانے میں بھی عام روایتی انداز سے ہٹا ہوا تھا۔ اس کے باوجود اپنے کچھ اور معاصر سخن سنجوں کی طرح ، کہنہ نظامِ فکر و نظر" کو بدل دینے اور اور ایک نظامِ نو کی طرح اندازی کرنے کی خواہش ان کے دل میں بھی مچل رہی تھی چنانچہ اپنی ایک نظم" شامِ خزاں" کے آخری بند میں کہتے ہیں:

تو آ، بنائیں گے ہم پیار کا نیا معیار
بدل ہی ڈالیں یہ کہنہ نظامِ فکر و نظر

" عروسِ تمنا" میں نظموں کی بھی ایک کافی تعداد ہے۔ ان میں سے چند کشمیر سے متعلق ہیں اور یہ شعراء کی سنت کی تکمیل ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ ان مخصوص لمحات میں شاعر کے ذہنی تاثرات کی نمائندگی بھی ان سے ہو جاتی ہے۔ جشنِ بہاراں، گلمرگ، شالیمار کی ایک شام اور شامِ خزاں مقامی دلکشیاں رکھتی ہیں لیکن حامدی مرقع رنگاری اور بیانیہ شاعری سے مَس نہیں رکھتے۔ ایسے موقعوں پر بھی وہ دروں بینی کی طرف مائل ہو جاتے ہیں۔ وہ ساری بیرونی دلچسپیوں کو اپنے جذبات کے اندر ہی سمیٹ لینا چاہتے ہیں۔ شالیمار کی شام میں ان کے لئے:

یہاں دھڑکتے دِلوں کے حسیں فسانے ہیں
جمال و شوق کے خواب آفریں ترانے ہیں
ہر ایک شاخ کے ہاتھوں میں پھول کے ساغر
ہر ایک کیاری میں کتنے شراب خانے ہیں

" شام خزاں " کم شاعروں کا موضوع بنی ہے۔ حامدی آغاز میں خزاں کی طرف ایک ہلکا سا اشارہ کر کے،

یہ زرد پتے، یہ افسردگی، یہ شام خزاں

وہ اپنے آپ میں ڈوب جاتے ہیں

مری نگاہ دھندلکوں میں کھوئی جاتی ہے

مری حیات کے ان ہی اداس لمحوں میں

جو یاد آتی ہے ، زخموں کی یاد آتی ہے

ان نظموں سے ہٹ کر دوسری نظموں میں شاعر کے لئے اپنے من میں ڈوب جانے کی بڑی گنجائش ہے اور حامدی نے اس سے پورا فایدہ اُٹھایا ہے۔ حامدی کے اس مخصوص رجحان کی بدولت، ان کی غزل اور موضوعاتی نظموں کے درمیان فاصلہ بہت پایاب رہ جاتا ہے۔ یہ معروضیت، ان کے بیشتر کلام میں نمایاں ہے۔

پچھلے ختم ہونے والے دہے میں، اپنے انقلاب پسند ہمراہوں کے ساتھ قدم تیز تر کر دینے کی تمنا اور بھی زیادہ نمایاں ہوگئی ہے اور وہ نئے اسالیب، نئے موضوعات اور نئی علامتوں کا سہارا لے رہے ہیں۔ اس زمانے کی ایک غزل کے چند شعر ہیں:

رات جلتی جبیں پہ لہرائے ۔۔۔ تیرے ہاتھوں کے شبنمی سایے

تیرے چہرے پہ غم کا سایہ ہے ۔۔۔ کتنے لمحوں کے چاند گہنائے

اجنبی گیت، نقرئی آواز ۔۔۔ چاندنی دشت میں بہک جائے

دشتِ شب میں کہیں سحر نہ ملی ۔۔۔ ہم لسے دور تک پکار آئے

ڈھل گئے جب خیال لفظوں میں ۔۔۔ بجلیاں ہم گرفت میں لائے

افسانہ نگاری، جو حامدی کی پہلی محبت تھی، اس کو بھی وہ سلیقہ سے نباہ رہے ہیں۔

کشمیر کی زندگی اور اس کا ماحول حامدی کے افسانوں اور ناولوں کا پس منظر ہے

اس پس منظر میں وہ زندگی کے مسایل اور فکری اور بعض وقت فنی خط و خال کو ابھارتے ہیں۔ ان کے اسلوب میں جاذبیت ہے اور فن شناسی کے علایم بھی اس میں ملتے ہیں۔ مثلاً وہ یہ بخوبی جانتے ہیں کہ کسی تخلیقی کارنامے کو کب اور کس طرح کا موڑ دینا چاہیئے۔ وہ عموماً آغاز ہی میں اپنے پڑھنے والوں کے جذبات کو اپنی گرفت میں لے لینا چاہتے ہیں۔ ان کے ایک افسانہ "رنگ و روشنی" کا آغاز اس طرح ہوتا ہے۔

"رنگین اور معطر اوراق آگ کا لمس پاتے ہی 'لال' پیلے اور نیلے رنگ کے نرم شعلوں میں ڈھل رہے تھے۔ شعلے لپک رہے تھے اور لفظوں کے اندر جاگتے ہوئے، سرسراتے ہوئے احساس کی نازک سرسراہٹوں کو چاٹ رہے تھے۔ دل کی دھڑکنیں بھسم ہو رہی تھیں، خواب جل رہے تھے۔ دھواں اٹھ رہا تھا۔"

یہ ایک محبوبہ کے خطوط کے نذرِ آتش ہونے کا منظر ہے۔

ڈاکٹر حامدی کی تنقید کا مظہر ان کا مقالہ "جدید اردو نظم اور یورپی اثرات" ہے جس میں انہوں نے اردو میں صنفِ نظم کے آغاز اور ارتقاء کی تنقیدی تاریخ پیش کی ہے۔ جوش ملیح آبادی کی شاعری پر تنقید کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"جوش کا رومانوی رجحان، جس کا اظہار فطرت سے ربط میں ہوا ہے، کی تعمیر میں ان کے تصورِ عشق کو بھی دخل ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ ان کا کوئی مخصوص تصوّرِ عشق ہے؟ اس کا جواب نفی میں ہے۔ جوش عشق کے بارے میں نہ اقبال کی طرح متفکرانہ انداز میں سوچتے ہیں اور نہ اختر شیرانی کی طرح اسے شخصی سطح پر لاتے ہیں۔ وہ عشق کا ایک اوپری اور سطحی تصوّر رکھتے ہیں اور اسی کا سبب ان کے عشق ہائے ناکامران ہیں۔"

حامدی کا دوسرا تنقیدی کارنامہ "غالب کے تخلیقی سرچشمے" غالب کی سو سالہ برسی کے

موقع پر، شعبۂ اُردو کشمیر یونیورسٹی کی جانب سے شایع کی گئی ہے۔ اس میں غالب کے شعری محرکات کا تجزیہ پیش کیا گیا ہے:

پرتھوی راج خمار، ریڈیو کی ملازمت کے سلسلے میں جموں میں رہے۔ ان کا وطن حافظ آباد ہے اور ولادت کا سنہ ۱۹۳۱ء۔ انہیں شاعری کے علاوہ مصوری سے بھی لگاؤ ہے۔ چنانچہ میٹرک کا امتحان کامیاب کرنے کے بعد مصوری سیکھتے رہے۔ کچھ عرصہ ہماچل پردیش کے محکمۂ ٹرانسپورٹ میں ملازمت کی اس کے بعد سنہ ۱۹۵۶ء میں کُل ہند ریڈیو سے متعلق ہو گئے۔ جالندھر میں اناؤنسر کی خدمت انجام دی پھر جموں آئے۔ جالندھر میں قیام کے زمانے میں امر چند قیس جالندھری کو اپنا کلام دکھلاتے رہے۔ ہندی میں بھی شعر کہتے ہیں لیکن اُردو شاعری سے زیادہ دلبستگی ہے۔ غزل اچھی کہتے ہیں۔ ان کے کچھ شعر ہیں:

رہِ عشق میں وہ مراحل بھی آئے
جہاں لب ہنسے دل نے آنسو بہائے

دھڑکتا ہی رہتا ہے شام و سحر دل
کبھی بھول کر بھی قرار اس کو آئے

نظر منتشر، دل پریشاں، جگر شق
خمار، اس طرح بھی طبیعت نہ آئے

خیال ماسوا کے پیچ و خم میں
ازل ہی سے بشر اُلجھا ہوا ہے

ہر بھگوان شاد، جموں کے متوطن ہیں۔ شعر و سخن سے دلچسپی ہے۔ چینی حملہ کے دوران ریاست کے شعراء نے کئی اچھی نظمیں قومی احساس کو بیدار کرنے کے مقصد سے لکھی تھیں، جن میں سے چند منتخب نظموں کو ریاست کی کلچرل اکادمی نے "وطن کی پکار" نام سے سنہ ۱۹۶۲ء میں شایع کیا تھا۔ اس میں شاد کی ایک نظم "جھانسی کی تلوار و جاگو" بھی شامل ہے اس کا ایک بند ذیل میں درج ہے:

جھانسی کی تلوارو جاگو، دشمن سر پر آپہنچا

بھارت کے سردارو جاگو، دُشمن سر پر آپہنچا

بھارت کے شمارو جاگو، دُشمن سر پر آپہنچا

بھارت ماں کے پیارو جاگو، دُشمن سر پر آپہنچا

دیش کے پہرے دارو جاگو، دُشمن سر پر آپہنچا

شاد نے "جموں کی اُردو صحافت" دو مضامین لکھے ہیں۔ جو کلچرل اکادمی کے ترجمان 'شیرازہ' کے شماروں میں شایع ہوئے ہیں۔ یہ مضامین ریاست میں اُردو صحافت اور خاص طور پر جموں میں اس کی ابتداء اور ترقی کے بارے میں بہت مفید معلومات فراہم کرتے ہیں۔

طاؤس بانہالی، جن کا پورا نام خواجہ غلام رسول اور تخلص طاؤس کرتے ہیں۔ بانہال کے موضع کھسکوٹ میں ۱۹۲۳ء میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کے والد خواجہ احمد خان موضع کے زمیندار ہیں۔ بانہال کا علاقہ بھی قدیم دور میں اچھے علماء اور فضلاء کی جائے افزائش رہا ہے۔ طاؤس کی ابتدائی تعلیم بانہال ہی میں ہوئی۔ ۱۹۴۷ء میں وہ اپنے چند اور ساتھیوں کے ہمراہ پاکستان چلے گئے اور اب آزاد کشمیر میں مقیم ہیں۔ وہیں بی۔ اے کا امتحان کامیاب کیا۔ شعر و سخن سے ابتداء سے انہیں دلچسپی تھی۔ ۱۹۴۵ء میں انہوں نے ایک غنائیہ "وقت کا لٹیرا" کے نام سے لکھا تھا۔ پاکستان منتقل ہونے کے بعد سے، انہوں نے تخلیقات کیں۔ ان کے بارے میں معلومات نہیں ہیں۔[۱]

طاؤس کے والد بھی بڑے بذلہ سنج ہیں اور قصہ گوئی میں بھی وہ مہارت رکھتے ہیں۔ طاؤس کے چھوٹے بھائی کو بھی شعر و سخن سے لگاؤ ہے۔

۱: طاؤس صاحب اسلام آباد پاکستان میں رہتے ہیں۔ اور آزاد کشمیر ریڈیو میں ملازم ہیں۔ انہوں نے حضرت شیخ نور الدین ولیؒ کے کشمیری کلام کا منظوم ترجمہ کیا ہے۔ جو پاکستان سے چھپ چکا ہے۔

طاؤس کے ایک ہم وطن اور دوست، مرغوب بانہالی بھی شعر و شاعری کا شغف رکھتے ہیں۔ وہ ۱۹۳۷ء میں بانہال کے موضع بنکوٹ میں پیدا ہوئے۔ گھر کے نامساعد حالات کی وجہ سے میٹرک کامیاب کرنے کے ساتھ ہی معلمی کا پیشہ اختیار کرنا پڑا۔ اپنی خدمت انجام دینے کے ساتھ ساتھ منشی فاضل اور ڈپلوما اِن ٹیچنگ کے امتحانات کامیاب کئے۔ اس کے بعد بی۔ اے اور اُردو اور فارسی میں ایم۔ اے کیا۔ کچھ عرصہ رمبلان، ریاسی اور ٹھٹھار میں ہائی اسکول کے ہیڈ ماسٹر بھی رہے، اور تحصیل ایجوکیشن افسر کی حیثیت سے بھی خدمات انجام دیں۔ ۱۹۶۹ء میں کشمیر یونیورسٹی کے شعبہ فارسی میں لیکچرار مقرر ہوئے۔

مرغوب اُردو اور فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتے ہیں۔ اُردو میں زیادہ تر غزل پر طبع آزمائی کی ہے۔ ان کے کچھ شعر ہیں:

کب تک وفا کے زمزمے گائے کسی کا دِل
کب تک جفا کا درد چھپائے کسی کا دِل
تابانی خرد سے سکون ہے گریز پا
ڈھونڈے ہے پھر جنون کے سائے کسی کا دِل

ایک اور غزل جس کا پس منظر کشمیر کی بہار ہے اور تقریباً مسلسل ہے، اس کے شعر ہیں:

پھیلا ہوا ہے چار سو جلوہ بہار کا
ہے یہ شفق بھی عکس کسی لالہ زار کا
مشکل ہے کھلنے پائے مرا غنچہ اُمید
ہمدم مجھے پیام نہ دے نو بہار کا

سلطان الحق شہیدی، گذشتہ اٹھارہ بیس سال سے ادبی میدان میں ہیں۔ ریاستی انجمن ترقی اُردو میں کام کرتے رہے اور مشاعروں میں اپنا کلام سنا کر داد حاصل کرتے رہے۔

ان کا پورا نام محمد سلطان ہے۔ لیکن سلطان الحق شہیدی کے نام سے لکھتے ہیں۔ ان کی پیدائش کا سنہ ۱۹۲۵ء ہے۔ میٹرک اور ادیب فاضل کے امتحانات کامیاب کرنے کے بعد میکانکس کا ڈپلوما حاصل کیا۔ اس وقت گورنمنٹ ہائی سکول بٹہ مالو میں مدرس ہیں۔ شہیدی غزل کہتے ہیں، لیکن آج کل نئے انداز کی نظموں کی طرف ان کی توجہ زیادہ ہوگئی ہے۔ غزلیں اور نظمیں رسائل اور کلچرل اکادمی کے "ہمارا ادب" میں شائع ہوتی رہتی ہیں۔ ان کی مختلف غزلوں سے منتخب شعر ہیں:

کشتی شوق کو موجوں کے حوالے کردو — بحر ہستی میں اُمڈ آئے جو طوفان کوئی
حاصل عمر گراں مایہ سمجھ لو اس کو — بزم احباب میں مل جائے جو انسان کوئی
اب بھی انسان ہے انساں کے ہاتھوں مجبور — گرچہ فغفور نہ کسریٰ ہے نہ خاقان کوئی
عظمت کفر سے ہے قائم دیں — کعبہ کیا، گر نہ ہوں یہ بت خانے
ہائے رندوں کی بدمذاقی سے — ٹوٹتے جارہے ہیں پیمانے
جس کا مرہم نہیں ہے تو بھی دوست — گھاؤ ایسے دیئے ہیں دنیا نے

شہیدی کی حالیہ غزل پر فکرِ نو کا اثر ہے، لیکن انہوں نے کچھ آزاد نظمیں بھی اچھی کہی ہیں۔ ایک نظم "ساحلِ نو" کے عنوان سے "ہمارا ادب" (شمارہ ۱۹۶۵ء) میں شائع ہوئی تھی۔ یہ طویل نظم ہے۔ جس میں اختر شیرانی کی طرح محبوب کے لئے سلمیٰ کے استعارے سے کام لیا ہے۔ اسی شمارہ میں ان کی ایک اور نظم "خلاصہ" کے عنوان سے شائع ہوئی ہے، جس میں تکوین ارض اور تخلیق انسان کی روداد لکھی ہے۔ اس کے اقتباس حسب ذیل ہیں:

بے کراں آسماں
چاند سورج لئے
ظلمتوں سے مسلسل نبرد آزما
تھے، اور یہ زمیں کو آتش فشاں سی کبھی بھی

کچھ سکوں سا مِلا اس کشاکش کو جب
سرد ہونے لگے کوہ آتش فشاں
گھاس اُگلنے لگی اور زر خیز یاں
زیست کو اپنی جانب بُلانے لگی

. . . .

چند کیڑے پلے، چند حیوان بڑھے اور تکمیل انسان کی صورت ہوئی۔

آگے تہذیب کی نشو و نما کا بھی مجمل خاکہ پیش کیا ہے:

فرحت گیلانی، جن کا نام محمد اسلم ہے، فطرت گیلانی کے فرزند ہیں اور کشمیر کے گیلانی خانوادہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ والد فارسی کے اچھے شاعر ہیں اور اُردو میں بھی طبع آزمائی کرتے ہیں۔ فرحت زیادہ تر اُردو میں شعر کہتے ہیں۔ غزل اور نظم دونوں اصناف میں لکھتے ہیں۔ ایک طویل نظم "بہارِ توبہ شکن" عنوان سے لکھی تھی، جو "ہمارا ادب" (۱۹۵۹ء) میں شایع ہوئی۔ نظم کس قدر طویل ہے، اور کشمیر کی بہار اس کا محرک، اس کی ابتداء اور آخر کا اقتباس ہے:

درست ہوگا عذاب و ثواب کا قصہ
بجا ہے تیری یہ گفتار طاعت و عصیاں
مگر مرے ناصح، قصور میرا نہیں حسن کائنات کا ہے
بھٹکتے پھرے در در دل پہ کوئی کیسے کر جب

دیارِ لالہ و گُل میں نگار حسن و بہار
بصد نوازش پیہم ہو جام لالہ بدست
گرا رہی ہو تبسم کی بجلیاں ہر سو
کہ جب حیات کے ناز آفریں جلیں عارض

گلاب بن کے گلستاں میں لہلہاتے ہوں

نوائے شاعرِ رنگیں بیاں کی لَے پر جب

طیورِ باغ کے گوشوں میں چہچہاتے ہوں

. . . .

فلک پہ چاند کی ضو پاشیوں کی تابانی

یہ نغمے قمری رنگیں بیاں کے بصورتِ ہزار

شرابِ حُسن سے بھرپور ہوں، کنول کے ایاغ

یہ حسنِ فطرت و ہنگامِ شامِ شالامار

زبانِ حال سے کہتے ہیں اے مرے ناصح

یہ وقتِ زہد و ریاضت نہیں خُدا کی قسم

گھڑی ہے، خود کو، خُدائی کو بھول جانے کی

یہ جام تھام لے اور خود کو لازوال بنا۔

راجیش گوہر، میرپور کے ایک متوسط گھرانے میں پیدا ہوئے۔ تعلیم وہیں حاصل کی۔ تقسیمِ ملک کے بعد جو فسادات برپا ہوئے، ان کی وجہ سے ان کا خاندان اپنا آبائی وطن چھوڑنے پر مجبور ہو گیا۔ یہ بھی اپنے خاندان کے ساتھ جموں آئے اور یہاں کے ادبی حلقوں میں پہنچ کر ان کا شعر و ادب کا خوابیدہ ذوق جاگ اُٹھا۔ پہلے پہل افسانے لکھتے رہے، جو ریاست کے اور ریاست سے باہر کے رسالوں میں شایع ہوتے رہے ہیں۔ لیکن جلد ہی شعر کی دلکشیوں نے انہیں اپنی طرف کھینچ لیا۔ راجیش گوہر سیالکوٹ کے کہنہ مشق اُستاد ساحرؔ لدھیانوی سے اصلاح لیتے رہے اور اب ان کی غزل معیاری غزل ہو گئی ہے۔ غزل کے تیکنکی اور اظہاری لوازم کو وہ ملحوظ رکھتے ہیں۔ ان کی مختلف غزلوں سے منتخب اشعار ذیل میں درج ہیں:

اہلِ اُلفت کو کوئی اور تو غم کیا ہوگا　　چھوڑ دیں وہ بھی اگر جور و ستم کیا ہوگا

دل کے گلشن میں کوئی پھول نہ کھلنے پایا　　تجھ سے کچھ اور کرم، ابرِ کرم کیا ہوگا
موت ہی زلیست کا انجام سہی اے گوہر　　زندہ رہ جائے اگر نام، تو غم کیا ہوگا

سرِ رہ گذار مجھے کہا، تجھے کیا کسی کی تلاش ہے
مگر ان سے میں یہ نہ کہہ سکا مجھے آپ ہی کی تلاش ہے
جو خوشی سے رنج و الم سہے، جو خزاں میں لطف بہار دے
رہے بے خودی سے جو منسلک، مجھے اس خودی کی تلاش ہے
ہوا کیا ہے گوہر بے خبر، بڑا زعم تھا تجھے عقل پر
لُٹا جس کے ہاتھ سے بارہا، تجھے پھر اسی کی تلاش ہے

تیری تقریر کی تو بات ہی کیا　　تیری تصویر مُنہ سے بولتی ہے

پھولوں سے کر رہے تھے وہ اندازۂ بہار
ہم تو فقط جنوں کا اثر دیکھتے رہے

جموں کے ایک اور شاعر، بال کرشن ساگر ہیں، جو مشہور مُصلح دادا پنت کے خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کی ولادت کا سنہ ۱۹۳۵ء ہے۔ جموں میں تعلیم حاصل کی اور مرکزی حکومت کے محکمۂ ڈاک و تار، جموں میں مُلازم ہو گئے۔ غزل اچھی کہتے ہیں اور عشرت کشتواڑی سے مشورہ کرتے ہیں۔ ان کی ایک غزل کے چند شعر ہیں:

ہم اپنے ہونٹ سی لیتے، ہم اپنے اشک پی لیتے
مگر تیری نظر میں تھے، جو افسانے کدھر جاتے
چلو، اچھا ہوا، یہ راہ میں تھا میکدہ ورنہ

بھٹک کر دیر و کعبہ سے خدا جانے کدھر جاتے
جفا کے پیچ و خم میں ہم اُلجھ کر رہ گئے ساگر
اگر وہ باوفا ہوتے، خدا جانے کدھر جاتے

ہمدم کاشمیری، عبدالقیوم خان، سری نگر کے ایک متوسط خاندان میں ۱۹۳۶ء میں پیدا ہوئے۔ ادیب اور میٹرک کے امتحان کامیاب کرنے کے بعد سرکاری آرٹس ایمپوریم، سری نگر میں ملازم ہو گئے۔ ملازمت ہی کے سلسلے میں انہیں بمبئی کے آرٹس ایمپوریم میں بھی کوئی آٹھ سال خدمت کرنے کا موقع ملا۔ اس دوران یہاں کے ادیبوں اور شاعروں سے ان کی شناسائی ہو گئی اور ان کے اندر خوابیدہ شاعر جاگ اُٹھا۔ یوں کوئی سولہ سترہ برس کی عمر سے وہ شعر کہتے تھے۔ اب اچھے شعرا میں ان کا شمار ہوتا ہے اور ان کا کلام، غزلیں اور نظمیں اخباروں اور رسالوں اور خاص طور پر "صبا" (حیدرآباد) "نگارش" (امرتسر) "تعمیر" اور "شیرازہ" (سری نگر) میں شائع ہوتی رہتی ہیں۔ غزل سے انہیں زیادہ لگاؤ ہے، یوں نظم بھی کہتے ہیں۔ غزل میں روایت کو زیادہ ملحوظ رکھتے ہیں اور اسی میں نئے اسالیب کو سمونے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کے کچھ شعر ہیں:

چاندنی راتیں ہوں یا برسات کے دن ہمنشیں
دل بہلتا ہی نہیں، لاکھوں جتن ہم نے کئے
میں نے اکثر موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر
زندگانی کو ہزاروں جاوداں لمحے دیئے

یہ فقط سوزِ تمنا کا صلہ ہے اے دوست
تیرگی میں بھی ہے روشن مرا کاشانۂ دل
لاکھ سمجھاتی رہی عقل، مگر اے ہمدم
آہ! اپنا نہ ہوا ہے، کبھی بیگانۂ دل

محمود حسن محمود، پونچھ کے متوطن، چراغ حسن حسرت کے بھانجے ہیں۔ ۱۹۳۷ء میں اُن کی ولادت ہوئی۔ پونچھ میں تعلیم پائی، والد متنوع اور ہمہ طبیعت سے، انہیں صرف شاعری کا ذوق بہرہ میں ملا۔ اچھے ادبی ماحول میں نشوونما پائی۔ نظم اور قطعے لکھتے ہیں، غزل سے انہیں لگاؤ نہیں رہا۔ ان کی ایک نظم "انکشافات" سے کچھ شعر یہاں درج کئے جا رہے ہیں۔ جن میں خود ان کے ماضی اور حال کے اشارے ملتے ہیں:

رتب سادگی سے کی کتابِ زندگی میں نے
بجھائی روح کی علم و ادب سے تشنگی میں نے
مجھے بخشی گئی تھی، مختصر سی زندگی، لیکن
ادب کے فیض سے پائی حیاتِ دائمی میں نے
کروں اس بات پر میں فخر جتنا حق بجانب ہے
کہ پائی ہے وراثت میں متاعِ شاعری میں نے
غزل کی چاشنی افکار میں نہ کر سکا پیدا
ہے پھر بھی ناز اس پر کی دلوں کی رہبری میں نے
سخن گوئی سے مطلب رہبری محمود ہے مجھ کو
فقط تفریح کا حاصل نہ سمجھی شاعری میں نے

محمود کے چھوٹے بھائی، مسعود حسن مسعود بھی شعر و سخن کا ذوق رکھتے ہیں۔ پونچھ میں ولادت ہوئی اور سنہ ولادت ۱۹۴۳ء ہے۔ ہائی سکول کی تعلیم کے بعد ملازمت میں داخل ہو گئے۔ ادب اور شاعری سے لگاؤ، ان کی خاندانی خصوصیت ہے۔ چنانچہ مسعود طالب علمی کے زمانے سے شعر کہہ رہے ہیں۔ غزل اور نظم دونوں پر طبع آزمائی کی ہے۔ ایک غزل کے شعر ہیں:

نہ ہو گمراہ، اے دل، گمرہی اچھی نہیں ہوتی
خدا سے دور کرتی خود سری اچھی نہیں ہوتی

خیال اچھا نہیں جو مشق تک محدود رہ جائے

جو معنی دا نہ ہو وہ شاعری اچھی نہیں ہوتی

وبالِ جان بن جاتی ہے بڑھ کر حدِ امکاں سے

زیادہ دوستوں سے دوستی اچھی نہیں ہوتی

جبیں سائی نہ کرنا واں مفاداتِ ذات کی خاطر

کہ یہ مطلب براری بندگی اچھی نہیں ہوتی

ہمارا تجربہ ہے عشق میں مسعود برسوں سے

نہیں ہوتی، بتوں سے دل لگی اچھی نہیں ہوتی

ان کی نظموں میں ہندوستان پر لکھی ہوئی نظم، ان کے جذباتِ حبِ وطن کی آئینہ دار ہے۔ اس کے کچھ شعر درج ذیل ہیں:

ایکتا، اغیار کی سازش سے مر سکتی نہیں

کوئی طاقت ہند کو مرعوب کر سکتی نہیں

اقتضا ہے وقت کا، ہندو مسلمان ایک ہوں

ایک ہوں ہم سب، ارادے بھی ہمارے نیک ہوں

شمیم سوپوری، سوپور کے متوطن ہیں اور جی۔ این سوپوری کے نام سے لکھتے ہیں۔ ان کی غزلیں، مقامی رسالوں میں شائع ہوتی رہتی ہیں۔ ایک غزل کے چند شعر ذیل میں درج ہیں:

چلی غم کی ہوا، ایسی کہ یارو — اُمیدوں کے چراغوں کو بجھایا

وہ جس کا نام تھا رشکِ بہاراں — چمن کو اُس نے ویرانہ بنایا

ملا کیا اُس کو میری بے بسی سے — مثالِ اشک آنکھوں سے گرایا

لو اب سورج بھی آیا ڈوبنے کو — سلیقہ ہم کو جینے کا نہ آیا

قاضی غلام محمد (ولادت ۱۹۲۶ء) کشمیر یونیورسٹی کے شعبہ ریاضیات کے ریڈر اپنی علمی ذہانت اور ریاضی سے گہری دلچسپی کے ساتھ ساتھ ستھرا ادبی مذاق بھی رکھتے ہیں۔ ان کا آبائی وطن اسلام آباد اننت ناگ ہے۔ والد قاضی محمد حسین کو علم و ادب سے بہرہ حاصل تھا۔ قاضی غلام محمد نے اپنے والد کے پاس ہی ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد اسلام آباد کے سرکاری کالج میں بی۔اے کی تعلیم کی تکمیل کی۔ ایم۔اے کی تعلیم کے لئے وہ علی گڑھ گئے۔ اور امتحان امتیاز کے ساتھ کامیاب کیا۔ کچھ عرصہ اتر پردیش سرکار کی جانب سے وظیفہ پر تحقیقی کام انجام دیتے رہے۔ ۱۹۵۸ء میں کشمیر لوٹے اور جموں وکشمیر یونیورسٹی میں شعبہ ریاضیات میں لیکچرار مقرر ہوئے۔ تین سال پہلے انہیں ریڈر کے عہدہ پر ترقی ملی۔ قاضی ریاست کے قابل اُساتذہ ریاضی میں شمار ہوتے ہیں۔

قاضی غلام محمد کا اُردو اور فارسی کا مطالعہ بہت وسیع ہے اور خاص طور پر غالب کی شاعری میں نئی معنویت کی تلاش ان کی ذہانت کی ایک نمایاں خصوصیت ہے۔ شعر و سخن کا انہیں بہت ستھرا ذوق نصیب ہے، لیکن ان کا رجحان مزاح اور طنز کی طرف زیادہ ہے۔ پیروڈی جو ایک مشکل فن ہے۔ اس میں قاضی کو ایک خصوصیت حاصل ہے۔ اس اعتبار سے ہند پاک شعرا میں انہوں نے ایک مقام پیدا کر لیا ہے۔ پیروڈی میں لفظوں یا اصل کے اظہاروں کو مسخ کر کے جو لطف پیدا کیا جاتا ہے، وہ سستا مذاق ہوتا ہے۔ قاضی کے یہاں آمد ہوتی ہے۔ سنجیدہ شعراء کے سنجیدہ تصورات کو مُضحک مرتبے پر لانے کا قاضی کا اپنا اسلوب ہے۔ اس خصوص ہمارے موجودہ عہد کے بعض اچھے پیروڈی کہنے والے شاعروں جیسے سید محمد جعفری، شفیق الرحمان، اسید ضمیر جعفری سے کسی حد تک متاثر ہیں۔ قاضی کی ذکاوت مُضحک مؤقف پیدا کرنے کے گرُوں کو بخوبی جانتی ہے۔ کبھی وہ سنجیدگی کے پہلو بہ پہلو سنجیدگی کو بے جوڑ اور بے محل انداز میں رکھ کر، کبھی سنجیدگی سے مضحکہ خیز موضوع پیدا کر کے اور کبھی سنجیدہ موضوعات کے چہرے سے بظاہر سنجیدگی کا نقاب ہٹا کر خندہ ریزی

کے مواقع پیدا کر دیتے ہیں۔ ان کا مقصد اکثر اپنے اطراف کے سماجی مسایل کو اُبھارنا ہوتا ہے۔ چند مثالیں ذیل میں درج کی جاتی ہیں:

غالب کی مشہور غزل کے بعض اشعار سے وہ اس طرح کام لیتے ہیں:

میرے ماتم میں نہیں اپنی رقم کے غم میں
شہر کا بنیہ سیہ پوش ہوا میرے بعد

محبت کو کوئی کیا تم نے کنگ آف وار سمجھ لیا ہے
نہ کھینچو آپ اپنے کو کشاکش درمیاں کیوں ہو

اختر شیرانی کی مشہور نظم "او دیس سے آنے والے بتا" کا حلیہ قاضی کے ہاتھوں اس طرح بگڑا ہے:

کیا اب بھی وہاں ہر گنجا سر — اسکالر سمجھا جاتا ہے
کیا اب بھی وہاں کا ہر ایم اے — غالب پر کچھ فرماتا ہے
اور جہل کی ظلمت میں کھو کر — اقبال سے بھی ٹکراتا ہے
او دیس سے آنے والے بتا

قاضی کی فکر کا سارا سرمایہ پیروڈی ہی نہیں ہے، بلکہ وہ حقیقی شعری قدروں کی حامل طبعزاد مزاحیہ شعر کہنے پر بھی یکساں قدرت رکھتے ہیں۔ وہ ہمارے عہد کے شاعر ہیں، اور اس عہد کے مسائل ہیں جس طرح اکبر الہ آبادی کے اپنے عہد کے مسائل تھے، جنہیں انہوں نے اپنے طنز کا نشانہ بنایا تھا۔ مثلاً قاضی کے یہ اشعار:

ڈر یہ نہیں کہ ہجو میں جلنا محال ہے
ڈر یہ ہے خاکسار کثیر العیال ہے

جاؤں میں غم نصیب کہاں اور کہاں نہیں
وہ کونسی جگہ ہے جہاں "تیری ماں" نہیں

قاضی کا ایک قطعہ ہے :

قبائے زریں ہے ملبوس شُکر — میسّر نعمتیں ہیں اُس کو کیا کیا
بدن اپنا ہے ننگا، پیٹ خالی — "ہم اس کے ہیں، ہمارا پوچھنا کیا"

قاضی کا کلام جو ۱۹۶۲ء تک جمع ہو گیا تھا، اسے انہوں نے "حرفِ شیریں" کے نام سے مرتب کر لیا تھا۔ اس مجموعہ کو ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ نے ڈاکٹر اپورب سوم ناتھ اُستاد انگریزی کے پیش لفظ اور اپنے تعارف کے ساتھ ادارہ 'ادبیاتِ اُردو' حیدر آباد کے سلسلہ مطبوعات میں شائع کیا ہے۔ اس مجموعے میں "مفلسوں کا قومی ترانہ" "انٹرویو بورڈ کے سوالات" اور "پیر و مرید" عمدہ پارے ہیں۔ "پیر و مرید" اقبال کی نظم کی پیروڈی ہے۔ مُرید ہندی کے اس سوال کے جواب میں کہ :

اے کہ تو قطرے میں ہے دریا شناس
علم والوں کا ہو آخر کیا لباس

قاضی پیر رومی کی زبان سے کہلاتے ہیں :

ننگے پاؤں، ننگے سر، ننگے بدن — نیست ملبوس دگر در فکرِ من

مُریدِ ہندی غایت علم و ہنر کے بارے میں سوال کرتا ہے :

اے تری ہر بات ہے لعل و گہر — کیا ہے آخر غایت علم و ہنر

قاضی پیر رومی سے کہلاتے ہیں :

با تو گویم غایت علم و ہنر — ضعفِ اعضا، ضعفِ دل، ضعفِ بصر

اور ہمارے عہد کے مخصوص مسائل :

مُریدِ ہندی : بات کیا ہے صاحبِ فکرِ جمیل — لیڈروں کی عمر ہوتی ہے طویل

پیرِ رومی : قاطعِ عمر است تیغِ رنج و غم لیڈر اس کی زد سے ہری ہیں یک قلم

مریدِ ہندی: عقدۂ مشکل کشا ہے تیری عقل امتحان میں کیسے کی جاتی ہے نقل

پیرِ رومی : امتحان میں پاس ہوتا ہے اگر ڈسک پر پستول رکھ کر نقل کر

انٹرویو بورڈ کے سوالات بلند و پست اور لپت اور لپت کو جوڑ کر ان کی بے معنگی کو اُبھارنے کی اچھی مثال ہے۔ لکھتے ہیں:

ماہیتِ فلسفہ کو سمجھاؤ سائیکل ٹیوب کا محیط بتاؤ

اُلّو راتوں کو کیوں نہیں سوتے سینگ گدھوں کے کیوں نہیں ہوتے

یہ اہنسا کا مسئلہ کیا ہے قطب مینار کتنا اونچا ہے

ایک سنجیدہ غزل کے چند شعر یہاں منقول ہیں، جن سے غزل کی روایت پر ان کے قابو کا اندازہ ہوتا ہے:

یوں دل میں اہتمامِ اُمیدِ وصال ہے
اس حادثے کا جیسے کوئی احتمال ہے

خوابوں کے سرو یوں تو بہت دلفریب ہیں
وہ پیکرِ جمال مگر بے مثال ہے

قاسمی شبِ حیات کہیں بیکراں نہ ہو
بزمِ وفا میں ذکرِ سحر خال خال ہے

ڈاکٹر الوِرب سوم ناتھ جو پہلے جموں و کشمیر میں انگریزی کے اُستاد تھے اور اب جموں یونیورسٹی میں شعبۂ انگریزی کے صدر ہیں، ادب اور شاعری کا بڑا ستھرا ذوق رکھتے ہیں۔ اپنے پیش لفظ میں پیروڈی اور مزاح نگاری کے نازک فرق پر روشنی ڈالنے کے بعد، قاسمی کی پیروڈی کی تیکنک کے بارے میں رقمطراز ہیں کہ وہ قدیم شعراء کے رومانی تصورات اور موجودہ حقائق کے درمیان تضاد کو واضح کر کے جو تضاد پیدا کرتے ہیں تناقض کا ایک لطیف طریقہ فن کے استعمال

کا ہے جس سے وہ طنز کے حربے کے طور پر استعمال کرتے ہیں ۔"

ڈاکٹر زور جس زمانے میں کشمیر یونیورسٹی میں تھے، قاضی غلام محمد کی مزاحیہ اور طنزیہ صلاحیتوں سے بہت متاثر ہوئے تھے۔ انہوں نے اس زمانے کے اس ہونہار سخن سنج کی بجا طور پر ہمت افزائی کی اور قاضی اور ایک دو اور لکھنے والوں کے ذہن سے اس احساس پستی کو دور کرنے کی کوشش کی جو باہر کے بعض ناداں تنقید کاروں کی استحصال پسندی کی تنقیص اُبھر آتا ہے۔ وہ "حرفِ شیریں" کا تعارف کراتے ہوئے لکھتے ہیں:-

"قاضی صاحب کے کلام میں زندگی اور زندہ دلی کے جن عناصر کی فراوانی ہے۔ ان سے کسی قوم کے مزاج اور ماحول کو سمجھنے میں بڑی مِل سکتی ہے۔ نیا کشمیر جن ولولوں اور اُمنگوں کی آماجگاہ ہے، ان سے اس کلام کے بعد نہ صرف آگاہی ہوتی ہے۔ بلکہ اندازہ ہوتا ہے کہ ایسی جاندار اور پُر تکلّف شاعری کس قسم کے ماحول میں نمودار ہوتی ہے۔"

قاضی کو زبان اور اظہار پر بھی بڑی اچھی قدرت ہے اور ان کے بعض تجاوزات، جن میں سے کچھ بلا قصد ہیں اور کچھ قصداً یا ضرورتاً کئے گئے ہیں۔ ان سے کہیں کہیں زبان میں مقامیت کا رنگ اُبھرتا ہے، جسے ایک حقیقت پسند نقاد، شاعر کی فطرت سے تعبیر کرتا ہے۔

یونیورسٹی میں غالب کی سو سالہ برسی کی تقریبات کے سلسلے میں ایک محفل شعر بھی منعقد ہوئی تھی، جس کے لئے قاضی نے کچھ رباعیاں کہیں۔ جو ذیل میں درج کی جاتی ہیں:-

اشعار ترے نگار معنی کا جمال
افکار ترے جلالِ فردوسِ خیال
دیوان ترا وہ آئینہ ہے جس میں
انسان نے شہرِ دل کی دیکھی تمثال

تعبیر طلب ازل سے ہے خوابِ حیات
ملتا ہی نہیں گوہرِ نایابِ حیات
انساں نے اپنی [illegible] تو یہ ہے
سیکھے ہیں ابھی [illegible] آدابِ حیات

خاتم ہے اگر سخن، نگیں ہے غالب | ہر عہد میں عہد آفریں ہے غالب
معنی نگروں کی چشم باطن میں ہیں | آشوب خیال بالیقیں ہے غالب

عابد مناوری، جموں کی نکرِ جواں کے نمائندہ شاعروں میں اپنی شاعری اور خاص طور پر غزل کی بدولت ممتاز مقام رکھتے ہیں۔ ان کا اصلی نام گوری نندن سنگھ بالی ہے، لیکن ادبی دنیا میں ان کے اس نام سے کوئی شناسا نہیں ہے۔ ان کا آبائی وطن مناور ہے اور عابد تخلص کرتے ہیں۔ ان کی ولادت ۱۹۳۸ء میں جموں میں ہوئی۔ اور تعلیم بھی جموں ہی میں پائی۔ میٹرک کامیاب کرنے کے بعد، کالج میں داخل ہوئے تھے اور مضامین سائینس لئے تھے۔ لیکن انٹرمیڈیٹ کی تکمیل نہ کرنے پائے تھے کہ ۱۹۵۸ء میں محکمۂ دیہات سدھار میں انہیں ملازمت مل گئی۔ اس وقت جموں کے محکمۂ حسابات میں کارگذار ہیں۔

عابد کو اور ہونہار شاعروں کی طرح بچپن سے شاعری کا شوق تھا۔ جموں کے شعراء کی تربیت میں جوش ملسیانی کا جو حصہ رہا ہے، اس کا تذکرہ گذر چکا ہے۔ جوش اپنے تلامذہ کی خاطر اکثر جموں آتے رہتے تھے۔ عابد نے بھی ان کے آگے زانوے شاگردی طے کیا اور جوش کو غزل کے فن اور اسالیب پر جو استادانہ قدرت حاصل ہے، اس سے بھرپور استفادہ کیا۔ چنانچہ وہ غزل بڑی منجھی ہوئی کہتے ہیں۔ چھوٹی بحروں کو خوبی کے ساتھ برتتے ہیں، جموں کے موجودہ شعراء میں عابد نے ایک تخصیص پیدا کرلی ہے۔ اور بعض بحروں کو بھی مخصوص کرلیا ہے۔ اپنے استاد کے فیض کو ایک شعر میں اس طرح خراج عقیدت پیش کرتے ہیں۔

دھوم ہے جو کلام عابد کی | جوش صاحب کا فیضِ پیہم ہے

غزل کی روایت کے وفاداری کے ساتھ پابند ہوتے ہوئے بھی، اپنے عہد کے اور نظر بصیرت رکھنے والے شاعروں کی طرح وہ نئی فکر اور نئے فن اور اسالیب کے اثر سے بیگانہ نہیں رہ سکتے تھے، چنانچہ ان کی غزل ان دونوں رجحانات کا دلکش سنگم بن گئی ہے۔ ان کے تغزل میں بھی حسن وعشق کی واردات کے رنگ میں انداز میں زندگی کے مسائل کا عرفان

جھلکتا ہے۔ مثلاً کچھ شعر ہیں:

آج دل کا عجیب عالم ہے　　روح مضطر ہے، آنکھ پرنم ہے
پھر کسی آرزو کے مٹنے پر　　خانۂ دل میں شورِ ماتم ہے
غمِ ہستی دیا نوازش کی　　یہ نوازش مگر بہت کم ہے
ہم کو اپنا خیال ہو کہ نہ ہو　　لیکن ان کا خیال پیہم ہے
جلوہ فرما ہے بام پر کوئی　　چاند تاروں میں روشنی کم ہے
حق ہے گو اک سوال پیچیدہ　　عشق بھی ایک خیال مبہم ہے

لاکھ دھوکے دیئے ہیں رہبرِ منزل نے مگر
گمرہی میری مجھے راہ پر لے آئی ہے

شعبدہ یہ مری نظر کا ہے　　ورنہ دنیائے رنگ و بو کیا ہے

زندگی بیٹھ گئی ہے تھک کر　　جب تری راہ گذر تک پہنچی

اخلاقی قدروں پر زور، اعلیٰ مقاصد کے حصول کے لئے ہمتوں کو مہمیز کرنا اور کائناتی حقائق کے اشارے، واضح یا رمزیہ پیرایہ میں، غزل کی فطرت کے لئے اجنبی موضوع نہیں ہیں۔ لیکن عابد کی غزل میں ان پر کچھ زیادہ زور ہی ملتا ہے۔

تولتے ہی رہے ہم اپنے پر　　جن میں ہمت تھی کر گئے پرواز

اگر عزم و عمل مضبوط کر لیں　　بدل دیں گردشِ شام و سحر ہم

گردشِ دور سے نہ گھبرا　　گردشِ دور عارضی ہے

غم و آلام میں بھی مسکرانا　　کوئی سیکھے ہماری خوش دلی سے

جرأتِ شوق نے ہر موج کا منہ پھیر دیا
جب کشتی مری طوفان سے ٹکرائی ہے

جنہیں شعر کا ذوق نہیں وہ بھی کبھی کبھی شاعری پر تنقید کرنے کے موقف تک پہنچ جاتے ہیں۔ عابد ایسے نقادوں کے بارے میں کہتے ہیں :

وہ کیا تنقید کرتے شاعری کی　　نہیں کچھ ربط جن کو شاعری سے

حالات اور ماحول کا ان کا شعور، ان کا اپنا ردِ عمل پیدا کرتا ہے۔ انسان چاند پر پہنچ گیا۔ یہ علم اور عقلِ انسانی کا عظیم کارنامہ ہے، لیکن شاعر کے پاس یہی علت نمائی نہیں۔ عابد کی نظر میں سکونِ قلب مقصدِ اصلی ہے اور باقی سب وسایل۔ ان کا شعر ہے :

دلِ انسان کو سکوں نہ مل سکا　　جستجو شمس و قمر تک پہنچی

زباں اور اظہار پر عابد کی قدرت، اکثر ان سے سہل ممتنع شعر کہلاتی ہے۔ چند مثالیں ہیں :

یوں تو ہونے کو کیا نہیں ہوتا　　دل کا عقدہ ہی وا نہیں ہوتا

آپ تو ہو گئے جدا ہم سے　　آپ کا غم جدا نہیں ہوتا

جو کسی کی برائی کرتا ہے　　کبھی اس کا بھلا نہیں ہوتا

اُدھر چند برسوں سے، کچھ نقادوں کو غزل کی صنف کی کوتاہیوں کا قلق رہا۔ لیکن یہ قلق عابد کو اور شعراء کی ایک خاص تعداد کو غزل کے خود مکتفی صنفِ شعر ہونے اور عہد کے ساتھ اس کے ارتقاء پذیر صنف ہونے کے ایقان پر کوئی دھکا نہیں لگا سکا۔ عابد کے دو شعر ہیں :

ہونے دو آج امتحانِ غزل　　کیوں پریشان ہے جہانِ غزل

گو کئی مشکلات راہ میں ہیں　　بڑھتا جاتا ہے کاروانِ غزل

عابد نے چند قطعات بھی لکھے ہیں اور کچھ نظمیں بھی کہی ہیں۔ ان کی ایک اچھی نظم "رنگ و مستی" کے عنوان سے کہی گئی ہے۔ یہ مختصر نظم دو بند پر مشتمل ہے:

اک دیوانہ سا بنجارہ　　گھوم رہا ہے بستی بستی

عشق و وفا کی جنس لئے وہ　　بیچ رہا ہے مہنگی سستی

پیارے پیارے گاہک اس کے

چاروں جانب رنگ و مستی

جیسے بادِ صبا رہ رہ کر　　گلشن گلشن گھوم رہی ہو

چھیڑ رہی ہو کلیوں کے دل　　پھولوں کے لب چوم رہی ہو

جھول رہی ہو پتّی پتّی

ڈالی ڈالی جھوم رہی ہو

عابد کی اکثر نظموں پر غزل کا انداز اور رومانی فضا چھائی ہوئی ہے۔ یہی حال ان کے قطعات کا بھی ہے۔ رباعیات بھی انہوں نے کہی ہیں:

عابد بھی اکثر نوجوان سخن سنجوں کی طرح، ترقی پسند تحریک سے بھی متاثر رہے۔ کچھ نظموں میں ان کے یہاں امیر و غریب، کسان و مزدور اور سرمایہ دار کی زندگی کے تضاد کو نمایاں کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کی ایک کسی قدر طویل نظم "سسکیاں" عنوان سے لکھی گئی ہے۔ جو "شبنم گل" میں شامل ہے۔ اس نظم کا لب و لہجہ شہر آشوب کا سا ہے، اور اس میں اپنے عہد کے مختلف طبقوں کی حالت پر افسوس کیا ہے۔ یہ نظم مربع کی شکل میں لکھی گئی ہے۔ ایک بند میں کسانوں اور امیروں کی حالت کا فرق بتایا ہے:

کسانوں کی ٹوٹی ہوئی کھولیوں پر

یہ ہنستے ہوئے اونچے ایواں تو دیکھو

ہیں کلبوں میں چلتے کہیں دورِ ساغر

کہیں بھوک سے مرتے انسان تو دیکھو

عابدؔ نے ایک اہم خدمت یہ انجام دی ہے کہ کشمیر کے بارے میں جن مشاہیر شعراء نے نظمیں لکھی ہیں، ان کی نظموں کو اکٹھا کر کے " اے جنتِ کشمیر " کے نام سے ۱۹۶۶ء میں شایع کیا ہے۔ اس میں کل ۲۵ نظمیں ہیں، جن میں چکبست کی مشہور نظم " پانی میں ہے چشموں کے اثر آبِ بقاء کا "۔ پنڈت کیفی کی نظم " بہارِ کشمیر " جوش ملیح آبادی کی " فضائے کشمیر " اور چودھری خوشی محمد ناظر کی نظم " پانی میں " بھی شامل ہے۔ عابدؔ نے بھی کشمیر پر ایک نظم " میرا وطن " کے عنوان سے کہی ہے، جو اس مجموعے کے آخر میں شامل ہے۔

حکیم منظور کے نام سے محمد منظور، شہرت رکھتے ہیں اور اس عہد کے اچھے غزل گو شاعروں میں ان کا شمار ہوتا ہے اور اس صنف سے انہیں طبعی لگاؤ بھی ہے۔ ایک اور بات یہ ہے کہ غزل کے فن اور اس کے اصطلاحی لوازم کو انہوں نے محنت سے حاصل کیا ہے اس لئے ان کی غزل میں فنی جھول نہیں پائے جاتے۔ حکیم منظور ۱۹۳۸ء میں پیدا ہوئے۔ تعلیم کے زمانے سے ہی انہیں شعر سے لگاؤ پیدا ہو چکا تھا۔ کالج سے نکلنے کے بعد انہیں اپنی دلچسپیوں کو فروغ دینے کے زیادہ مواقع نصیب ہوئے۔ سری نگر اور جموں دونوں مقامات کی ادبی اور شعری سرگرمیوں میں ان کا حصّہ ہے۔ وہ کسٹوڈین جنرل کے دفتر میں ملازم ہیں، اور ملازمت کے تعلق سے انہیں چھ مہینے کشمیر میں اور چھ مہینے جموں میں گذارنے کا موقع ملتا ہے۔ جموں کی بزم فروغ اُردو کے اور ایک آدھ اور انجمن کے وہ صدر بھی ہیں۔ حکیم منظور کی ایک طویل غزل کے شعر ہیں، جن میں رمزیت بھی ہے اور قافیوں کی نرنگی بھی

خُدا کے نام پہ جو چھوڑتے ہیں اپنی ناؤ — یہ دیکھتے نہیں دریا کا کس طرف ہے بہاؤ

ہر ایک راہ تیرے کوچہ میں ہوئی ہے گم
خدا ہی جانے کہ ہے کیا راستوں کا گھماؤ

یہ راہِ غم کی بڑی سرد بھی، طویل بھی ہے
جلاؤ دوستو، خونِ جگر کا آج الاؤ

جنوں بھی مصلحت آمیز فی زمانہ ہے
سِلاؤ چاکِ گریباں کہ یہ ہے میرا سجھاؤ

ازل سے جشنِ بہاراں مناتے آئے ہو
کبھی اے اہلِ خرد، تم خزاں کا جشن مناؤ

وفا و مہر و محبت، خلوصِ دل منظور
یہ کھو گئے ہیں کہاں آجکل، کوئی تو بتاؤ

ان کی غزلوں میں، جیسا کہ اوپر کے اشعار سے واضح ہے۔ موضوعات اور اسلوب دونوں میں روایت پسندی بہت کم ہے، یہ نئے عہد کی غزل ہے جس کا رجحان حقایق اور اخلاقی آدرشوں پر ہے۔ کچھ استعارے وہ اپنے انداز سے برتتے ہیں۔ ذیل میں دو شعر اور نقل کئے جاتے ہیں:[1]

اب زمانے میں وفا کی کوئی بو باس نہیں
ہم کہاں جاتے ہیں اس کا کوئی احساس نہیں
اور کچھ ہوگا وہ، انسان نہیں ہو سکتا
جس کو انسان کی قدروں کا کوئی پاس نہیں

رہبرِ جدید، جگ دیپ بہادر سوری، جموں کے ایک معتبر خاندان سے ہیں۔ ان کے

---

[1] حکیم منظور کے کلام کے دو مجموعے ناتمام اور لہو لمس چنار شائع ہو چکے ہیں۔ جن پر انہیں مختلف اداروں نے انعامات دیئے ہیں۔

والد لالہ بنسی لال سوری، جموں کے سربرآوردہ وکیل ہیں اور سیاست میں بھی حصّہ لیتے رہے ہیں۔ رہبر کی ولادت جموّں ہی میں ۱۹۳۶ء میں ہوئی اور وہیں تعلیم بھی پاتے رہے۔ بی۔ کام کی تعلیم حاصل کر رہے تھے کہ محکمۂ پولیس میں ان کا انتخاب ہو گیا اور اسسٹنٹ سب انسپکٹر کے عہدہ پر مامور ہوئے۔ شعر گوئی کا شوق زمانہ طالب علمی سے رہا اور ہر بھگوان شاد سے مشورہ کرتے رہے۔ جموّں کی ادبی سرگرمیوں میں ان کا بڑا ہاتھ ہے۔ اُردو کی خدمت میں وہ ہمیشہ پیش پیش رہے، چنانچہ اس وقت مکتبہ اُردو ادب، جموں کے وہ ناظم اعلیٰ ہیں۔

رہبر جدید کو عملی سیاست سے بھی لگاؤ رہا۔ وہ نیشنل کانفرنس کے رُکن رہے اور صوبائی شاخ کی صدارت ان کے سُپرد تھی۔ یوتھ کانفرنس کے تحت نوجوانوں کو منظم کرنے میں سرگرم حصّہ لیا تھا۔ شاعری میں غزل سے انہیں زیادہ لگاؤ ہے چنانچہ نظم میں بھی غزل کی رومانیت در آتی ہے۔ رہبر کا شعر کہنے کا انداز منجھا ہوا ہے۔ ان کی ایک نظم "وہ راتیں" کا اقتباس ذیل میں درج ہے:

وہ راتیں، آہ وہ رنگین راتیں یاد آتی ہیں!

مرے قلب و جگر کو آتشِ غم سے جلاتی ہیں

وہ راتیں، آہ، جب میری دُعاؤں میں اثر آیا

وہ راتیں جب مرے نخلِ تمنا میں ثمر آیا

وہ راتیں جب مری دنیا میں تو چھُپ چھُپ کے آتی تھی

وہ راتیں جب مری طبعِ حزیں تسکیں پاتی تھی

وہ راتیں یاد آتی ہیں تو ہو جاتا ہوں دیوانہ

سکون و صبر سے ناآشنا راحت سے بیگانہ

عرش صہبائی کے مرتبہ تذکرہ "انجم کدہ" کی طرف اشارہ گذر چکا ہے۔ اس کا "حرفِ آغاز" رہبر نے لکھا ہے جس میں وہ نو مشق شعراء کو پیش کرنے کے جواز کے بارے

میں یہ لکھتے ہیں کہ یہ شاعری کی اجارہ داری کو ختم کرنے کی ایک کوشش ہے۔ ان کے الفاظ ہیں:

"ہمارا مقصد اچھے فنکاروں کی تخلیقات کو عوام سے روشناس کرانا ہے، چاہے وہ نومشق فنکار ہوں یا کہنہ مشق۔"

جموں ہی کے ایک اور نوعمر شاعر، راج کمار ابرول ہیں، جو ۱۹۳۹ء میں پیدا ہوئے، اور سرکاری گاندھی میموریل کالج میں بی۔ اے تک تعلیم حاصل کی، اس کے بعد کاروبار میں لگ گئے۔ تاہم شعر اور ادب کا ذوق جو بچپن سے تھا، اسے بھی ساتھ ساتھ نباہ رہے ہیں۔ غزل کلاسیکی انداز کی کہتے ہیں، اور زیادہ تر غزل ہی سے طبیعت کو لگاؤ ہے۔ ان کی دو غزلوں سے اقتباس ذیل میں درج ہیں:

ترے حضور کوئی التجا کریں نہ کریں
یہ کشمکش ہے لبِ شوق وا کریں نہ کریں

کبھی یقیں کہ خدا وہم ہو نہیں سکتا
کبھی یہ وہم یقینِ خدا کریں نہ کریں

باعثِ آزادیٔ دل ہی سہی — شکر ہے وہ کچھ تو فرمانے لگے
راج کس کافر کا آیا ہے خیال — پے بہ پے ہم آج لہرانے لگے

حیش شرما، شعر کا پاکیزہ مذاق رکھتے ہیں۔ ان کے اجداد کا وطن میرپور ہے جہاں وہ ۱۹۳۹ء میں پیدا ہوئے۔ تقسیم ملک کے بعد وہ اپنے بزرگوں کے ہمراہ جموں آ گئے۔ تعلیم جموں اور دہلی میں پائی اور بی اے اور بی ایڈ کے امتحانات پاس کر کے محکمۂ تعلیم میں ملازم ہو گئے۔ اس وقت جموں کے ٹریننگ کالج میں تعلیم دے رہے ہیں۔ طالب علمی کے زمانے سے انہیں شعر گوئی کا شوق تھا، اور یہ شوق انہیں اپنے والد پنڈت پرمانند

سے ورثے میں ملا تھا۔ پرمانند بھی شعر کا اچھا ذوق رکھتے تھے۔ مہیش شرما طالب علمی کے زمانے میں مزاحیہ شعر کہتے تھے۔ لیکن بعد میں گیت کی طرف ان کی طبیعت مائل ہوگئی اور اچھے گیت لکھتے ہیں۔ جموں کی ادبی محفلوں میں ان کا کلام بہت مقبول ہے۔ ان کے ایک گیت کے شعر ہیں :

اپنے گیت سے فضاؤں کو نغمہ زن بناؤ نا
میرے ساتھ مل کے زندگی کا گیت گاؤ نا

کون ہے جو زندگی کے بوجھ سے دبا نہیں
کون سا ہے دل جو غم کی آگ میں جلا نہیں
کون ہے جو اشک پی کے مسکرا رہا نہیں

اشک مسکرا اٹھے کچھ ایسے مسکراؤ نا
میرے ساتھ مل کے زندگی کا گیت گاؤ نا

کل گذر گیا ہے، کل کبھی نہ لوٹ آئے گا
اور آنے والے کل کا فکر دل جلائے گا
کل کی سوچ میں یہ آج بیت جائے گا

آج کو سنوار دو اسے حسین بناؤ نا
میرے ساتھ مل کے زندگی کا گیت گاؤ نا

ودیا رتن عاصی، ۱۹۳۹ء میں جموں میں پیدا ہوئے۔ میٹرک کامیاب کرنے کے بعد زندگی کے مشاغل میں مصروف ہوگئے۔ ۱۹۵۶ء میں شاعری کے میدان میں ہیں اور ان کا کلام جموں، کشمیر، پاکستان اور ہندوستان کے رسالوں میں چھپتا رہتا ہے۔ غزل کہتے ہیں اور غزل میں اپنے عہد کے فکر و فن کو سمونے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کی مختلف غزلوں سے اقتباسات ذیل میں درج ہیں :

مسرت چیز کیا ہے، رنج کیا ہے — یہ سارا کھیل اک احساس کا ہے
ابھی بدلی نہیں انسان کی فطرت — یہ اب بھی دشمنِ مہر و وفا ہے
ہمیں مطلق نہیں احساس عاصیؔ — اگرچہ زندگی بے آسرا ہے

دل میں نہ آرزو ہے کوئی اور نہ ولولہ
اک شمع جل رہی ہے مگر روشنی نہیں

عاصیؔ زبانِ خامشی میں داستانِ شوق
ہم نے کہی ہے بارہا تم نے سُنی نہیں

ارمان کشتواڑی، عموماً غزل کہتے ہیں۔ ان کی ایک غزل کے چند شعر ہیں:

آ بھی، آنا ہے گر تجھے ظالم — ورنہ ہم جی پہ کھیل جاتے ہیں
ان کو تدبیر پر بھروسہ ہے — ہم تو تقدیر آزماتے ہیں
دُور دشت و جبل کی چھاؤں میں — کس کے ارمان گیت گاتے ہیں

پونچھ، جو ہر زمانے میں شعر و سخن اور ادبی سرگرمیوں کا مرکز رہا۔ اس کے اطراف و اکناف بھی دور دور تک اس ذوق سے فیض یاب رہے۔ پونچھ کی سرحد کے ایک گاؤں پوشانہ، شہباز راجوری کا وطن ہے۔ سردیوں میں یہ خاندان راجوری آجایا کرتا تھا۔ اسی لئے شہباز اپنے آپ کو راجوری سے منسوب کرتے ہیں۔ ان کی ولادت ۱۹۴۰ء میں ہوئی۔ ان کے والد قدیم وضع کے پڑھے لکھے آدمی ہیں اور تجارت ان کا پیشہ — ۱۹۴۷ء کے بعد ان کا کاروبار جاتا رہا۔ پھر بھی انہوں نے شہباز کو تعلیم دلانے کی پوری کوشش کی۔ ۱۹۵۸ء میں شہباز نے میٹرک کامیاب کیا۔ اور گھر کے نامساعد حالات کی وجہ سے مدرسہ کی ملازمت اختیار کرلی۔ لیکن تعلیم پانے کا خیال برابر رہا۔ ۱۹۶۸ء میں کشمیر یونیورسٹی سے ایم اے کا امتحان کامیاب کیا۔

شاعری سے انہیں بچپن سے لگاؤ رہا۔ غزل اور نظم لکھ کر اخباروں اور رسالوں میں شایع کرتے رہے۔ کچھ آزاد نظمیں بھی کہی ہیں اور قطعات بھی لکھے ہیں:

بے کیف ہے یہ محفل کیا کوئی غزلخواں ہو
انسان کے ہاتھوں ہے انسان کی رُسوائی
اس دور کے انسان کا شہباز خُدا حافظ
اپنی ہی تباہی کا باعث ہے یہ سودائی

جب حریم دِل ترا تنویر سے محروم ہے
پھر حرم میں شمع کافوری فروزاں ہے، تو کیا؟

"جنتِ کشمیر" کے عنوان سے شہباز نے ایک نظم لکھی ہے۔ جس میں اس جنتِ ارضی کو خراجِ تحسین پیش کیا ہے۔ ان کی ایک آزاد نظم کا بند ہے:

لالہ زاروں میں آگ
پھول کمہلا گئے
شاخ جُھلسی گئی
قافلہ لُٹ گیا
رنگ و بو کا یہاں
نغمے خاموش ہیں
آبرو بھی لُٹی
کِس کا ماتم کرے
نوحہ خواں چمن

شہباز کے ایک ہم وطن نثار راہی بھی شعر کہتے ہیں۔ ان کی کچھ نظمیں اخباروں میں چھپی ہیں۔

سرخوش کاشمیری، غزل اچھی کہتے ہیں۔ ایک غزل کے شعر ہیں:

آگ تیرے روئے روشن سے چمن میں لگ گئی
دیکھ تو سروِ چمن، سروِ چراغاں ہو گیا
سرد مہری سے تمہاری دل بجھا ہے اس قدر
داغِ دل اپنا چراغِ زیرِ داماں ہو گیا
حضرت سرخوش نہ لائیں لب پہ شکوہ ظلم کا
چار آنکھیں جب ہوئیں وہ خود پشیماں ہو گیا

مرزا محمد یٰسین بیگ، پچھلے چند سالوں میں منظر عام پر آئے ہیں۔ ان کا وطن جموں ہے، جہاں ان کی ولادت ۱۹۴۰ء میں ہوئی۔ جموں میں تعلیم پائی اور بی۔ اے کامیاب کر کے، کشمیر میں کلچرل اکادمی کی ملازمت میں داخل ہوئے۔ اکادمی کے کتب خانے کا انتظام ان کے سپرد تھا۔ اسی لئے کتب خانہ کے انتظام کی تربیت بھی حاصل کی۔ شاعری کا شوق بچپن سے ہے۔ اور افسانے بھی لکھتے ہیں لیکن شعر و سخن میں انہوں نے ایک نمایاں مقام حاصل کر لیا ہے۔ اپنی نظموں کا ایک مجموعہ "شاخِ صنوبر کے تلے" کے عنوان سے مرتب کیا ہے، جس میں ۲۳ نظمیں مختلف عنوانات پر لکھی ہوئی شامل ہیں۔ ان میں آزاد نظمیں بھی شامل ہیں۔ ان کی کئی نظموں کا موضوع کشمیر سے متعلق ہے۔ "شگوفے" "زرد پتے" "شاخ صنوبر کے تلے" اسی نوع کی نظمیں ہیں۔ بعض نظموں میں اپنے عہد کے شعری موضوعات کو بھی برتنے کی کوشش کی ہے نئے رجحانات کا ردِ عمل، بعض نظموں میں بڑی خوبی سے ظاہر ہوا ہے۔ ان کی ایک نظم "انقلاب" کے عنوان سے لکھی ہوئی، ان کی نظموں میں سے ہے۔ یہ مختصر سی سڈول نظم ہے جس میں دبا دبا طنز ہے۔ نظم یہاں درج کی جاتی ہے:

یہ کل کی بات ہے ـــ جب دوستوں کی محفل میں
وہ انقلاب و تغیر کی بات کرتا تھا

سُکڑتی، کانپتی سڑکوں کے تنگ دامن میں

ٹھٹھر ٹھٹھر کے بسر ساری رات کرتا تھا

پر آج جب اسے دولت کی سُرخروئی ملی

وہ انقلاب و تغیر کی بات بھول گیا

نوجوان شاعروں میں یوسف رلشی، بچپن سے شعروشاعری کے دلدادہ رہے ہیں۔ حالانکہ ان کی تربیت انجنیری میں ہوئی ہے۔ سری نگر کے تاریخی محلہ درگجن میں اُن کی ولادت ۱۹۴۳ء میں ہوئی۔ انٹرمیڈیٹ تک سری نگر ہی میں تعلیم پائی۔ اس کے بعد ان کی امتیازی کامیابی کی وجہ سے حکومت نے انہیں وظیفہ عطا کر کے عثمانیہ یونیورسٹی حیدر آباد کے کُلیہ انجنیری میں تعلیم کے لئے بھیجا۔ جہاں وہ چار ساڑھے چار سال تک تعلیم پاتے رہے، اور بی۔ اے کامیاب کر کے کشمیر لوٹے تو انہیں مددگار انجنیئر کی خدمت پر مامور کیا گیا۔ شاعری کے علاوہ یوسف رلشی کو افسانہ نگاری کا بھی ذوق ہے اور رسالوں میں ان کے افسانے شائع ہوتے رہے ہیں۔ ان کی ایک غزل کے شعر ہیں:

شام رنگین ہے، کیف آگیں ہے، رقص میں ہے ہوا، جھومتی ہے فضا

چھیڑ دو بربط دِل کے تاروں کو تم، نغمۂ دِل سُنانے کی رات آگئی

ہر نظر جو اُٹھی، ہر پلک جو جھکی، موج بن کر ڈھلی نشۂ جام میں

اب اُٹھاؤ نہ ساغر کو، پینا کو تم، بے پئے لڑکھڑانے کی رات آگئی

ایک اور نوعمر شاعر بشیر شاہ، کشمیر کے مشہور افسانہ نگار، نور شاہ کے چھوٹے بھائی ہیں۔ انہوں نے حال ہی میں جموں و کشمیر یونیورسٹی سے ایم۔ اے کا امتحان اُردو میں کامیاب کیا ہے اور اب ریڈیو کشمیر، سری نگر کے فنی عملہ میں کارگذار ہیں۔ بشیر شاہ افسانے اور ڈرامے بھی لکھتے ہیں۔ ان کی ایک نظم "پیشین گوئی" "ہمارا ادب" (شمارہ ۱۹۶۵ء) میں شائع ہوئی تھی۔ یہ مختصر رومانی نظم ہے، جس میں شاعر اپنی پیمان شکن محبوبہ سے مخاطب ہو کر کہتا ہے:

تجھ سے وابستہ تھی، میری زندگی کی ہر خوشی

تو کہ تھی، میری محبت، میرے مستقبل کا خواب

کیا ہوئے وہ عہد و پیماں، وہ تری وارفتگی

کیا وہ سب کچھ تھا فقط میری نگاہوں کا سراب

سجود سیلانی، غلام محمد، بھی ہونہار شاعروں میں سے ہیں۔ ان کی دلچسپی زیادہ تر مرثیہ اور منقبت میں ہے۔ مصوری ان کا فن ہے اور شاعری سے بھی لگاؤ ہے۔ اردو اور کشمیری دونوں زبانوں میں کہتے ہیں۔ ان کے مراثی "سفینہ" سری نگر اور "الارشاد" میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ ایک منقبت کے کچھ شعر ہیں:

ہر دل کو عقیدت کا گہوارہ بنایا ہے

حیدر کے پسر نے یہ اعجاز دکھایا ہے

انوار امامت کی تابندہ شعاعوں نے

اس صفحۂ گیتی سے ظلمت کو ہٹایا ہے

اعداء کی قطاروں کی تنظیم ہوئی برہم

کس شیر کی آمد نے یہ ان کو ہلایا ہے

حضرت علیؓ کی منقبت میں، ان کی ایک نظم اور حضرت حسینؑ کی منقبت میں کہا ہوا مسدس "پرستارِ حق" اچھی تخلیقات ہیں۔ سجود نے کچھ نوحے بھی لکھے ہیں۔ ایک نوحے کا اقتباس ہے:

مارے گئے شاہِ زمن　　بنتِ نبیؐ کے گلبدن

وہ راکب دوشِ نبیؐ　　وہ قرۃ العین علیؓ

رن میں پڑے تھے بے کفن

وہ حامی قرآن تھے　　وہ صاحب ایمان تھے

جو رہ گئے تشنہ دہن

سجود افسانے اور انشائیے بھی لکھتے ہیں۔ قومی نظموں سے بھی سجود کو دلچسپی ہے۔ ایک نظم میں، جس کے کچھ شعر یہاں درج ہیں، وہ حالی کی لَے میں مسلمانوں کو بیدار کرنا چاہتے ہیں:

خوابِ غفلت میں پڑا ہے یوں مسلمان آجکل
حشر کا غم ہے اسے نہ خوفِ یزداں آجکل
تھی جو اُمت ایک وہ اب ٹولیوں میں بٹ گئی
دستِ مُسلم میں ہے مُسلم کا گریباں آجکل
مرثیہ لکھیں زوال قوم کا کب تک سجود
جب قلم کے بھی خطا ہوتے ہیں اوسان آجکل

سجود کے افسانے زیادہ تر کشمیر کے پس منظر میں لکھے گئے ہیں۔ "چنار کے سایے میں" ان کا اچھا افسانہ ہے۔ جو فلم لائن (بمبئی) میں شایع ہوا ہے۔

ایرج کاشمیری، وادی کے اُبھرتے ہوئے شاعروں میں سے ہیں۔ ان کا پورا نام محمد مظفر نقشبندی ہے۔ ولادت سری نگر کے محلہ صفا کدل میں ۱۹۴۰ء میں ہوئی۔ تعلیم یہیں پائی اور ہینڈلوم ٹیکنالوجی میں پوسٹ ڈپلوما حاصل کر کے، ملازمت میں داخل ہو گئے۔ اس وقت جموں وکشمیر انڈسٹریز بورڈ میں اسسٹنٹ منیجر، ہینڈلوم ہیں۔ شعر وسخن کا ذوق فطری ہے۔ چنانچہ ملازمت کی غیر شاعرانہ فضا میں بھی وہ اپنے ذوق کی پرورش میں مصروف ہیں۔ غزل کے انداز کی شاعری کی طرف ایرج کا رجحان زیادہ ہے۔ تاہم وہ اپنے عصر کے تقاضوں سے بھی بے نیاز نہیں ہیں۔ چنانچہ ایک غزل میں کہتے ہیں:[۱]

نقشِ کہن مٹائیں گے آج نہیں تو کل سہی
جوت نئی جلائیں گے آج نہیں تو کل سہی
جوشِ جنون میں دوستو، اپنی ہی وحشتوں کی ہم

---

[۱] ایرج کا شعری مجموعہ "الحجر" کے نام سے چھپ کر آگیا ہے

عمر کچھ اور بڑھائیں گے آج نہیں تو کل سہی

اے دوست، محبت میں، تاثیر عجب دیکھی

ہم دور ہیں منزل سے اور سامنے منزل ہے

یہی دعا ہے خدا سے ہماری شام و سحر — غم جہاں کی ہو کچھ عمر نہ کم، خدا نہ کرے

وہ وفا میں فریبِ وفا سے تنگ آکر — بہک بھی جائیں ہمارے قدم، خدا نہ کرے

صادق علی اسیر، زمانہ طالب علمی سے بہ حیثیتِ شاعر، اپنے ہم قرانوں میں کافی نمایاں رہے۔ جب وہ سری پرتاپ کالج میں پڑھتے تھے۔ ان کی غزلیں اور نظمیں کالج کے رسالے میں شائع ہوتی رہتی تھیں۔ وہ ۱۹۵۶ء میں "پرتاپ" کے ایڈیٹر بھی رہے۔ اس کے علاوہ طلباء کی ادبی اور علمی سرگرمیوں میں بھی حصہ لیتے تھے۔ ان کی فکر میں کافی تنوع ہے۔ پیپر ماشی کی صنعت ان کا خاندانی کاروبار ہے۔ اسیر نے عملی سیاست میں بھی حصہ لیا۔ اب بھی وہ شعر کہتے ہیں۔ ان کی ایک غزل کے کچھ شعر یہاں درج کئے جاتے ہیں:

کچھ آج نالۂ دل یوں ہمارے کام آئے

کہ بہرِ پرسشِ غم وہ بھی سوئے بام آئے

گھٹا بھی، گل بھی، بہاریں بھی ساز و نغمہ بھی

یہی تو وقت ہے، ساقی بہ اہتمام آئے

ہوئی جو شام تو یہ غم کہ کیسے رات کٹے

ہوئی جو صبح تو یہ فکر، کیسے شام آئے

یہ میکدہ بھی ہمیں سے یہ جام و مینا بھی

یہ کیا ستم ہے، ہمیں تک نہ دورِ جام آئے

ہزار ترکِ تعلق کے باوجود اسیر

بہار آئی تو ان کے بھی کچھ پیام آئے

نشاط انصاری، تنہا انصاری کے بھائی بھی شعر کہتے ہیں۔ ان کی ایک غزل سے چند شعر یہاں منقول ہیں:

کشمیر ہیں بہ فیضِ نسیم گُل آفرین !

گلخن مثال گلشن خنداں ہے آج کل

ہر رند گرد میکدہ محوِ طواف ہے

زاہد حریم زہد میں رقصاں ہے آج کل

پھر جنت نگاہ کا سامان عام ہے

پھر لطف بے کراں و فراواں ہے آج کل

پھر ہر قدم پہ حُسن گراتا ہے بجلیاں

حشر آفریں یہ شہرِ نگاراں ہے آج کل

کشتواڑ کے ایک اور شاعر نشاط کشتواڑی بھی اس زمانے میں کافی لکھتے رہے ہیں۔ وہ غزل اچھی کہتے ہیں اور روایتی انداز کی۔ ایک غزل کے شعر ہیں:

جلوؤں کی تاب لا نہ سکے ان کے سامنے

آنکھیں ملانے آئے تھے شمس و قمر سے ہم

اک مختصر سا وقفہ جو ٹھہری یہ زندگی

پھر کیوں نہ شامِ غم کو بدل دیں سحر سے ہم

شرم و حیا سے ان کی جبیں عرق ریز ہے

دامن کو اپنے بھرتے ہیں لعل و گہر سے ہم

دیجے سوتن جموں کے متوطن ہیں، شعر سے انہیں بھی رغبت ہے۔ غزل اچھی کہتے ہیں،

اور اپنے اسالیب خود وضع کرتے ہیں۔ جس سے غزل میں تازگی پیدا ہو جاتی ہے۔ ان کی ایک غزل کے چند شعر ذیل میں منقول ہیں:

تم نے دِل پر جو تیر مارے ہیں
وہی اب زیست کے سہارے ہیں

یہ جو کچھ لوگ پیارے پیارے ہیں
دِل کی دُنیا کے چاند تارے ہیں

تم ہمارے نہیں تو کس کے ہو
ہم کسی کے نہیں تمہارے ہیں

تیری نظروں کو کون دے الزام
ہم سب اپنی قضا کے مارے ہیں

زندگی کا تو آسرا ٹوٹا
اے اجل! اب ترے سہارے ہیں

دِل خوشی تیری فریب کھاتا ہے
پھر تو کہنا کہ ہم تمہارے ہیں

پونچھ کے بلدیو راج رہبر ابھی شعر کہتے ہیں۔ ان کا کلام اکادمی کی مبتقاتی اشاعتوں جیسے "ہمارا ادب" میں شایع ہوا ہے۔ یہاں ان کی ایک غزل کے چند شعر درج ہیں:

لگا کر اپنے ہونٹوں سے بھرم اس کا میں رکھ لوں گا
بھرا ابھی گر نہ ہو خالی سہی اک جام آجائے

خرد کیا کام آتی ہے، جنوں کیا ساتھ دیتا ہے
شکست زلیت ہو کر جب دِل ناکام آجائے

اچانک برق سی کوندنے لگے سینے میں برچھی سی
وہ گل اندام جب جلوہ نما بر بام آجائے

اگر ہے آرزو کوئی، یہی ہے آرزو دِل میں
"خدایا زندگی میری وطن کے کام آجائے"

بیرونی شعراء

اس زمانے میں، کشمیر سے باہر کے کئی خوش فکر سخن سنجوں کا کشمیر سے طویل یا مختصر تعلق رہا اور ان کے قیام کشمیر سے نوجوان شاعروں کے سامنے فکر و فن کے نئے انداز آئے اور نئے معیاروں سے بھی وہ روشناس ہوئے۔ اس سے اس عہد کے شعراء کو ایک نئی ذہنی تحریک نصیب ہوئی۔ ان سخن سنجوں میں وامق جونپوری، کمال احمد صدیقی اور جگن ناتھ آزاد خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان میں سے ہر ایک صاحب سخن کو کشمیر آنے سے پہلے بھی ہندوستان بھر کے ادبی حلقوں میں مقبولیت حاصل ہو چکی تھی۔

وامق جن کی ذہنی تربیت علی گڈھ کی علمی اور ادبی فضا میں ہوئی تھی، شعر و ادب کی عمدہ روایات کو اپنی فکر و فن میں جذب کر چکے تھے اور انداز گفتار کی انفرادیت نے انہیں ایک نمایاں مقام بھی عطا کیا تھا۔ کشمیر میں وہ ریجنل انجینیرنگ کالج، سری نگر کے مددگار رجسٹرار رہے اور پھر ڈپٹی رجسٹرار کے عہدہ تک ترقی کر کے خدمت سے ۱۹۶۹ء میں سبکدوش ہوئے۔ اس طرح انہیں ایک قرن سے زیادہ عرصہ تک کشمیر اور کشمیر کی ادبی اور شعری تحریکوں سے وابستہ رہنے کا موقع ملا اور ان کی فکر اور فن کا براہِ راست یا بہ واسطہ اثر نوعمر شعر کہنے والوں کے ذہنوں پر پڑا۔ وامق غزل بھی کہتے ہیں اور ان کی غزل نئے عہد کی غزل ہے۔ لیکن نظم ان کا مخصوص میدان ہے۔ کچھ مرثیے اور نئے انداز کے مرثیے بھی وامق نے کہے ہیں اور وہ اچھے نثر نگار بھی ہیں۔ چنانچہ ان کے ڈرامے بھی کلچرل اکادمی کی میقاتی مطبوعات میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ وامق کی ہر نظم میں کوئی نہ کوئی ایسا پہلو ہوتا ہے جو دعوتِ فکر و نظر دیتا ہے۔ اسی لئے انتخاب مشکل معلوم ہوتا ہے۔ کشمیر میں قیام کے زمانے میں ان کی ایک عمدہ نظم "فن" کے عنوان سے "ہمارا ادب" سنہ ۶۲-۱۹۶۰ء کے شمارے

میں شائع ہوئی تھی۔ یہ نظم معتدل طول کی ہے، اور ہر شعر خیال کے ارتقاء کے بند مضمون میں جکڑا ہوا ہے۔ اس لئے نظم سے انتخاب بھی آسان نہیں ہے۔ تاہم یہاں ایسے اشعار چھننے کی کوشش کی گئی ہے۔ جو خیال کے تسلسل کو کم سے کم نقصان کے ساتھ قائم رکھ سکیں۔ نظم میں فن اپنی زبان سے اپنے اوصاف بیان کرتا ہے:

میں فن ہوں میری انگلیاں ہیں زندگی کی نبض پر
قدم مرا زمین پر تو کائنات پر نظر
میں زندگی کا آئینہ، میں زندگی کی جان ہوں
ضمیر عقل و ہوش ہوں جنوں کی آن بان ہوں
کبھی میں پھول سے بھی نرم گلشنِ حیات میں
کبھی تلاطمِ حیات میں کڑی چٹان ہوں
میں سحر ہفت رنگ ہوں کمالِ آذری ہوں میں
نشیمن نگاہ و منتہائے دلبری ہوں میں
کبھی اُلجھ گیا تو زُلفِ یار بن گیا ہوں میں
سنور گیا تو سولھواں سنگھار بن گیا ہوں میں
مری زبان شاعری، مرا قلم مصوّری
طرب مرا نفس نفس مرا صنم گری
میں فکر کا شباب ہوں، نظر کا شاہکار ہوں
سرسوتی کی لاج ہوں، سروپ ہوں، ستار ہوں

اسی انداز سے فن کی زبان سے اس کے کارنامے سناتے چلے گئے ہیں۔ نظم کے آخری دو شعر ہیں:

جہاں کہیں عوام کا سوال بن گیا ہوں میں ۔۔۔ تو جابروں کی جان کا وبال بن گیا ہوں میں

عوام میری زندگی ، دوام میری زندگی
شعور ہے شراب اور جام میری زندگی

کمال احمد صدیقی، کوئی بیس برس سے سرینگر میں مقیم ہیں اور جموں اور کشمیر کی شعری محفلوں کی رونق ہیں۔ لکھنو ان کا وطن ہے اور شعر و سخن کا ذوق نو عمری سے پروان چڑھتا رہا ہے۔ اوائل فکر ہی سے وہ ترقی پسند تحریک کے ساتھ وابستہ رہے اور اپنی فکر کی انفرادیت کی بدولت، اس حلقہ کے سخن سنجوں اور عام شعراء میں انہوں نے ایک خاص مقام پیدا کر لیا ہے۔ کمال کی شاعری اپنی مخصوص انفرادیت رکھتے ہوئے اور ترقی پسند رجحانات کو اپنے اندر سموتے ہوئے بھی، فکر و فن کے اگلے معیاروں کے خلاف معاندانہ رویہ نہیں ظاہر کرتی، بلکہ دونوں انداز اور روایات کا حسین سنگم بن گئی ہے۔ نئے فکری رجحانات کمال کی شاعری میں ایک متناسب بیٹھ بٹھاؤ پیدا کرتے ہیں۔ زبان، اسلوب، اور اظہار کے انداز ان کے اپنے ہیں، جن میں نئے رمز اور نئی علامتوں کی بدولت ان کی انفرادیت نمود حاصل کر لیتی ہے۔ کمال اس عہد کے شاعر ہیں اور اپنے عہد کی ذہنی اور فنی تحریکات کے وارث ہیں۔ وہ غزل بھی کہتے ہیں اور نظم بھی، لیکن ان کی نظم، ان کے رمزی انداز اظہار سے غزل کا حسن گفتار پیدا کر لیتی ہے۔ یہاں ان کے کلام کے اقتباسات ذیل میں درج ہیں۔ غزل کے شعر ہیں:

اب تو ہر چہرہ تیرا چہرہ نظر آتا ہے
ذہن ہے اب تری تصویر، بڑی مشکل ہے

وہ ملاقات تعارف سے زیادہ تو نہ تھی
ہو گئی عشق کی تشہیر، بڑی مشکل ہے

واقعی، عشق کا ہونا تو بڑی مشکل ہے
لیکن اس عشق کی تفسیر، بڑی مشکل ہے

کشمیر کے بارے میں لکھی ہوئی نظموں میں کچھ اچھی نظمیں کمال کی کہی ہوئی ہیں۔ ان نظموں میں عام شعراء کے پیش پا اُفتادہ پہلوؤں سے ہٹ کر، کچھ ایسے پہلو بھی پیش کئے گئے ہیں، جو کمال کے اپنے مشاہدات اور خاص طور پر ان کے طویل اور ہر موسم کی زندگی کے تجربات کا نتیجہ ہیں۔ ایک نظم کا اقتباس ہے:

ہاں قدم اور بھی تیز، اور بھی تیز اور بھی تیز
ہے وہ راہ کہ ہوتی ہے تھکن بھی مہمیز

اک نئے دورِ مساوات کی سرحد ہے یہی
آج تو کوہ کنی بھی ہے مزاجِ پرویز

میرا میخانہ یہی ہے، مرا معبد ہے یہی
ہر ادا ہے مرے کشمیر، تری دل آویز

یہ بہاروں کا خزانہ ہے کہ برفِ کہسار!
جب پگھلتی ہے، بنا دیتی ہے پتھر، زرخیز

ایک نوخیز ترنم سے فضائیں سرشار
آبشاروں کی روانی ہے مسرت انگیز

یہ ترے لالہ و گُل اور بھی ہوں گے لیکن
میری محنت بھی ترے حسن میں ہے رنگ آمیز

جگن ناتھ آزاد، اقبال کے ہم وطن اور ہم عصر، مشہور سخن سنج تلوک چند محروم کے فرزند اور نئے عہد کے مقبول شاعر، حکومتِ ہند کے محکمۂ معلومات عامہ کے پرنسپل ڈپٹی انفارمیشن آفیسر کی حیثیت سے، کوئی تین سال سے کشمیر میں مقیم ہیں اور اس عرصہ میں کشمیر کی شعری صحبتوں کے روحِ رواں رہے ہیں، آزاد متنوع فکری صلاحیتوں کے مالک ہیں، ان کے کلام کے کئی مجموعے اور کچھ طویل مستقل نظمیں شائع ہو چکی ہیں۔ "ستاروں سے ذروں تک"

ان کے مقبول شعری مجموعوں میں شامل ہے۔

کشمیر کے قیام کے دوران کشمیر ڈیموکریٹک رائیٹرز کمیٹی کے قیام میں آزاد بھی شامل تھے۔ اس ادارہ کا احیاء یا از سرِ نو قیام ۱۹۶۹ء میں عمل میں آیا تھا۔ جس کے اہتمام میں کشمیر آنے والے مشاہیر ادیبوں اور شاعروں جیسے کرشن چندر، سجاد ظہیر، فراق گورکھپوری، رضیہ سجاد ظہیر اور کئی سربرآوردہ اصحاب کے خیر مقدمی جلسے منعقد ہوتے رہے۔

منظر اعظمی، جموں کے کئی ادبی اداروں کے سرگرم رکن ہیں۔ وہ اسوقت پوسٹ گریجویٹ شعبہ اُردو، جموں یونیورسٹی، جموں میں اُردو کے لیکچرار ہیں۔ اچھے شاعر اور اُردو کے عالم ہیں۔

کشمیر سے باہر

کشمیر میں شعر و ادب کے موجودہ دور کا آغاز جن پُرآشوب حالات میں ہوا۔ اس کے نتیجے کے طور پر صلاحتیں تقسیم اور کہیں حد تک منتشر بھی ہوگئیں۔ یوں بھی اہلِ کشمیر، زمانہ قدیم سے کشمیر سے باہر بھی اپنے علم و فضل اور ادبی ذہانت کی بدولت ممتاز رہے ہیں لیکن تقسیم ملک نے ان میں انتراض پیدا کر دیا۔ چنانچہ بعض نمایاں صلاحیت رکھنے والے عالم، ادیب اور شاعر، پاکستان منتقل ہو گئے ہیں۔ ان میں قابلِ ذکر ظہیر کاشمیری، خلش کاشمیری، شورش کاشمیری، رفیق خاور ہیں۔

ظہیر کاشمیری بالغ نظر ادیب ہیں اور جدید شاعری اور تنقید دونوں میں انہیں ایک مقام حاصل ہے۔ وہ ادب میں ترقی پسند تحریک سے خاص طور پر متاثر ہیں۔ تاہم لکیر کے فقیر نہیں اور وسیع مشرب السان ہیں۔ ان کی شعری تخلیقات اور نثری کارناموں میں اپنے عہد کا سماجی شعور پوری طرح نمایاں ہوتا ہے۔ ظہیر کی ایک نظم "ایشیا" مربوط تجویز کے تحت لکھی ہوئی خاصی طویل نظم ہے۔ جس میں عہدِ قدیم سے لے کر موجودہ دور کے رجحانات کا خاکہ اختصار کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ ہمارے عہد میں ایشیائی ملکوں کی بیداری، ان کے مستقبل کے بارے میں خوش آیند توقعات کی افزائش کا سبب ہے۔ ظہیر اس کی پیش بینی کرتے ہیں کہ پرانا استحصال کا زمانہ اب بیت گیا اور تہذیب اور شائستگی کے ماخذی براعظم کے لئے اچھے دن آرہے ہیں کہتے ہیں:

ایشیا، کلفتِ شب کی پروا نہ کر

تیرگی رفتہ رفتہ ترے دشت و کہسار سے اُڑ چلی

تیرے بیٹے سبستاں کی آسودگی سے گریزاں ہوئے
وہ تلاشِ سحر ہیں، مصایب کی صبر آزما گھاٹیوں سے گذرنے لگے۔
وہ ابھی حُسنِ تدبیر کے پر لگا کر اُفق کی تہوں تک پہنچ جائیں گے
وہ ابھی تجھ کو رنگین شعاعوں کے ملبوس پہنائیں گے۔

ایشیا، مردِ نو کی ولادت پہ مسرور ہو
یہ وہی ہے جسے مظہرِ نورِ فطرت کہیں
یہ وہی ہے جسے وارثِ عظمتِ آدمیت کہیں

ایشیا، اپنی تخلیقِ تازہ پہ مغرور ہو

ایشیاء، مردِ نو کی ولادت پہ مسرور ہو

ان کی بظاہر ہلکی پھلکی، مگر معنوی اعتبار سے گھمبیر نظموں میں سے ایک "پاگل" ہے،
جو یہاں منقول ہے:

ہی ہی ہا ہا — دیواروں کے
ہو ہو، ہو ہو — میل اُنارو
لپاڈ کی — اس میں رہ کر
کھینچا تانی — جینا سیکھو
دھینگا مُشتی — اس سے بچ کر
یہ سب کیا ہے؟ — بھاگ سکو گے؟
پاگل خانہ — بھاگ بھی جاؤ
سب کا گھر ہے — کہاں رہو گے
سب کا دامن — اس کے علاوہ
اپنا سمجھو — پاگل خانہ

شور نہ ڈالو کوئی نہیں ہے

میز نہ توڑو

ظہیر کے تنقیدی شعور کے آئینہ دار ان کے کئی مضامین ہیں جو رسائل میں شایع ہوتے رہتے ہیں۔ انہیں میں ایک مولانا ابوالکلام آزاد کی ادبی تنقید کا تجزیہ ہے۔ اس کا جائزہ لیتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

" مولانا آزاد کی ادبی تنقید کا انداز وجدانی یا داخلی نہیں۔ پُرانے ناقد شعرُ ادب پر تنقید کرتے ہوئے عام طور پر ادب پاروں کے تاثر اور حسین اسلوب تک بحث کو محدود کر دیا کرتے تھے۔ مگر مولانا آزاد نے یہ راستہ اختیار نہیں کیا۔ وہ جس شاعر یا ادیب کے ادب سے بحث کرتے ہیں۔ اس کے زمانے کا جائزہ بھی لیتے ہیں۔ اس میں اس ادیب اور شاعر کا مقام متعین کرتے ہیں اور جملہ خارجی حالات کی روشنی میں شعر و ادب کا جائزہ لیتے ہیں۔ اس طرح ان کی تنقید ادب کی مجرد تاثیر ہی نہیں، ادب کی خارجی وجوہات (EXTERNAL CAUSES) کو بھی اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔"

افسانہ، ناول، ڈرامہ

موجودہ دور کے نثری ادب میں سب سے زیادہ مقبول صنف، افسانہ ہے۔ اس صنف نے ترقی پسند رجحانات کو سب سے زیادہ اپنے اندر سمونے کی کوشش کی، اور اکثر پڑھے لکھے اہلِ قلم افسانہ پر طبع آزمائی کرتے رہے۔ یہی وجہ ہے کہ جموں اور کشمیر کے لکھنے والوں میں، اس دور میں افسانہ نگاروں کی تعداد سب سے زیادہ ہے۔ یہ مختصر سی صنفِ ادب، برتنے میں بڑی سہولت مہیا کرتی رہی ہے۔ نئے شعور کے طلوع ہونے کے ساتھ ہی، ریاست کے افسانہ نگاروں نے اپنے عصر کے مسایل کو افسانے کے ذریعے ابھارنے کی کوشش کی۔ اس کے ابتدائی آثار پریم ناتھ پردیسی کے یہاں نظر آتے ہیں۔ لیکن موجودہ دور کے اکثر افسانہ نگاروں نے نہ صرف اسی رجحان کو ترقی دی، بلکہ نئے اسالیب اور نئی تکنیک کو بھی برتنے کی کوشش کی ہے۔ ریاست کے ایک افسانہ نگار، پشکر ناتھ نے اپنے ایک نوجوان معاصر وجے سوری کے ناول "ایک ناؤ کاغذ کی" کا تعارف لکھتے ہوئے، اس حقیقت کا اعتراف کیا ہے کہ:۔

"اس صنف میں اچھی اچھی چیزیں لکھی جارہی ہیں، یہی وہ وقت تھا جب ملک بھر میں افسانہ نگاروں کا ایک نیا گروہ

سرگرمِ عمل تھا اور بلند پایہ افسانے لکھے اور پڑھے جا رہے تھے"۔

نوجوان افسانہ نگاروں میں، شاعروں سے بھی زیادہ ایک خود اعتمادی کا احساس پیدا ہو گیا ہے، اور وہ اپنے مخصوص جغرافیائی ماحول اور مناظر کی دلکشیوں کے درمیان، اپنے اطراف کی سماجی زندگی کے مسایل کو اُبھارنے میں مصروف ہیں۔ ان کی نئی حاصل شدہ خود اعتمادی، نئے نئے تجربے کرنے اور نئی نئی تکنیک کو اپنے کارناموں کے ذریعے روشناس کرانے کا حوصلہ بھی بخش رہی ہے۔ مثال کے طور پر ایک نوجوان افسانہ نگار اپنی کہانی کا تعارف کراتے ہوئے خود یہ لکھنے سے نہیں جھجکتا کہ :- "میری کہانی کا پلاٹ ایک نئی تکنیک کی طرف اشارہ کرتا ہے"۔ یہی خود اعتمادی نوجوان ادیبوں کو نئے تجربے کرنے میں مہمیز ثابت ہو رہی ہے، اور وہ جس انہماک کے ساتھ اپنے فن کی خدمت میں مصروف ہیں، اس سے ایک خوش آیند مستقبل کی توقع پیدا ہو جاتی ہے، جب ریاست کے افسانہ نگار اپنے نکھرے ہوئے سماجی شعور اور فن کی خدمت کے احساس کے ساتھ اپنا ایک نیا دبستان قائم کر لیں گے، اور اس کے آثار نمایاں ہو گئے ہیں۔

اس عہد کے خصوصی افسانہ نگاروں میں پریم ناتھ در ایک مقام حاصل کر چکے ہیں۔ وہ بھی دراصل آزادیٔ کشمیر کی تحریک کا جز رہے ہیں، لیکن ان کی تخلیقات کا سلسلہ اب بھی جاری ہے[1]۔ ان کے افسانوں کے دو مجموعے "کاغذ کا واسدیو" اور "نیلی آنکھیں" اس وقت تک شایع ہو چکے ہیں، اور کئی افسانے جو رسالوں میں شایع ہوئے ہیں، ان کی تدوین کا ابھی موقع نہیں آیا۔ در کی ولادت کا سنہ ۱۹۱۴ء ہے۔

---

[1] پریم ناتھ در کا ۱۹۷۵ء میں انتقال ہو چکا ہے۔

سرینگر ان کی جائے ولادت ہے، اور یہیں اُنھوں نے تعلیم بھی پائی۔ اعلیٰ تعلیم کے لئے لاہور گئے تو وہاں انھیں ایک طرف اس عصر کے مشاہیر ادیبوں اور شاعروں، جیسے علامہ اقبال، ظفر علی خان، ڈاکٹر محمد دین تاثیر کی صحبتوں سے استفادہ کا موقع ملا، دوسری طرف وہ سیاست میں بھی الجھ گئے۔ اس زمانے میں مارکسی عقاید ملک کے نوجوانوں میں پھیل رہے تھے۔ در بھی اس اثر میں آگئے۔ ان عقاید سے اہل سیاست نے سیاست میں کام لیا، اور ادیبوں اور شاعروں نے اپنی تخلیقات میں ان عقاید کے ردعمل کو ظاہر کرنے کی کوشش کی۔ در نے کارل مارکس اور لینن کی تحریروں کا دلچسپی سے مطالعہ کیا اور ان کی تخلیقات کو اپنے افسانوں کے لئے بھی راہ نما بنانے کی کوشش شروع کی۔

کشمیر اس زمانے میں مطلق العنان شخصی حکومت کے خلاف جد وجہد میں مصروف تھا، اور حکومت نے اس تحریک کو چلانے والوں کے خلاف جو سخت رویہ اختیار کیا تھا، اس سے بچنے کے لئے قائدین لاہور چلے گئے تھے۔ پریم ناتھ در بھی بے خطر اس جد وجہد میں کود پڑے۔ ان کے خلوص نے شیخ محمد عبداللہ کو بھی متاثر کیا۔ نیشنل کانفرنس کے قیام کے بعد در اس کے سرگرم کارکن بن گئے، اور شیخ صاحب کا اعتماد بھی انھیں حاصل رہا۔ شیخ صاحب کی گرفتاری کے بعد وہ گرفتاری سے بچنے کے لئے پھر لاہور چلے گئے۔ اور وہاں آزادی کا پروپگنڈا جاری رکھا۔ گاندھی جی کو اس تحریک کے بارے میں یہ باور کرایا گیا تھا کہ یہ ہندو راجا کے خلاف مسلم اکثریت کی بغاوت ہے۔ در نے گاندھی جی کو اس تحریک کے عوامی خط وخال سے واقف کرایا اور ایک کتابچہ بھی مرتب کیا۔ جس کا پیش لفظ پنڈت جواہر لال نہرو نے لکھا ہے۔

پنڈت در اس وقت آل انڈیا ریڈیو، دہلی میں شعبہ کشمیری[1] کے ناظم ہیں۔

---

[1] شعبہ کشمیری نہیں بلکہ شعبۂ کشمیر در اصل انتقال سے پہلے کچھ وقت وزیر اعلیٰ کشمیر کے صحافتی [illegible]

اس سے پہلے وہ "ہندوستان ٹائمز" اور "اسٹیٹسمین" کے حلقۂ ادارت میں کام کرتے رہے تھے۔ افسانہ نگاری کے میدان میں وہ دیر میں داخل ہوئے اور اس طنطنہ کے ساتھ کہ ان کا پہلا افسانہ جو "ادبی دنیا" لاہور میں چھپا تو، اس کے قابل مدیر مولانا صلاح الدین نے اس پر نوٹ لکھا تھا کہ "در بہت جلد ہمارے افسانوی حدود کو آگے بڑھائے گا اور فن کا پرچم ان دیکھے میدانوں میں گاڑھے گا۔" در جس زمانے میں عملی سیاست میں حصہ لے رہے تھے، اُسی زمانے میں بھی وہ افسانہ کے فن اور اُس کی تکنیک کا مطالعہ بھی کرتے رہے تھے اور افسانہ نگاری کی بہترین روایات کو اپنے شعور میں سمیٹ چکے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ جب انھوں نے قلم سنبھالا تو، ایسے افسانوں کو تخلیق کرنے لگے، جن کو پڑھ کر نقادوں کے کان کھڑے ہو گئے۔ وہ ایک حساس صاحبِ فکر کی طرح ہزار شیوہ زندگی کو بڑی گہری نظر سے دیکھتے ہیں اور اسے اپنے شخصی تجربات کے ساتھ پیش بھی کرتے ہیں۔ وہ کم لکھتے ہیں لیکن سوچ سمجھ کر لکھتے ہیں۔ ان کے پہلے مجموعے "کاغذ کا واسدیو" میں ۹ نو افسانے "گیت کے چار بول" "دنوں کا پھیر" "تحلیل نفسی" "کوفتہ" "غلط فہمی" "جوان" "آخ تھو" "چڑھاوا" اور "کاغذ کا واسدیو" شامل ہیں۔ پہلا افسانہ اگست ۱۹۴۷ء میں لکھا گیا تھا اور آخری افسانہ "کاغذ کا واسدیو" اس کے ٹھیک ایک سال بعد لکھا گیا۔ ان افسانوں میں در نے عموماً کشمیر کی سماجی زندگی کے مرقع پیش کئے ہیں، موضوع اور موقف کے لحاظ سے ہر افسانہ انفرادیت رکھتا ہے۔ "کوفتہ" کشمیر کے شہرہ آفاق "گوشتابہ" کا افسانہ ہے، جس کی لذت نے لالہ گھاسی رام کے بیٹے بابو رام کو سبزی خور سے گوشت خور بنا دیا تھا۔ افسانے ہیں، ان کے اور افسانوں

کی طرح کشمیر کی زندگی کا حسن اور اس کی عظمت کا احساس جھلک پڑتا تھا۔
مثلاً ایک موقع پر وہ گویا بآوازِ بلند سوچتے ہیں۔ "کشمیری پنڈتوں کی اولوالعزمی،
جن میں ایک فرد بھی ان پڑھ نہیں .... یہ لوگ کتنے عجیب و غریب
ہیں، برہمن، پنڈت، خوبصورت، فارسی دان، انگریزی دان، مہاشاستری
پھر گوشت پسند ...."

"گیت کے چار بول" ایک غریب برف بیچنے والے کی کہانی ہے جس کا پس منظر
زندگی کا وہی اتار چڑھاو ہے جس کے نقشے حقیقی کشمیری زندگی میں نظر آتے
ہیں۔" "دنوں کا پھیر" اس لحاظ سے ایک نئی تکنیک ہے کہ اس میں بوڑھی
بھول دیٹی کی سوچ میں، شعوری رو کا شائبہ ملتا ہے۔ ایک اور نئی تکنیک کا
تجربہ در نے "تحلیل نفسی" میں کیا ہے۔ اس کا موضوع پروہت، برہمچاری
اور پجاری طبقے کی زندگی کے رازہائے دروں، ہیں۔ اور یہ افسانہ در افسانہ
ہے، جس میں ایک افسانہ چوکھٹے کا کام دیتا ہے، اور اصل افسانہ، جو
اس تحلیل کی جان ہے، چوکھٹے کے اندر کسی قدر نرچھا سا بیٹھا ہے۔"

"غلط فہمی" کا اختتام ایک خوشگوار ابہام پر ہوتا ہے، اس میں ایک
شادی شدہ نوجوان لڑکی کی " ایک اجڈ گنوار سے محبت" اور شوہر کے
دق سے انتقال کے بعد حالت "منظرہ کی پیش کشی کا انداز در کے بیان کی
خوبی کا نمونہ ہے۔" چڑھاوا، تین فرنگیوں کی واہ واہ بل کی پہاڑی پر
برف کے رقصاں ذروں کے درمیان چڑھائی اور اس کی جزئیات کی
مرقع کشی در کے مشاہدہ پر روشنی ڈالتی ہے۔ "در کا غذ کا واسدیو" کشمیر کے
دیہات کے ایک غریب مزدور کی منفرد انداز کی کہانی ہے، جو اپنے بچوں کو
مری ہوئی ماں کی یادسے محفوظ رکھنے کے لیئے برف کے تودوں کو ہٹاتے

ہوئے، زندگی کی تکان سے چور چور واسدیو بچوں کو ہنساتے ہنساتے خود ایک ابدی ہنسی بن جاتا ہے۔

"نیلی آنکھیں" دس افسانوں پر مشتمل ہے۔ "نیلی آنکھیں" "بھوت پریت" "گدھ" "فائدہ بے فائدہ" "ویسے کا ویسا" "بیچ اندھیرے" "زندگی کا گھونٹ" "دودھ" اور "نیلی بوتل"۔ ان افسانوں میں بھی زندگی کی رنگا رنگی جو حقیقت اور رومان کے تانے بانے میں ابھاری گئی ہے، جاذب نظر ہے۔ تقسیم ھند کے بعد کے حوادث اکثر معاصر افسانہ نگاروں کا موضوع رہے ہیں۔ لیکن کشمیر کے حوادث پر جو افسانے مثلاً "گدھ" "ویسے کا ویسا" "بیچ اندھیرے"، "نیلی بوتل" اس مجموعے میں شامل ہیں، ان سے بہتر افسانے اب تک نہیں لکھے گئے ہیں۔ "ویسے کا ویسا" کشمیر میں قبائلیوں کے گھس آنے کا بیانیہ ہے۔ اس کا مرکزی کردار، مادھو کمپونڈر ہے اور اس کی زندگی کا بڑا المیہ یہ ہے کہ، وہ جسے کوئی لڑکی دینے کے لئے تیار نہیں ہوتا تھا، قبائلی اُس سے لڑکی مانگتا ہے۔ "گدھ" میں انھیں حوادث کی کہانی رمزیہ انداز میں کہی گئی ہے۔ "دودھ" اور "اترائی" حسین افسانے ہیں، جن میں شعور کی رو جھلکتی ہے۔ "بیچ اندھیرے" ان لوگوں کی زندگی پر ایک تلخ و تُند طنز ہے، جو پناہ گزین کہلاتے تھے، اور اپنے سارے جاہ و حشم، اور کُتّوں اور کاروں کے ساتھ، جس گھر کا کوئی حصہ یا بالائی منزل خالی پاتے، اس پر قابض ہو جاتے۔ پناہ گزینوں کے بازار کا یہ نقشہ بہت بلیغ کھینچتا ہے:-

"وہ ایک بازار کیا، رنگ و بو کا کاروان کہئیے، جہاں زندگی کے بھیر ہلکے ہو جاتے ہیں قہقہوں اور جُتیوں کی آنکھ مچولی،

بنسی والے کی "بیباپی" سالٹسن والے کی جھماجھم اور تلتی مچھلی کا دھواں، عطروں اور جھنکاروں میں گھل جاتا ہے۔ . . . . .
پہلو ملتے ہیں اور کندھے ٹکراتے ہیں، دکھتی رگیں رہتی ہیں اور آدمی کھڑے کھڑے سو جاتا ہے ... ... "

افسانے کو پڑھ کر دل پر یہ نقش بیٹھ جاتا ہے کہ کم لوگ کچھ کھو کر آئے اور زیادہ لوگ آکر کھو گئے۔

ان دو مجموعوں کے علاوہ درؔ کے کئی افسانے رسالوں میں شایع ہوئے ہیں۔ ان میں "ٹرڈی پس" "کھڑکی" دلچسپ افسانے ہیں۔ خاکوں کی تعمیر، اشخاص افسانہ کی ایمائی کردار کشی، پیش کشی کا اُن کا اپنا مخصوص اسلوب، درؔ کے افسانوں کی نمایاں خصوصیات ہیں۔ "خاکے کا افسانہ" درؔ کی ایک دلچسپ تخلیق ہے، جس میں سنجیدگی فکر اور افسانوی انداز کو اس طرح سمویا ہے کہ افسانے، انشائیے اور خاکے کی سرحدیں مل گئی ہیں، اسی لئے اسے "افشائیہ" بھی کہا گیا ہے۔ یہ "راہی" (دہلی جنوری ۱۹۵۳ء) میں شایع ہوا تھا۔ اس میں خاکے اور افسانے پر جس انداز سے بحث کی ہے، اس سے درؔ کے بیان، تجربے اور فن کے بارے میں عرفان کا پتہ چلتا ہے۔ اُس کا ایک اقتباس درج ذیل ہے:-

"یہ بات بھولنی نہیں چاہیئے کہ اس ساری ہُنر میں ایسی اُستادانہ اسکیم ہے کہ انگ انگ میں نپا تُلا تناسب ہے، یعنی ضرورت سے زیادہ کسی واقعے کا سایہ بھی نہ ہوگا، ایک بھی کردار زیادہ نہ ہوگا۔ اور ان موتیوں میں سے چاہے کتنا ہی خوبصورت، کتنا ہی آبدار ایک موتی بھی رہ جائے، ہُنر بھی اگر جگہ نہیں ہے اس اسکیم میں اگر جگہ نہیں تو ہرگز

بیچ میں نہیں آئے گا۔ آئے گا تو افسانے کے اصول کو توڑ کر آئے گا۔ وحدت کو مٹائیگا۔ تاثر کی نوک ٹوٹ جائے گی، افسانے کی سنگیت سے ایک چیخ نکلے گی اور اڑتا ہوا قاری زمین پر گر جائے گا۔"

افسانے کے فن کو سمجھانے میں ان کی یہ مزید تشریح بھی بڑی معاون ہے:۔

"اِرونگ جیسے استاد نے بھی افسانے میں ایک پلاٹ کو تعمیر کرنے کی کوشش نہیں کی، نہ یہ چاہا کہ افسانے کے حدود میں ڈرامائی عمل آجائے۔ اگر اس نے ذہنی طور پر کوشش کی تو اس بات کی کہ قاری کے دل میں ایک 'موڈ'، ایک جذبہ پیدا کر دے، اُس وقت بھی جبکہ افسانے کا جنم ہوا، تب بھی افسانے کے مرکز میں ایک ہی فرد ہوا کرتا تھا، اُس وقت بھی چاہے وہ اِرونگ تھا، پو تھا، اور بعد میں چاہے موپساں یا اُو ہنری، چاہے کسی کے ہاں واقعات کی گھن گرج تیز تھی، یا تھی ہی نہیں، وہاں بھی انھوں نے پلاٹ کا سہارا اس لئے لیا کہ انھیں زندگی کے ہر پہلو کو آشکار کرنا تھا، نفس کی بے پایاں گہرائیوں اور الجھے اَن گنت دھاگوں کی کھوج لگانی تھی، ماحول کی جیتی جاگتی تصویر الفاظ میں کھینچ کر رکھنی تھیں، امر کرداروں کو جنم دینا تھا، اور ایک تحیّر کو پیدا کرنا تھا اور اسے جھٹکا دینا تھا کہ تجھے یہ کہانی، تجھے یوں ہی نہیں سُنادی۔"

افسانہ نگاری میں یہی در کا آدرش ہے۔ وہ بظاہر بے ساختہ اپنے خاکے اُٹھاتے ہیں، لیکن اس بے ساختہ پن میں بھی ایک ساختہ احتیاط اور فن کی نگہداشت کا شعور موجود ہوتا ہے۔ اسی لئے ان کے ہر خاکے میں

کچھ اُلجھی ہوتی ہے، اور ہر کردار میں ایک انفرادیت، جس کے بل بوتے پر وہ افسانہ نگاروں کے ایک وسیع گروہ کے درمیان اپنی انفرادیت نمایاں کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کا اسلوب پیچیدہ نہیں، لیکن وہ سادہ بھی نہیں۔ ان کے اسلوب کو اپنی فکر اور اپنے عہد کی فکر کے سارے الجھاؤ کا ساتھ دینا تھا، اور اس کی کوشش کا پتہ ان کے اسلوب سے چلتا ہے۔ افسانوں میں جو موقف وہ پیدا کرنا چاہتے ہیں، اور جو ردِ عمل قاری پر چھوڑنا چاہتے ہیں، اس کا ذریعہ ان کا اسلوب ہے۔

دینا ناتھ رفیق کا ذکر گذر چکا ہے۔ وہ شاعر ہیں، اور افسانے بھی لکھتے ہیں۔ ان کا ایک اچھا افسانہ جو "خدا کی لاٹھی" نند گوپال باآوا کے مرتبہ مجموعے "آدم کے بیٹے" میں شائع ہوا ہے، پہاڑی ملک کی دشوار گذار وادیوں میں دو مسافروں کے بھٹکنے اور بارش سے بچنے کے لئے ایک مالک مکان سے پناہ دینے کی التجا کا اخلاقی افسانہ ہے۔ مالک مکان انہیں داخل ہونے نہیں دیتا، اور فطرت کا انتقام اس گھر کو بجلی سے تباہ کر دیتا ہے۔

نند گوپال باآوا، جن کا جموں کی ادبی چہل پہل کے ساتھ گہرا تعلق رہا ہے، شعر بھی کہتے ہیں اور کئی افسانے بھی لکھے ہیں۔ انھوں نے جموں کے افسانہ نگاروں اور ڈراما نگاروں کی کچھ تخلیقات کو ایک مجموعے "آدم کے بیٹے" کے نام سے شایع کیا ہے۔ اس میں تین افسانے "وہ بدل گئی" "ضرورت" اور "ہمارے ساتھی" خود انھیں کے ہیں۔ اس مجموعے کا پیش لفظ موتی لال کیوری نے لکھا ہے، جو خود بھی افسانہ نگار اور انشائیہ نگار ہیں۔ باآوا کے افسانوں کا بنا ٔوٹ

لیتے ہوئے، وہ پہلے افسانے کے بارے میں لکھتے ہیں کہ اس میں عورت کی فطرت کے کمزور پہلوؤں کی عکاسی کی گئی ہے۔ کہانی کا ہیرو، عورت کے اس کمزور پہلو کا شکار ہے، لیکن وہ اپنے تجربے کو دھرانے سے خائف ہے، اس کے ساتھ وہ حسن اور حسنِ عمل کے جال میں بُری طرح پھنس گیا ہے۔ "ہمارے ساتھی" کو کپور نے باوا کا شاہکار مانا ہے۔

باوا اچھے انشا پرداز بھی ہیں۔ انھوں نے مذکورۂ بالا مجموعے میں، اپنا حُلیہ اور اپنے کچھ حالات بھی ایک اِستعارے کے انداز میں "حرفِ اول" کے عنوان سے قلمبند کئے ہیں۔ یہ بھی ایک افسانہ سا لگتا ہے۔ اپنے انتخابات کے بارے میں لکھا ہے کہ ان میں سماج کی جھلک ملے گی جسے دیکھ کر فخر اور شرمساری کا احساس بہ یک وقت پیدا ہوگا۔

مجموعے میں موتی لال کپور کا افسانہ "برج باسی" خاصا دلچسپ افسانہ ہے۔

دھرم چند پرشانت جموں کے مشہور اہل صحافت ہیں۔ مضمون نگاری کے علاوہ انشا نگاری سے بھی دلچسپی رکھتے ہیں۔ ان کا ایک افسانہ "انسان اور بزم قدرت" "شیرازہ" کے شمارہ نومبر ۱۹۶۴ء میں شائع ہوا ہے۔ یہ ڈوگری افسانے کا ترجمہ ہے۔ بسوہلی کے راجا امرت پال کے دربار کا مصوّر نوعین، راجہ کی فرمائشی تصویر بنانے سے انکار کرتا ہے اور صرف قدرتی مناظر کی تصاویر بنانے کو وہ اپنے فن کی معراج تصوّر کرتا ہے۔ راجا اسے دربار سے نکال دیتا ہے تو جنگل میں ایک اندھی حسینہ سے مسحور ہوکر، اسکی

تصویر بناتا ہے۔ آخر اسی لڑکی کی آنکھوں کو درست کرنے کے لئے ہیرہ حاصل کرنے راجہ کے دربار میں جانے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ لڑکی سے اسے یہ سبق بھی ملتا ہے کہ انسان بزم قدرت سے زیادہ حسین ہے۔

صوفی غلام محمد نے بھی کچھ افسانے لکھے ہیں۔ وہ پہلے "خدمت" کے سب اڈیٹر تھے، پھر اخبار "سری نگر ٹائمز" نکالنے لگے۔ ان کا ایک افسانہ "گنجا" اکادمی کی میقاتی اشاعت "ہمارا ادب" میں شائع ہوا تھا۔ یہ اس زمانے کی کہانی ہے، جب صاحب لوگ کشمیر کی سیر کو آیا کرتے تھے، صاحب اور ان کی میم جو ہاوس بوٹ میں رہتے تھے۔ ایک دن ایک کریہہ صورت گنجے کو ڈل میں مقابل نہاتے دیکھ کر وہ ایسی بدمزہ ہوئی کہ، ہاوس بوٹ چھوڑنے پر تیار ہو گئی، لیکن ہاوس بوٹ کے مالک نے اسے سمجھا بجھا کر روکا، پھر جب وہ صنعت کاری کے نمونوں کی تلاش میں ایک دوکان پر گئی، تو جس کام کو اس نے سب سے زیادہ پسند کیا، اسے یہ معلوم کر کے حیرانی ہوئی کہ وہ اسی گنجے کی کاریگری ہے۔

کنول نین پرواز کو طالب علمی کے زمانے سے ادب اور خاص طور پر افسانہ نگاری سے دلچسپی رہی۔ جس زمانے میں وہ سری پرتاپ کالج میں پڑھتے تھے۔ کالج کے رسالے "پرتاپ" کے لئے لکھتے تھے۔ "پردۂ پندار" ان کے پہلے افسانوں میں سے ہے جو اس رسالے میں شائع ہوا۔ اس میں بمبئی کے بازاروں کی مصروف زندگی کا حال لکھا ہے۔ ایک اور اچھا افسانہ "امن کی طرف" جو "کونگ پوش" میں شائع ہوا تھا۔ ایک ڈچ نوجوان کی کہانی ہے، جو ایک ہندوستانی کا ہم سفر تھا، اور دونوں ہالینڈ جا رہے تھے۔ کہانی اشتراکی تصورات کی حامل ہے۔ پرواز نے کچھ رپورتاژ بھی لکھے ہیں۔ وہ بہت صاف ستھری زبان میں لکھتے تھے۔ لیکن اب وہ عرصے سے خاموش ہیں۔

سوم ناتھ زتشی کی ادبی صلاحیتوں کو اس صدی کے تیسرے دہے کے تقاضائے اظہار نے ابھارنا شروع کیا تھا، لیکن ان کی فکر کی صحیح رہنمائی، چوتھے دہے کی ترقی پسند ادب کی تحریک سے ہوئی۔ پہلے وہ پریم ناتھ پردیسی کا اتباع کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ لیکن نئی تحریک سے وابستہ ہونے کے بعد ریاست کی ادبی اور ثقافتی جد وجہد کو ترقی پرور راہوں پر ڈالنے میں دوسرے ادیبوں اور فنکاروں کے ساتھ مل کر کام کرتے رہے۔ کلچرل فرنٹ اور کلچرل کانگریس کے وہ سرگرم رکن رہے، اور انجمن ترقی پسند مصنفین کے اغراض و مقاصد کو آگے بڑھانے میں وہ پیش پیش رہے۔

زتشی سرینگر کے ایک پنڈت خاندان میں ۱۹۲۳ء میں پیدا ہوئے سرینگر ان کے آبا و اجداد کا وطن ہے، یہیں تعلیم پائی، لیکن بقدر حوصلہ تعلیم کی تکمیل پہلے ہی نہ کر سکے اور جلد ملازمت اختیار کر لی۔ ان کے والد پنڈت نندلال کا انتقال ان کے لڑکپن میں ہو گیا تھا۔ ملازمت کا سلسلہ دفتر کی منشی گری سے شروع ہوا، ملازمت کے دوران بھی طلبِ علم کی خواہش نے ان سے ادیب فاضل کے امتحان کی تکمیل کروائی، پھر وہ بی، اے بھی کر سکے، اور ملازمت میں ترقی کرتے ہوئے محکمہ مال میں منتظم اور ریاستی اسمبلی میں چیف ٹرانسلیٹر ہو گئے۔ اس وقت ریاست کے وزیر اعلیٰ کے انڈر سکریٹری ہیں[1]۔

زتشی نے افسانے لکھے ہیں، ایک رپورتاژ بھی شائع ہو چکا ہے اور ایک اچھا ڈراما غالب کی زندگی کے ایک رُخ سے متعلق، اس سلسلے کے ڈراموں میں بہت اچھی چیز ہے۔ کہانی ان کے لئے بچپن سے جاذبیت رکھی تھی، اور کہانیاں لکھ کر "رتن" میں چھپوانے کے لئے جموں بھیجتے تھے۔ ان کے لکھنے کے

---

[1] سوم ناتھ زتشی اب وظیفہ حسنِ خدمت حاصل کر چکے ہیں۔

شوق نے "رتن" کے ساتھ وابستگی کی ایک اور صورت یہ پیدا کی تھی کہ ایک "رتن سبھا" بچوں کی اُنہوں نے بنائی تھی۔ انجمن آرائی کا یہ شوق انھیں بعد میں زیادہ اہم اور سنجیدہ قدم اُٹھانے پر مائل کرتا رہا۔ ان کے لکھنے کے شوق کی ابتدا ویر بشیشور کو دیکھ کر ہوئی، جن کا مکان ان کے مکان سے متصل تھا، لیکن جلد ہی وہ پردیسی کے حلقۂ اثر میں آ گئے۔ چنانچہ ۴۲-۱۹۴۱ء میں پردیسی کے ساتھ مل کر انھوں نے پروگریسیو رائٹرز لیگ بنائی۔ رامانند ساگر، دینا ناتھ وار یکو شاہد اور ویر بشیشور، اس کے سرگرم موید ین اور اراکین میں سے تھے۔ ساگر اس زمانے میں ٹنگ مرگ کی سینیاٹوریم میں زیر علاج تھے۔ زتشی کا ایک ابتدائی افسانہ "نشار دا"، کے عنوان سے مارتنڈ کے شمارہ ۷، راگست ۱۹۳۸ء میں چھپا تھا۔

پردیسی اور زتشی کے ترقی پسند تحریک کی طرف رجوع ہونے کا سبب ظاہر ہے کہ اس وقت تک ہندوستان کی آزادی کے بعد، کشمیری میں لکھنے کی جو تحریک پیدا ہوئی، اس کی پیش رفت میں زتشی نے بھی اور نوجوان ادیبوں کے ساتھ کشمیری میں لکھنا شروع کیا۔ کشمیری میں ان کا پہلا افسانہ "بیلہِ جھوٗل گاشس"، لکھا گیا۔ نیشنل کلچرل فرنٹ یا ثقافتی محاذ سے پہلا رسالہ کشمیری زبان میں ۱۹۵۱ء میں "کونگ پوش"، شائع ہونے لگا تھا، جس کے مینجنگ اڈیٹر زتشی مقرر ہوئے تھے۔ کشمیری میں زتشی نے کئی ڈرامے بھی لکھے ہیں، جن میں سے ایک ڈرامے "وِچہ واو"، کو ریڈیو ڈراموں کے مقابلے میں پہلا انعام ملا تھا۔ ان کا ایک اور کشمیری ڈراما "بیٖلہِ سنگر پھوٗلی"، ڈراموں کے نیشنل پروگرام میں آل انڈیا ریڈیو سے نشر ہوا۔

اردو میں زتشی کے افسانوں ایک رپورتاژ اور ایک ڈرامے کا مجموعہ مرتب ہوا ہے۔ اس میں نو افسانے "زندگی" ... ڈراما ہے پر،

"بہاؤ" "توکل" "امانت" "سیاہ وسپید" "شاہراہیں" "آنے والا دن" "ایک تصویر ایک کہانی" اور "ریوزناز" "ڈل کی تہ میں" "درا" "نوائے سروش" شامل ہیں۔ "دکھتی رگ" اور "امانت" نئے فنی شعور کی حامل ایمائی کہانیاں ہیں۔ یہ دونوں نفسیاتی کہانیاں بھی ہیں۔ "دکھتی رگ" ایک بدنصیب چوکیدار کردار ناتھ کی کہانی ہے، جس کی ایک چڑھ تھی اور لڑکے اور بعض اوقات اچھے خاصے بھلے مانس بھی وہ چڑھ دہرا کر اسے دق کرتے تھے۔ آخر وہ نوکری سے بیزار ہو گیا، لیکن افسر نے ہمدردی کر کے اس کے تبادلے کی تجویز کی۔ ابھی یہ تجویز روبہ عمل بھی نہ آئی تھی کہ اس سلسلے کے دردناک المیہ کا شکار ہو گیا۔

"امانت" ایک کلرک کی کہانی ہے، جو فائلوں کو الٹتے پلٹتے خود ایک فائل بن گیا تھا۔ یہ بیدی کے گرم کوٹ کے انداز کا افسانہ ہے۔ رام ناتھ ایک نفسیاتی الجھن کا شکار ہے۔ گھر اور خاص طور پر اپنے کمسن بچے کے کسی مسئلے کو طے نہیں کر پاتا۔ اس کہانی کا اختتام خاموش مگر ذہن میں ہلچل پیدا کرنے والا ہے۔ رام ناتھ بچے کو لے کر کچھ دلانے کے لئے بازار جاتا ہے تو وہاں سے بے نیل مرام لوٹتا ہے۔

کہانیوں کا سماجی پس منظر کشمیری ہے۔ ان میں کشمیری پنڈت ہیں، قہوہ ہے (دوراہے پر) ہانجی ہیں، ہاؤز بوٹ ہے، اور یورپی سیاح۔ "بہاؤ" میں دیہات کی دوشیزائیں، چشمے پر پانی بھرنے کے لئے ان کا آنا اور میل ملاپ اور ہلکی پھلکی خوشیاں اور دکھ درد "شاہراہیں" ہے تو پیدائش اور اموات کے محکمے کے ایک کلرک کی کہانی لیکن اس میں ہانجیوں کی زندگی کی کچھ تصویریں ابھاری ہیں، جن کا ابھار "سیاہ وسپید" کی آمیزش سے ہوتا ہے۔

ایک تصویر ایک کہانی، کشمیری سے ترجمہ ہے۔

رپورتاژ "ڈل کی تہ میں" چند ہم مذاق دوستوں کے ڈل پر سفر کی روداد، جس میں کشمیر کے نیچے طبقوں کی زندگیوں کے افلاس، بھوک، بیماری کے مرقع یکے بعد دیگرے سامنے آتے جاتے ہیں اور ہر تصویر متاثر کرنے والی ہے۔ یہ دوست ایک بیوہ عورت سے ملتے ہیں، جس کی ایک جوان بیٹی بیاہنے کے قابل ہے، لیکن وہ صرف اس لئے اس کا بیاہ نہیں کر سکتی کہ اس کے پاس کچھ نہیں ہے، اس کی کھیتی سیلاب میں بہہ گئی تھی۔ بیوہ کے الفاظ ہیں:۔

"نہیں نہیں، میں اس کی شادی نہیں کروں گی ... میں اسے اگلے سال تک گھر بٹھا رکھوں گی جب تک میرے پاس کچھ روپے جمع ہو جائیں، فصلوں سے آس لگائی تھی، وہ بہہ گئیں۔ سچ پوچھو تو میرے پاس اس کی مہندی کے لئے بھی پیسے نہیں ہیں۔ میرا سب کچھ ڈوب گیا، لیکن میرے ارمان نہیں ڈوبے۔"

غالب کے بارے میں ان کا ڈراما "نوائے سروش" غالب کی زندگی کے اُس رُخ کو پیش کرتا ہے جب وہ بہ حیثیت سخن سنج شہرت حاصل کر چکے تھے، لیکن روپے پیسے کی بڑی محتاجی تھی۔ قرض خواہوں کا ہجوم تھا۔ غالب اپنے دیوان خانے میں بیٹھے ہیں، ان کے عزیز شاگردوں میں تفتہ موجود ہیں۔ سارے اہم کردار، ان کی بیگم، کلّو ملازم اور ان کی دلچسپی کے سارے عناصر، شراب، آم بھی مہیا کر دئے ہیں۔ پھر ڈراما کے مکالمے خود غالب کی تحریروں سے چنے گئے ہیں۔ انجام ایک فنکارانہ ایمائی انداز سے ہوتا ہے، بازو کی مسجد سے مؤذن اذان دیتا ہے، ایسے میں غالب کھڑکی سے کسی کو آتا دیکھتے ہیں، یہ یقیناً قرض خواہ ہے، جس کو ڈراما نگار پس پردہ رکھتا ہے اور صرف ایمائی انداز سے ذہنوں کو اس طرف منتقل کر دیتا ہے۔ غالب

اس سے بچنے کے لئے، گھر سے نکل جاتے ہیں، اور اس دلچسپ صحبت سے غیر حاضری کا جو عذر تراشا ہے، وہ بہت حسین ہے۔

موہن یاور، اپنے افسانوں کی کمیت اور کیفیت کے لحاظ سے جموں کے افسانہ نگاروں میں ایک مقام پیدا کر چکے ہیں۔ انھوں نے ایک ناول بھی لکھا ہے اور صحافت سے بھی ان کا تعلق ہے، لیکن افسانہ نگاری میں وہ خصوصیت رکھتے ہیں۔ موہن یاور جموں کے ایک مرفہ حال گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں، ان کی ولادت ۱۹۲۷ء میں ہوئی اور جموں ہی میں تعلیم پائی۔ تعلیم کے زمانے ہی سے وہ ادبی دلچسپیوں میں محو ہو گئے۔ ان کے افسانوں کے تین مجموعے "وہسکی کی بوتل" "تیسری آنکھ" اور "سیاہ تاج محل" اب تک منظرِ عام پر آ چکے ہیں۔ ایک ناول "پتھروں کا شہر" بھی مکمل ہو چکا ہے۔

موہن یاور اپنے افسانوں میں زندگی کے نئے نئے مواقف کو گرفت میں لانے کی کوشش کرتے ہیں، اور اپنے کرداروں میں انسانی نفسیات کے نئے نئے گوشے تلاش کرتے ہیں۔ ان کے اکثر افسانوں اور خاص طور پر ان کے اچھے افسانوں کا پس منظر، جموں اور اس کے مضافات کی سادہ زندگی ہے۔ جس میں ماحول کے طبعی عناصر کا کنڈا پن بھی موجود ہے۔ ان کے اکثر کرداروں میں بھی ڈگر دیس کے سادھے سیدھے مگر اُجڈ اور بہادر انسانوں کے نمونے ملتے ہیں۔ "پتھر کے بت" ان کا ایک اچھا افسانہ ہے، جس کے افراد جموں کی قدیم تاریخ سے تعلق رکھتے ہیں۔ قلعہ باہو اور باہو لوچن، جامبو لوچن اور توی اس میں اہم عناصر ہیں۔ موہن یاور کے افسانوں کے مرکزی موضوع بھی سادھے سیدھے واقعات ہوتے ہیں، وہ اس سے احتراز کرتے ہیں کہ پڑھنے والوں کی توجہ کو کہانی کے واقعات کی دلچسپی سے ہٹا کر، مسائل میں الجھا دیں۔

اسی لئے ان کے افسانوں میں ایک سبک خرامی کی کیفیت پائی جاتی ہے۔ اپنے سماجی ماحول اور خاص طور پر شہری زندگی کی ناہمواریوں اور گندگیوں کو منظرِ عام پر لانے میں بھی وہ چابک دست ہیں۔ نیچے کے طبقوں کی زندگی کی مشکلات پر بھی ان کی نظر گہری ہے۔ ٹھاکر پونچھی، ان کے افسانوں کا جائزہ لیتے ہوئے لکھتے ہیں:-

"مصنف کا انسانی شعور اور انسانی نفسیات کا تجربہ بہت وسیع ہے۔ اسی لئے جب وہ لکھتا ہے تو اس کی تحریر زہر خند بن جاتی ہے۔"

"بلند شہر کے بلند شہزادے" موہن یاور کا ایک خیال زا افسانہ ہے۔ یہ دو دوستوں کی کہانی ہے، جو ایک دوسرے کے جانی دشمن بھی تھے اور جانی دشمن بھی۔ ایک معمولی سی بات پر دونوں کی گہری دوستی، گہری دشمنی میں بدل جاتی ہے، بازار میں دونوں کی مٹ بھیڑ ہو جاتی ہے، اور دونوں گتھم گتھا ہو جاتے ہیں۔ لوگ تماشائی بنے، ان دونوں کی کُشتی کا مزہ لیتے ہیں۔ موہن یاور کے طنز کے تیور اس جملے سے ظاہر ہوتے ہیں کہ:

"جب دونوں ایک دوسرے کو ادھ موا کر کے تھک گئے تب بازار والوں نے نہایت شرافت کے ساتھ دونوں کو زخمی حالت میں ہسپتال پہنچا دیا!"

یہ کہانی نہایت سڈول اور واقعات کی پیش کشی کا انداز بہت ستھرا ہے۔

"وھسکی کی بوتل" موہن یاور کے افسانوں کا پہلا مجموعہ ہے جو ۱۹۵۶ء میں شائع ہوا۔ اس میں بارہ افسانے شامل ہیں۔ اس میں "وھسکی کی بوتل" شاید سب سے اچھی کہانی ہے۔ اس کا موضوع سرمایہ دار اور صاحب اقتدار کے اخلاقی تنزل کی داستان ہے۔ ترقی پسندوں کا یہ محبوب موضوع ہے، اور اس کے مختلف پہلو بار بار دھرائے جاتے رہے ہیں۔ ان طبقوں اعتبار کا

بول کئی دفعہ کھل چکا ہے، لیکن موہن یاور نے اسے جس نئی توضیح میں پیش کیا ہے،
اس سے پورا مسئلہ نیا معلوم ہونے لگتا ہے۔

"سیاہ تاج محل" جو ۱۹۶۱ء میں شائع ہوا، ذیل کے بارہ افسانوں پر
مشتمل ہے: "دل چارہ گر" "چند تصویر بتاں" "پتھروں کے سوداگر"
"کنجوس" "موم اور پتھر" "سونے کا محل" "یہ پیار" "روگ"
"ایک عورت تھی..." "دائرہ" "بانجھ" اور "سیاہ تاج محل"۔

ان سارے ہی افسانوں کو موضوعات، مواقف اور پیش کش کے انداز میں
ایک تازگی ہے۔ اکثر افسانے رومانی ہیں، حسین لڑکیاں، ان کے بناؤ سنگھار
ناچ رنگ، ناے و نوش، لیکن ان دلکش فضاؤں میں چکر کاٹتے ہوئے
بھی افسانہ نگار کا سماجی شعور زندہ رہتا ہے۔ وہ مرقع کشی کرتا ہے، لیکن
وعظ خوانی اس کا شیوہ نہیں۔

"سیاہ تاج محل" کی کہانی ایک عادتی مجرم محمد متین خان کی زندگی کے
چکر کے ساتھ گھومتی ہے۔ یہ چکر ہے جیل جانا، جیل سے باہر آنا، اور پھر جیل
جانا۔ افسانہ نگار اس آواگون پر غور کرتے ہوئے، یہ عجیب نتیجہ نکالتا ہے کہ
وارڈر اور قیدی کا رشتہ بہت پرانا ہے، جب قیدی نے جنم لیا تھا، تب
جیل تعمیر ہوئی، اور جیل کے ساتھ ہی وارڈر بھی بندوق تھامے آیا تھا۔ قیدی
جو نقب زنی میں ماہر تھا، اس کے دل کے قلعے میں بھی ایک دفعہ نقب زنی
ہوئی تھی اور یہ نقب زنی، ایک بہادر پٹھان کی نوجوان لڑکی نے کی،
لیکن وہ ایک دفعہ کے سوا کبھی نہ مل سکے، اور جب ملے تو، رقیہ دو سپاہیوں
کے ساتھ لائی جا رہی تھی۔ اس نے متین خان کو دیکھا تو کہا "خان تم باہر
جا رہے ہو۔ اب کے میری سزا بہت کم ہے۔ صرف دو مہینے۔ میرا انتظار

کرنا۔ میں تم سے اسی جگہ آکر ملوں گی۔" خان نے سپاہیوں سے کہا۔" وارڈر اب مجھے جلدی سے لے چلو۔ میری زندگی کی سب سے بڑی آرزو پوری ہوگئی ہے۔ اب مجھے مرنے کا کوئی افسوس نہیں۔" کہانی کے اس ڈرامائی موقف نے ساری کہانی میں ایک جان ڈال دی ہے۔ سماج کے ایک ملعون طبقے میں بھی، جذبات کی یہ رفعت، نفسیات کا بڑا نازک شائبہ تھا، جسے موہن یاور نے بڑی خوبی سے نمایاں کیا ہے۔

کشمیری لال ذاکر نے ان کے ایک مجموعے کا تعارف لکھا ہے، اور ان کے افسانوں میں ڈُگر دیس کے تیکھے پن کی طرف اشارہ کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:۔

"مجاز میں لکھنوی بانکپن تھا، اور یاور میں ڈُگر دیس کا تیکھا پن، یہ تیکھا پن یاور کی کہانیوں کی جان ہے۔"

ذاکر نے ان کے فن پر بھی روشنی ڈالی ہے، لیکن شاعرانہ انداز میں کہتے ہیں:۔

"یاور کا فن کسی گیت کی گونجتی ہوئی لے ہے، جس میں سوز ہے، تڑپ ہے، نغمگی ہے لیکن نرماہٹ نہیں بلکہ آپریشن ٹیبل پر پڑے ہوئے کسی اوزار کی تیز دھار ہے، جو ایک دم چیرتی ہوئی سی جسم میں گزر جاتی ہے۔"

"وھسکی کی بوتل" کا پیش لفظ ٹھاکر پونچھی نے لکھا ہے، اور اس میں اُنھوں نے موہن یاور کو "ایک عظیم سرکش باغی افسانہ نگار" کے القاب سے یاد کیا ہے۔ جموں کی سنگلاخ زمین اور کنڈی سے دلکش افسانے تخلیق کرنے میں یاور کی ذہانت پر زور دیتے ہوئے ٹھاکر نے رمز یہ انداز سے لکھا ہے کہ:۔

"سعادت حسن منٹو نے شاید ہی کسی افسانہ نگار نے افسانہ نگاری

بنجر پتھریلی دھرتی میں بیج بوئے، کھیتی کاٹی اور اس فصل کے

بونے پر اپنی پیاسی سانسوں سے آبیاری کی ہے، تو وہ موہن یاور ہے۔"

جگدیش کمل جموں کے ایک اور اہل قلم ہیں جو فلموں کے لئے بھی کہانیاں

لکھتے ہیں، ان کی کہانیاں "گیٹ وے آف انڈیا"، "کنھیا" "لاٹ صاحب"

فلم میں بہت مقبول ہوئیں۔ تصنیف و تالیف کا بھی انھیں شوق ہے۔

اختر محی الدین، کشمیر کے مشہور افسانہ نگار، اپنے اور بہت سے معاصرین

کی طرح ابتدا میں اردو میں لکھتے تھے۔ افسانہ اور تنقید ان کے خاص موضوع

رہے ہے۔ ان کی ملازمت کی ابتدا کلچرل اکادمی میں ہوئی تھی،[1] لیکن بعد

میں فیلڈ پبلی سٹی کے محکمے میں منتقل ہو گئے اور اسی محکمے میں برسر خدمت

ہیں۔ ان کی کئی کہانیاں رسالوں میں شائع ہو چکی ہیں، جن میں سے

کچھ خود انھیں کی لکھی ہوئی کشمیری کہانیوں کے ترجمے ہیں۔ نئے فنی شعور،

سماجی احساس اور زندگی کی حقیقی قدروں کی جھلک ان کے ان ابتدائی

افسانوں میں بھی ملتی ہے، جو اردو میں لکھے گئے ہیں۔ ان کے انداز بیان

اور مسائل کی پیش کشی میں بھی، موجودہ عہد کی خصوصیات ملتی ہیں۔

ان کا ایک افسانہ جو "رات مر گئی" کے عنوان سے لکھا گیا ہے کلچرل کانفرنس

کے دو ماہی رسالے "کونگ پوش" کے ایک شمارہ میں شائع ہوا تھا۔

افسانہ ایک رمز یہ انداز رکھتا ہے جس میں رات کو ایک باغ میں الوؤں

کی اودھم، بلبلوں اور کوئلوں اور دوسرے پرندوں کا سہما ہوا انداز،

رات کے ختم ہونے اور پو پھٹنے تک بڑی خوبی سے پیش کیا گیا ہے۔

ایک اقتباس ہے :-

"دم توڑتی ہوئی رات کا اندھیرا، زیادہ گہرا اور گھنا و نا ہو گیا تھا،

[1] اختر کی سرکاری ملازمت ابھی سے شروع ہوئی

اور بھی گہری اور گھناونی تاریکی باغ پر اس طرح مسلط تھی، جس طرح کفن اوڑھی ہوئی لاش پر تابوت کے اندھیرے مسلط ہوتے ہیں۔ پودوں کی ڈالیاں مردہ جسموں کی طرح اکڑی ہوئی تھیں، کلیوں کا سیاہ چہرہ منحوس اور مغموم نظر آتا تھا۔۔ اگر کوئی اُلّو کسی چڑیا، بُلبل یا کویل کے گھونسلے میں سے ایک دو بچے اٹھانے کیلئے درخت کی ٹہنی پر بیٹھنے کی کوشش کرتا تو اس کے بوجھ کے نیچے ٹہنی چٹخ کر ٹوٹ جاتی اور گھونسلے کے ساتھ زمین پر آرہتی۔"

ایک اور اچھا افسانہ "ظاہر باطن" جو کشمیری سے ترجمہ ہے "شیرازہ" کے شمارہ مئی ۱۹۶۲ء میں شائع ہوا تھا۔ اس افسانے میں خیال کی رو کا سا ایک شائبہ ملتا ہے۔ شاعر کے ذہن میں جو نقوش یکے بعد دیگرے اُبھرتے ہیں، ان کی عکاسی کاغذ پر نظر آتی ہے۔ ایک برات کا جلوس، کتّوں کی بھوں بھوں، بچّے کا رونا، اس کے ساتھ ساتھ پس منظر میں ڈاروِن کے نظریہ کا شعور، اور خاص طور پر اس افسانے کا اسلوب آج سے پہلے کے ادب لطیف کے انشاپردازوں کے اسلوب سے بہت ملتا جلتا ہے۔ "چھلاوا" ان کا ایک اچھا افسانہ ہے اور فن اسلوب دونوں اعتبار سے ان کی ترقی یافتہ تخلیق ہے۔ افسانہ فطرتاً کشمیر کی زندگی کے موضوع پر ہے۔ وادی میں برف باری کے منظر کا حسن اس کا آغاز ہے:

"باہر حد نظر تک برف کی ایک سفید چادر پھیلی ہوئی تھی، گھنے بادلوں سے چھوٹے چھوٹے لاتعداد کپڑوں کی مانند برف گر رہی تھی۔ آس پاس کے درختوں پر برف کے شگوفے لگ گئے تھے اوپر پہاڑ کی چوٹیاں بادل اور دھند میں چھپی ہوئی تھیں اور نیچے

وادی دھند میں غائب تھی۔"

ایک نوجوان گوجر اعظم خان گرتی ہوئی برف میں گاؤں سے قصبے تک ضرورت کی چیزیں لینے کے لئے جاتا ہے۔ واپسی میں برف کی وجہ سے راستہ بھٹک جاتا، اور اسی گردش میں چور چور ہوکر گر پڑتا ہے اور اس کی برفانی تہ بن جاتی ہے۔ افسانے میں بڑا طنز ہے۔ صبح جب اس کا دوست سرفراز خان اور اس کی ماں اس کو پاتے ہیں تو ماں پر غم و رنج کی بجلی گر پڑتی ہے، لیکن سرفراز خان اس کی لوئی سے سامان کھول کر خوشی خوشی گھر لوٹ آتا ہے کہ سرما کے لئے کچھ آذوقہ فراہم ہوگیا۔

اختر کے تنقیدی جائزے بھی رسالوں میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ "کشمیری لوک ادب" پر ان کا مضمون "شیرازہ" میں شائع ہوا تھا۔ ایک جائزہ رسا جاودانی کی کشمیری شاعری کے بارے میں اسی رسالے میں شائع ہوا ہے۔ اس میں رسا کی غزل کے موضوعات اور ان کے فنی حسن پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"اگرچہ رسا نے روایتی انداز میں غزلیں کہی ہیں، لیکن ان میں اپنی ذاتی واردات اور تجربات کا نچوڑ پیش کیا ہے۔ یہ ایک اہم فنکارانہ خوبی ہے۔ عشق و عاشقی کی باتیں ہزاروں سال پرانی سہی، لیکن ان سے متعلق ہر فرد کے تجربات کسی حد تک مختلف اور اچھوتے ہوتے ہیں، کیونکہ اس خاص فرد کا ایک خاص ماحول اور ایک خاص تاریخی دور میں اپنی طبیعت کی افتاد کے مطابق مختلف رد عمل ہوتا ہے اور اگر ایک فنکار خلوص اور نیک نیتی سے اپنے خاص رد عمل کو موضوع بنائے تو واقعی نئی بات بنتی ہے۔"

کشوری منچندہ، پرتاپ گڑھ، جموں کے رہنے والے ہیں۔ اصلی نام کشوری لال ہے، لیکن اشتراکی رجحان نے عجیب طرح پر "لال" کو "لعل" سے خلط ملط کر دیا۔ اب الفبیں "لعل" کے ساتھ "لال" سے بھی بیبر ہے، حالانکہ یہ اشتراکیت کی علامت تھی۔ ان کی ولادت جموں کے متوسط خاندان کے ایک خوشحال گھرانے میں ۱۹۲۹ء میں ہوئی۔ تعلیم جموں میں ہی ہیں پائی اور ۱۹۴۷ء میں پنجاب یونیورسٹی سے میٹرک کا امتحان کامیاب کیا۔ ۱۹۴۷ء کے بعد حالات نے ان کی خاندانی معیشت پر بُرا اثر ڈالا، اور وہ سکول میں مدرسی اختیار کرنے پر مجبور ہو گئے اور بعد میں کشمیر یونیورسٹی سے انٹرمیڈیٹ اور ادیب فاضل کے امتحانات کامیاب کئے۔

افسانہ نگاری کا شوق منچندہ کو زمانہ طالب علمی ہی سے رہا۔ ان کے ابتدائی افسانے "قلم آرٹ" دہلی "سویرا" اور "تیتیج" میں شائع ہوتے رہے۔ نوجوان افسانہ نگاروں کی تخلیقات کے منتخب مجموعے "حوا کی بیٹیاں" میں ان کا افسانہ "ساحرہ" اور بزم فروغ اردو کے منتخب مجموعے "منتخب ادب" میں "سپاہی" شائع ہوئے۔ کلچرل اکادمی کے رسالوں میں بھی ان کے افسانے شایع ہوتے رہتے ہیں۔

منچندہ کے افسانوں کا پہلا مجموعہ "اور بھی غم ہیں محبت کے سوا" کے عنوان سے ۱۹۶۷ء میں مرتب ہوا، جس میں چھ افسانے "اور بھی غم ہیں..." "بھوک" "پجاری جی" "شکست آرزو" "سچا سودا" "سپاہی" افسانوں میں فنی اعتبار سے ابھی پختگی نہیں آئی، تاہم انھیں نئے نئے موضوعات کی تلاش رہتی ہے۔ "بھوک" ایک سکول ماسٹر کی کہانی ہے، جو افسانہ نگار بھی ہے، ایک بس میں سفر کرتے ہوئے، وہ بھوک کی شدت میں گلاب کی پتیاں چباتا جاتا ہے۔ اس کے بعد کے واقعات غیر متوقع ہیں۔ "مجموعے" کا نام جس افسانے پر رکھا گیا ہے، چند دوست لڑکے اور لڑکیوں کے

پک نک منانے کے لیئے جانے کا واقعہ ہے، ایک لڑکی رجنی ندی میں کود پڑتی ہے، رمیش اسے نکالتا ہے اور یہی تعلق دونوں میں باہمی محبت کے آغاز کا سبب بن جاتا ہے۔ لیکن رجنی کا باپ اس کے بیاہ کی بات چیت ایک مالدار نوجوان لندھیر سے طے کرتا ہے اور رجنی کو مفلوک الحال رمیش سے شادی کرنے کے اونچ نیچ سمجھاتا ہے۔ رجنی کی محبت پر مآل اندیشی غالب آجاتی ہے، اور وہ رندھیر سے شادی کرنے پر آمادہ ہو جاتی ہے۔

منجیدہ شعر بھی کہتے ہیں اور غزلوں، رباعیات وغیرہ کا کافی ذخیرہ ان کے پاس فراہم ہو گیا ہے۔ کچھ نظمیں رسالوں میں شائع ہوئی ہیں۔

یوسف منتظر جو سری نگر میں ایک سکول کے مدرس ہیں، شعروادب سے گہری دلچسپی رکھتے ہیں۔ ان کی ولادت سنہ ۱۹۳۱ء ہے۔ ایم۔ اے اور بی۔ ٹی کے امتحان پاس کر چکے ہیں۔ شعر اردو اور کشمیری دونوں زبانوں میں کہہ لیتے ہیں۔ ان کے افسانے اور مضامین رسالوں میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ اپنی تخلیقات کا ایک مجموعہ بھی انھوں نے "تخلیقات منتظر" کے عنوان سے مرتب کیا ہے۔ جسمیں کچھ کشمیری کلام، اردو کی ایک غزل، مضامین اور افسانے شامل ہیں، افسانے بیس کے قریب ہیں، جن کے عنوان ہیں:۔

"عزیز کون" "صراحی ٹوٹ گئی" "کیریکٹر سرٹی فیکیٹ" ایک افسانہ "عشق پر زور نہیں" غلط فہمی، ہنی مون، ان کی یاد، کل اور آج، پس پردہ، نیک ٹائی، یخ بستہ ڈل جھیل، خاکہ، چائے، چلو بیس، راہ چلتے چلتے، ادھورے سپنے، غلط راستہ، واپسی۔

افسانہ کہنے کا انھیں اچھا سلیقہ ہے، اور اکثر افسانوں کا موضوع کشمیر کی زندگی ہے، اور رومان ان افسانوں میں گھسا ہوا ہے۔ یخ بستہ ڈل میں

میں شکاروں کے جلانے کا منظر انجم اپنے محبوب کو لکھتی ہے :-

"کشمیر کی وہ بہاریں جو آدمی کو تڑپاتی ہیں، جاڑے میں بالکل ویران پڑ گئی ہیں لیکن ڈل جھیل کا منظر دیکھنے سے انسان سب کچھ بھول جاتا ہے۔ اس کے علاوہ ایک اور نئی چیز دیکھنے میں آئی کہ کچھ لوگ اپنے ہاتھوں سے چھوٹی کشتیوں کو دھکیلتے ہیں۔ لوگ کشتیوں میں بیٹھ کر ڈل کی سیر کرتے تھے، لیکن آج تو کشتیاں ہی آدمیوں پر بیٹھ کر ڈل کی سیر کرتی ہیں۔"

منتظر کے مضامین عام دلچسپی کے عنوانات پر اور کچھ تعلیم سے متعلق ہیں۔ ایک دو مضامین تنقیدی جائزے بھی ہیں جن میں "معجزۂ فن کی ہے خون جگر سے نمود" اچھا مطالعہ ہے۔ اس میں فن کی ماہیت اور اس کے اثر سے بحث بحث کی ہے اور فنکار کے لئے راہ عمل متعین کرنے کی کوشش کی ہے کہ :-

"یہ بات فنکار کے لئے لازم ہے کہ وہ اپنی انفرادیت حیثیت کو قوم کی اجتماعیت میں مدغم کرے، وہ سماج کے ساتھ گھل مل جائے سماج کی ترجمانی کرے۔ فن اجتماعی ہے، انفرادی نہیں ہے۔ ان کی غزل کے دو شعر ہیں :-

قسم تجھ کو ہے معصوم و حسین نازک اداؤں کی کہ مجھ پر کیا گذرتی ہے ذرا تو پاس آ کر دیکھ
مگر کیا کیا کروں اور فلک کا شوم بختی کا کبھی اٹھ کر یہ کھڑا ہو کر گرا پھر مڑ کر دیکھ

پشکر ناتھ نکو، افسانے لکھ رہے ہیں، اور ایک ناول "دشت تمنا" کے نام سے لکھا ہے۔ وہ ۱۹۳۲ء میں جموں و کشمیر یونیورسٹی سے بی، اے کا امتحان کامیاب کیا۔ اب اکاؤنٹنٹ جنرل کی محکمے میں ملازم اور جموں میں متعین ہیں۔ پشکر ناتھ نے کئی افسانے لکھے ہیں۔ ایک مجموعہ "اندھیرے اُجالے" پر کلچرل اکادمی سے ۱۹۶۲ء پہلا ادبی انعام بھی عطا ہوا۔ اس مجموعے کے

افسانوں کے علاوہ بھی کئی افسانے رسالوں میں شائع ہوئے ہیں۔ بلکہ کلچرل اکادمی کے رسالے اور "ہمارا ادب" کے وہ باضابطگی کے ساتھ لکھنے والوں میں سے ہیں۔ ان کے کچھ افسانوں کے عنوانات ہیں :۔

'موت کا سوداگر' 'رازدل' 'پردہ نشین' 'گالی' 'نروان' 'انتقام' 'جاہل کمینے' 'اندھیرے اُجالے'۔ پشکرناتھ کے افسانوں کا محرک کشمیر کی زندگی اور اس کی حسین فضائیں ہیں، لیکن وہ فطرت کے ان حسین مناظر کے درمیان، عوام کی غربت اور ان کا افلاس ایک تضاد ہے، جس کے نقوش وہ بڑی جانکاری کے ساتھ ابھارتے ہیں۔ "جاہل کمینے" کے واقعات گلمرگ سے تعلق رکھتے ہیں، جو اپنے حسن اور دلکشی کی وجہ سے دنیا کے سیاحوں کی آماجگاہ ہے، لیکن اس کے افراد حمدو، خدیجی، نوری اور اس کا مریض بچہ فطرت اور سماج کے تضاد کا ایک نمونہ ہے۔ "موت کا سوداگر" ان کے نمائندہ افسانوں میں شمار ہوسکتا ہے۔ یہ افسانہ ایک بدمعاش کاہن سنگھ کی داستان ہے، جو بعد میں تائب ہوجاتا ہے۔ پشکرناتھ نے اس کے عمل اور کردار کو بڑی خوبی سے اٹھایا ہے۔ لڑکے سے محبت اس کا مرکزی موضوع ہے، جس نے بدمعاش کو ایک ہوٹل کے ہیڈ ویٹر کا خون کرنے سے باز رکھا اور اس کے معاوضہ سے جو دو ہزار روپیوں کی صورت میں سیٹھ گجانند اسے پیش کر رہا تھا، اس سے محروم۔ کہانی میں کئی دلکش لمحے بھی آتے ہیں۔ مثلاً کاہن سنگھ، اپنا چھرا نکال کر رام لال پر وار کرنا چاہتا تھا کہ دروازے کے اندر سے اس کے لڑکے کی "بابا، بابا" کی آواز نے اس میں انسانی ہمدردی کو جگا دیا۔ اظہار کا حسن بھی اس افسانے کو پڑھنے کی چیز بنا رہا ہے۔ مثلاً کاہن سنگھ جب سیٹھ گجانند کا روپیہ لوٹانے جا رہا تھا :۔ "پہلے وہ اندھیرے میں کچھ لانے جاتا تھا، مگر آج وہ کچھ دینے جا رہا تھا۔"

"رازِ دل" ایک نفسیاتی الجھن کا افسانہ ہے۔ گوبند ولبھ اپنے دوست کے ساتھ سینما جاتا ہے۔ سینما میں اس کے پیر کو کوئی چیز کاٹتی ہے، اسے شُبہ ہوتا ہے کہ اسے سانپ نے ڈسا ہے۔ اس خیال کے ساتھ ہی اس پر ایسی مردنی چھا جاتی ہے کہ اپنے ساتھی کو وہ ہسپتال لے چلنے کو کہتا ہے اور راستے میں اپنی زندگی سے مایوس ہوکر، کچھ ضروری راز جو اس نے دل میں چھپا رکھے تھے، اپنے دوست سے کہہ دیتا ہے، لیکن ہسپتال پہنچنے پر جب ڈاکٹر اسے یہ بتاتا ہے کہ اس کے پیر کو سانپ نے نہیں، چوہے نے کاٹا ہے، تو ایک سخت نفسیاتی الجھن کا شکار ہو جاتا ہے کہ دوست کو راز کیوں بتائے، اور اب اس کے دل میں دوست سے بدگمانی اور پھر اس سے دشمنی پیدا ہو جاتی ہے۔ کہانی میں سوائے اس سقم کے کہ چوہے کے پیر کو کاٹنے کا شائبہ دور کا ہے، کہانی اچھے اسلوب سے فنّی رچاؤ کے ساتھ کہی گئی ہے۔ دونوں میں بدگمانی کے آغاز کا وہ نقشہ خوبی سے کھینچتے ہیں۔ ایک ریسٹوران میں ان کی مڈ بھیڑ ہوتی ہے۔ گوبند ولبھ کے دل میں یہ خیالات گذرتے ہیں:۔

"وہ آدمی جو اُس کونے والی میز پر بیٹھا ہے ۔۔۔۔ یہ آدمی کل شام تک میرا دوست تھا، بہترین دوست تھا، مگر آج یہ آدمی مجھے بدترین دُشمن سمجھتا ہے۔"

پشکر ناتھ کا ایک اور اچھا افسانہ "پردہ نشین" ہمارا ادب (سنہ ۱۹۵۹ء) میں شائع ہوا تھا، اور یہ بعض اعتبارات سے ان کے بہترین افسانوں میں شُمار کیا جا سکتا ہے۔ اس میں شعوری رو کا شائبہ، زینب کے بھٹکتے ہوئے انداز مطالعہ میں نمایاں ہے۔ وہ کتاب پڑھ رہی ہے۔ امتحان کو صرف بیس دن باقی رہ گئے ہیں۔ باہر موسلا دھار بارش ہو رہی ہے۔

زینب تاریخ ھند رٹنا چاہتی ہے :-

"نورجہاں کا اصلی نام مہرالنسأ تھا" مگر یہ بارش تو تھمنے کا نام نہیں لیتی۔ سوال دھرا یا نہیں جاتا اور ابھی اس مسخرے کا باپ آتا ہوگا۔ کیسا بے ڈھنگا آدمی ہے وہ بھی۔ بارش کے قطرے نہ ہوئے، موسیقی کی لہر ہوگئی ۔" "نورجہاں کی شادی شیرافگن سے ہوگئی۔ شیرافگن یعنی شیر کو مارنے والا۔ بڑا ہی لڑاکو ہوگا پھر تو۔ اللہ جانے نورجہاں کو اس سے محبت تھی یا نہیں .."

یہ زینب کا مطالعہ ہے اور بھٹکتے خیالات کی یہ رو نہیں تیز چلتی ہے۔ پشکرناتھ سلیس انداز میں جو گھلاوٹ ہے اسکا شائبہ اس جملے سے ملتا ہے لکھتے ہیں :-

"بس سوچنے لگتی ہوں تو سوچ ہی چلی جاتی ہوں، ادھر ادھر کی باتیں" -

پشکرناتھ کی کہانیوں کا مجموعہ "اندھیرے اجالے" شائع ہو چکا ہے۔ جسے ریاستی کلچرل اکادمی کا ۱۹۶۲ء کا پہلا انعام عطا ہوا تھا۔ ایک ناول "دشت تمنا" بھی ان کی تصنیف ہے۔

اُمیش کول، متنوع صلاحیتوں کے مالک ہیں، اور اردو اور کشمیری دونوں زبانوں میں کہانیاں، ڈرامے، مضامین لکھ رہے ہیں۔ مصوری میں بھی انھیں رسائی حاصل ہے۔ صحافت اور تھیٹر سے بھی وہ وابستہ رہے۔ اس وقت ریڈیو کشمیر سری نگر میں اسکرپٹ رائٹر کی خدمت پر مامور ہیں۔ امیش کی ولادت، سرینگر کے ایک پنڈت گھرانے میں ۱۹۳۲ء میں ہوئی۔ تعلیم یہیں حاصل کی۔ اور بی۔ اے کا امتحان کامیاب کیا اس کے بعد عملی

زندگی میں داخل ہو گئے ... ثقافتی تحریکوں کے ساتھ انھیں

گہری وابستگی رہی۔ اردو اور کشمیری میں ان کی کہانیاں، مختصر ڈرامے اور اخباروں اور رسالوں میں شایع ہوتے رہے ہیں، اور ریڈیو سے نشر بھی کیے جاتے ہیں۔ کچھ مختصر دستاویزی فلم بھی اُنہوں نے تیار کیے ہیں۔

اردو میں ان کا پہلا افسانہ "یاقوت" جو ۱۹۵۳ء میں کلچرل فرنٹ کے رسالے "کونگ پوش" میں شائع ہوا، معاصر نقادوں کی توجہ کو اپنی طرف منعطف کرنے کا باعث ہوا۔ اس کے بعد وہ خود اعتمادی کے ساتھ لکھتے رہے۔ مصوّری میں ان کی دلچسپی اور تربیت کی بدولت افسانوں اور ڈراموں میں تخلیقی حسن میں انھیں بڑی مدد ملی۔

امبش کے چھوٹے بھائی، ہردے کول بھارتی، بھی افسانے اور ڈرامے لکھتے ہیں۔ ہردے کول اس وقت آل انڈیا ریڈیو، دہلی میں کشمیری شعبہ میں نیوز اناونسر کی خدمت انجام دے رہے ہیں۔ کلچرل کانگریس کے شعبہ ینگ رائٹرز ایسوسی ایشن سے ان کا گہرا تعلق رہا۔ دیپک کول، جن کا ذکر کیا گیا، اس کے سکریٹری تھے۔ "سراب" ہردے کول کا ایک اچھا افسانہ ہے، جو "ہمارا ادب" (۱۹۵۹ء) میں شایع ہوا ہے۔ یہ ایک بیانیہ تفکّر ہے، جس میں کہانی کم اور خیال کی کارفرمائی زیادہ ہے۔ سرابوں کی کھوج کا دلدادہ، معصوم اپنی کھڑکی کے سامنے کی اونچی دیوار کے اس پار ایک حسین وادی کے سپنے دیکھتا ہے:۔

"جہاں اُجلے دن تھے، سہانی راتیں، پھول تھے، کلیاں تھیں،
شہد کے چھتے تھے، اور ہر صبح بادۂ گلرنگ کی طرح دمکتی ہے
اور ساری دنیا پر ایک نشہ سا چھا جاتا ہے، جہاں کسی کے ماتھے
پر سلوٹ نہیں، کسی کے دل پر داغ نہیں اور کوئی جسم ننگا نہیں...."

ایک رات طوفانی بارش نے اس دیوار کو ڈھا دیا اور صبح معصوم کی

نظروں نے دیکھا کہ وہاں ایک ٹوٹا قبرستان ہے!

غلام مصطفےٰ مغل، ٹیٹوال کرناہ کے متوطن، جو ریاست میں نائب تحصیلدار کے عہدہ پر مامور ہیں۔ کہانیاں اور مضامین اور خاص طور پر مزاحیہ مضامین لکھتے ہیں اور عموماً "پنچھی" کے قلمی نام سے۔ ان کی پیدائش کا سال ۱۹۳۲ء ہے۔ تعلیم انھوں نے مظفر آباد میں پائی اور تعلیم ختم کرنے کے بعد محکمہ مال میں ملازم ہو گئے۔ مضمون لکھنے کا شوق انھیں بچپن سے ہے اور اکثر اخباروں اور رسالوں میں مضامین اور کہانیاں لکھتے ہیں۔ ان کے کچھ افسانے "ہمدرد" (سرینگر) اور "نئی دنیا" دہلی میں شائع ہوئے ہیں۔ افسانوں میں "مشترکہ قبر"، "گھونگھٹ" "چندا ماموں کو سلام"، "وہ میرا قلم"۔ اور مضامین مصطفےٰ کمال، الجزائری مجاہد، نیلی وادی، قابلِ ذکر ہیں۔ "مشترکہ قبر" ریاست کے پہاڑی سلسلوں کے پس منظر میں لکھا ہوا، ایک اچھا رومانی افسانہ ہے۔ سلیم اور شیلا دو محبت کرنے والوں کے درمیان مذہب یا سماج یا دونوں کی دیواریں حایل ہوتی ہیں، جن کا ڈھانا ممکن نہیں، نتیجہ جو ایسی کہانیوں میں ہونا چاہئے، دونوں کی خودکشی ہے۔ افسانے میں کئی اچھے موقعت آتے ہیں مثلاً یہ پارہ :-

"دنیا اور دنیا کے مکر و فریب اور جھوٹے سماجی بندھنوں سے بہت دور نکل کر وہ چھوٹی چھوٹی خوبصورت پہاڑیوں اور سبزہ زاروں میں اپنی روحوں کا ایک لازوال مقصد ــــ ملاپ لے کر گھومتے۔"

شوپیان کے ایک مولوی کا مزاحیہ خاکہ ان کے اچھے خاکوں میں سے ہے۔ یہ یہ مولوی تبلیغ کے طریقوں میں اپنی نوعیت کا ایک ہی تھا اور راستہ چلتے افسروں کو

پکڑ پکڑ کر داڑھی رکھنے کی سنت پر عمل کرنے کی تلقین کرتا۔ لوگ ان سے بیزار تھے اور 'ڈُنڈھ مولوی' اس کا نام رکھا تھا۔ ایک عہدہ دار سے مونچھیں ترشوانے پر مولوی کی بحث و تکرار تھی، اس نے مولوی کو ایک اور راہ اور شاید دلچسپ راہ پر ڈال دیا۔ اس نے

"مولوی صاحب کو اس بات پر آمادہ کر لیا کہ آپ یہاں کی استانیوں سے چست لباس ترک کروائیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مولوی صاحب تب سے روز گرلز ہائی سکول، ٹی۔ ٹی اسکول اور دیگر راستہ چلنے والی اُستانیوں کے قافلوں کو روز تبلیغ کرتے ہیں۔ اگر ڈُنڈھ مولوی کامیاب ہو گئے تو ہمارے دوست کو مونچھیں ترشوانی پڑیں گی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مگر امید نہیں کیونکہ عورت کی ذات حضرت آدمؑ کی ٹیڑھی پسلی سے پیدا کی گئی ہے ۔ ۔ ۔ ۔"

دیپک کول، جن کا اصلی نام موتی لال کول ہے، سرینگر کے ایک پنڈت خاندان کے چشم و چراغ ہیں۔ انھوں نے کہانیاں لکھی ہیں، اور ان کی کئی کہانیاں ریڈیو کشمیر سرینگر سے نشر بھی ہوتی رہی ہیں۔ کچھ کہانیوں میں اُنھوں نے نئی تکنیک استعمال کرنے کی بھی کوشش کی ہے۔ "کل رات کی بات"، ان کی ایک کہانی "کونگ پوش" (جون ۱۹۵۴ء) میں چھپی تھی، جس میں ایک کردار اور ایک چھایا کردار ہے۔ لکھنؤ کی مال روڈ پر یہ دونوں کشمیری دوست ملتے ہیں۔ کردار، چھایا کردار سے تنہا گفتاری کرتا، حضرت گنج اور نہ جانے کہاں کہاں سے گذرتا ہے۔ جب اسے وہ ہاسٹل پہنچاتا ہے تو کہتا ہے:-

"اب رات بہت آچکی ہے، تمہیں نیند آتی ہے، مگر تم کچھ سوچ رہے ہو، کیا سوچ رہے ہو ۔ ۔ ۔ ۔ کیا ہے

جیسے تم دکھانا چاہتے ہو، اوہ، سمجھا، تمہارا ماضی، ارے میرے
پاگل دوست تمہارا ماضی صرف ماضی ہے۔ اسے اپنا حال
بنانے کی کوشش نہ کرو، تمہارا مستقبل کتنی اور کہاں کہاں لئے
تمہارا انتظار کر رہا ہے۔"

"اور گدھ ڈوب گیا" دیپک کی ایک اور اچھی کہانی ہے۔

دیوراج چوپڑہ، جو کرن کشمیری کے نام سے سمجھتے ہیں۔ جموں کے متوطن ہیں۔
ان کی ولادت ۱۹۳۴ء میں ہوئی، تعلیم انھوں نے جموں، پنجاب اور دہلی میں
حاصل کی۔ بی۔ اے پنجاب سے کیا، اور اس کے بعد ماہنامہ "جیتدن" کے مدیر
معاون کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ کچھ عرصہ اخبار "ملاپ" میں بھی کام کیا۔
پھر ۱۹۵۳ء میں خود اپنا رسالہ "سنگم" جاری کیا، جب وہ بند ہو گیا تو آل انڈیا
ریڈیو میں ملازمت کر لی۔ آج کل وہ وزارت دفاع کے محکمے میں کام کر رہے
ہیں۔ افسانہ نگاری کا شوق انھیں ۱۹۵۱ء سے ہوا۔ انھوں نے زیادہ نہیں لکھا
ہے، تاہم جتنے افسانے لکھے ہیں، ان سے زندگی کے بارے میں ان کے مخصوص
نقطۂ نظر اور فن کی واقفیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ سماجی مسائل سے بھی نبرد آزما
ہونے کی کوشش کرتے ہیں۔ ادب کی افادیت اور افسانہ زندگی کا ترجمان ہونے
پر وہ بہت زور دیتے ہیں۔ ان کا ایک اچھا افسانہ "تنہا درخت"
جو "شاعر" (بمبئی) میں شائع ہوا ہے، ان کے رجحانات کا نمائندہ افسانہ ہے۔

کرن نے ایک ناول "خوابوں کے قافلے" کے نام سے لکھا ہے، جو شائع
ہو چکا ہے۔ شعر و سخن سے بھی انھیں لگاؤ ہے، چنانچہ اپنے کلام کا ایک
مجموعہ ترتیب دیا ہے، جو ابھی شائع نہیں ہوا۔

اکبر لداخی، لداخ کے اردو لکھنے والوں میں اپنے ذوق اور رجحانات کے بدولت

بہت ممتاز ہیں۔ ان کے والد لداخ میں کاروبار کرتے ہیں، اور خاندان مرفہ الحال ہے۔ کوشک بکولا جو عرصہ تک ریاست کے وزیر رہے اور اب پارلیمنٹ کے رکن ہیں، اکبر کے رشتہ دار ہوتے ہیں تعلیم انھوں نے سرینگر میں اور باہر بھی حاصل کی۔ ترقی پسند ادبی تحریک سے ان کا گہرا تعلق رہا، اور وہ اس تحریک کے لئے ریاست میں کام کرتے رہے۔ تعلیم کے ختم کے بعد کچھ عرصہ ریڈیو میں ملازمت کی۔ پھر کلچرل اکادمی میں کارگذار رہے۔ وزیر اعلیٰ کے ایڈیشنل پی، اے کی حیثیت سے بھی انھوں نے کام کیا۔ سب ڈویژنل مجسٹریٹ کے عہدے پر بھی فائز رہے۔ اور اسوقت فیملی پلاننگ میں ایڈمنسٹریٹو افسر ہیں [1]

اکبر ادب کا ستھرا ذوق رکھتے ہیں۔ افسانے اور مضامین بھی انھوں نے لکھے ہیں۔ ان کا افسانہ "داغ" بہت مقبول ہوا، اور اس افسانے کی وجہ سے ان کی شہرت بھی ہوئی۔ "کونگ پوشں" کے لئے بھی وہ لکھتے تھے۔ چنانچہ اس کے پہلے شمارہ (جون سنہ ۱۹۵۴ء) کے لئے انھوں نے لداخی لوک گیت کا تعارف مرتب کیا ہے۔ یہ اس دور دراز سرزمین کے بارے میں قیمتی معلومات آفرین مضمون ہے، جس سے لداخ کی سرزمین، موسم، مزاج اور لداخی کے ادبی انداز اظہار کے بارے میں قیمتی معلومات فراہم ہوتی ہیں۔ لداخ کے موسم کے بارے میں لکھتے ہیں :-

"لداخ میں مشکل سے چار یا پنج مہینے سورج چمکتا ہے اور باقی مہینوں میں وہی کالے بادل اور بے کیف سرد موسم چھایا رہتا ہے"۔

اسی لئے "مشرق سے ابھرنے والے سورج کی کرنیں جب ان کی جنم بھومی کو گرماتے آتی ہیں، ایک لوک گیت کی ابتدا ہوتی ہے :-

[1] اکبر سے بات چیت سے ماخوذ

ابھرتے ہوئے سورج کے لیئے دروازے کھول دو

بادلوں پر تیروں کی بوچھار کر لو

کالے اور ڈراونے بادل کا سر توڑ دو

اکبر نے اس پر روشنی ڈالی ہے کہ موسم کے اسی انوکھے پن نے اور مقامی حالات اور گرد وپیش نے لداخیوں کے عشق کو بھی ایک مخصوص رنگ روپ دے دیا ہے۔

اس مخصوص رنگ روپ کی عمدہ مثال لداخی لوک گیتوں میں عشق و محبت کی وار داتوں کو ظاہر کرنے کے لیئے جو استعارے اور علامتیں استعمال کی جاتی ہیں، وہ بھی ندرت رکھتی ہیں۔ اکبر لکھتے ہیں کہ لداخی لوک گیتوں میں "معشوق کا دل پتھر کی بجائے گلیشر ہے"

اور اس کی وضاحت کے لیئے ایک لوک گیت کا حسب ذیل اقتباس پیش کیا ہے۔

"تمہارا دل ایک گلیشیر ہے

اگر ایسے ہی رہا اور بدلنے نہ پایا

میرا دل سورج اور چاند

پرانی ریت ہے کہ چاند اور سورج گلیشیر پر چمکتے ہیں۔

رومانی انداز کے گیتوں میں عقل و دانائی کے جو اشارے ملتے ہیں، ان کی یہ عمدہ مثال پیش کی ہے:۔

پردیسی کیا ہے؟ ایک بہتا دریا

جو رُکے جھکے بغیر اپنی راہ لیتا ہے

اور دیسی تو پہاڑ ہے

نہ ہلتا ہے نہ ٹلتا ہے

لوک گیتوں پر اکبر کی مجموعی تنقید یہ ہے کہ :-

"اپنے مخصوص جغرافیائی اور سماجی حالات کی موجودگی میں لداخ کے لوک گیتوں کو وہ آن بان اور رنگ روپ ملا ہے جو منفرد بھی ہے اور متنوع بھی، جو شاندار بھی ہے اور جان دار بھی۔ باقی دنیا سے الگ تھلگ، اس ملک کا کلچر، اپنی ایک انفرادیت لئے ہوئے اور اس کلچر کی پوری عکاسی لداخ کے لوک گیتوں میں ملتی ہے۔"

برج کشن ایمہ، جو "برج پریمی" کے نام سے لکھتے ہیں۔ شیام لال ایمہ کے فرزند ہیں، جن کے حالات گذشتہ ایک باب میں دئے جا چکے ہیں۔ برج کشن ۱۹۳۵ء میں پیدا ہوئے۔ سرینگر میں تعلیم پائی اور جموں و کشمیر یونیورسٹی اردو ایم، اے کا امتحان کامیاب کیا۔ اب وہ محکمہ تعلیم میں ملازم ہیں[1]۔ ۱۹۵۰ء سے وہ افسانے لکھنے لگے۔ ان کی پہلی کہانی "آقا" "امر جیوتی" میں شائع ہوئی تھی۔ اس کے بعد جو کہانیاں انھوں نے لکھیں، وہ "بیسویں صدی" (دہلی) "راہی" (جالندھر) "مصور" (پٹنہ) "پگڈنڈی" (امرتسر) "استاد" (سرینگر) اور "جیوتی" میں شائع ہوئیں۔ برج کشن افسانوں میں کشمیر کی زندگی کو پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں، لیکن کشمیری پس منظر ان میں زیادہ نمایاں نہیں۔ ان کی ایک کہانی "ہنسی کی موت" جو ماہنامہ "شعلہ و شبنم" (جون ۱۹۵۶ء) میں شائع ہوئی تھی، ایک پڑھی لکھی ترقی پسند لڑکی اور اس کے دق زدہ شوہر کی کہانی ہے، "جو شہر کے مشینی نظام" سے دور شاید مانسبل جھیل کے قریب کسی گاؤں میں زندگی گذارنے آئے تھے۔ شوہر ایک دکان میں منشی کی ملازمت قبول کر لیتا ہے، اور بیوی

[1] وہ اب شعبہ اردو کشمیر یونیورسٹی میں لیکچرار ہیں

دن دھاڑے خواب دیکھنے والی، خوش آیند مستقبل کے خواب دیکھتے دیکھتے خود ایک بھولا بسرا خواب بن جاتی اور قلب کی حرکت بند ہونے سے مر جاتی ہے۔

برج پریمی، بھی اپنے عہد کی ترقی پسندی سے متاثر ہیں۔ چنانچہ ان کے افسانوں میں بھی مہاجن، ٹھیکہ دار، لمبی توندوں کے ڈراونے سایے، سارے عناصر موجود ہیں۔ "میرے بچے کی سالگرہ" جو ماہنامہ "دیش" (سرینگر مارچ ۱۹۵۸ء) میں چھپا تھا، ایک نوجوان شوہر کو باپ بننے کی خبر سن کر اپنی زندگی کے ماہ وسال گذر جانے کا جو احساس ہوتا ہے، اس کا اچھا مرقع کھینچا ہے:۔

"میرا چہرہ گلنار ہوگیا تھا۔۔۔ میرے ماتھے کی معصوم شکنیں گہری ہوگئی تھیں، غم وتردد فضاؤں سے اُبل کر میرے خوبصورت چہرہ پر پھیل گیا تھا، اور یوں لگ رہا تھا، جیسے آسمانوں کے دریچے کھول کر بڑھاپا آہستہ آہستہ میرے بالوں کی اور بڑھ رہا ہے"۔

پریمی کے اور افسانے "پھٹی پھٹی آنکھیں"، "ہانسیل"، "قرض"، "اس کی موت" "لمحوں کی راکھ"، "منی کہانیاں"، "زاوے"، "راجو"، "قبا کے ایک طرف"، "یہ گیت یا مزار"، "فاشیں" بھی رسالوں میں چھپ چکے ہیں۔ "سپنوں کی شام" فضا اور موقف کے اعتبار سے پریمی کا ایک اچھا افسانہ ہے۔ اس میں کشمیر کی نکھری ہوئی فضا ملتی ہے۔ اومپورہ کے ایک سکول ٹیچر کی کہانی، جو اپنے صاحب خانہ کی لڑکی ساجھی اور اس کی سہیلی نوری کو رات میں الاؤ کے قریب بیٹھا کہانیاں سنایا کرتا تھا۔ ایک دن ساجھی جب پہاڑ کی ڈھلوان پر سے اُتر رہی تھی، بارش میں بھیگ کر مٹی کا ایک بڑا تودہ چٹان سمیت گرنے کو تھا، ماسٹر خدائی فوجدار کی طرح وہاں پہنچ گیا، اور ساجھی کو موت کے منہ سے نجات دلائی۔ اس کے بعد سے ساجھی کو اپنے نجات دہندہ سے

اُنس ہو جاتا ہے، لیکن ساجھی کی شادی سلامہ سے ہو جاتی ہے، اتفاق سے "کولہ وان"، کی رسم میں جو ندی کا زیر بند کرنے کے لئے انجام دیا جاتا ہے، سلامہ بہہ نکلتا ہے اور ساجھی اسے بچانے کے لئے جاتی اور خود لہروں کا شکار ہو جاتی ہے۔ ماسٹر صاحب جب اس کی قبر کو دیکھتا ہے تو اسکے دل میں یہ غمزدہ خیال گذرنے لگتا ہے:۔

"اومبورہ کی رہنے والی ایک حسین لڑکی کا مزار ہے، جس نے اخروٹوں اور ناشپاتیوں کے درختوں کی چھاوں میں ایک چاندنی رات مجھ سے عہد و پیمان کئے تھے اور جس کے گھنیرے بالوں میں مُنہ چُھپا کر میں نے ایک ان جانی زندگی کا خواب دیکھا تھا۔"

پریمی کا یہ افسانہ "بیسویں صدی" (مئی ۱۹۵۷ء) میں شائع ہوا تھا۔ ان کا ایک اور اچھا افسانہ "ایک بھول ایک کل" ایک غریب چپراسی کی مصیبتوں کی داستان ہے، جس کی بیوی گوری، بچہ کی ولادت کے وقت ڈاکٹر کے نہ ملنے کی وجہ سے جان بحق ہو جاتی ہے۔ کہانی ڈرامائی انداز سے کہی گئی ہے، اور اس حسرت زدہ زندگی کی کسی قدر مبالغہ آمیز تصویر ہے، جو غریبوں کے حصے میں آئی۔

پریمی "دلیش" اور "استاد" کے حلقہ ادارت میں بھی کام کر چکے ہیں۔ ادب اور اس کے بعض پہلوؤں پر ان کے مضامین بھی چھپ چکے ہیں۔ اس وقت وہ کشمیر یونیورسٹی میں پی۔ ایچ۔ ڈی کے لئے سعادت حسن منٹو، ان کی حیات اور کارناموں پر مقالہ مرتب کر رہے ہیں۔

کشمیری سکھ طبقہ کے ایک ابھرتے ہوئے لکھنے والے پریم جیت سنگھ بالی ہیں، جو کنول کشمیری کے نام سے لکھتے ہیں، اور زیادہ تر پنجابی میں لکھتے ہیں۔ ابتدا میں وہ بھی ریاست کے اور کئی نوجوان لکھنے والوں کی طرح اردو ادب لکھنے کی تربیت پاتے رہے، لیکن ریاستی اور مقامی زبانوں میں لکھنے کی تحریک کے آغاز کے ساتھ وہ بھی پنجابی کی جانب مایل ہو گئے۔ ان کی پیدایش اچھہ بل، تحصیل بیرو ہے اور سنہ پیدایش ۱۹۳۷ء۔ ان کے والد سکول ماسٹر تھے۔ کنول کشمیری نے ابتدائی تعلیم انھیں کے یہاں پائی۔ وہ لکھتے ہیں:-

"پتا جی، استاد ہونے کی وجہ سے تعلیم سے پیار رکھتے تھے، وہ مجھے ڈاکٹر یا انجینیر دیکھنا چاہتے تھے، ویسے میں پیدایشی مصور تھا ......"

ہائی سکول کی تعلیم کے زمانے میں جب وہ لکھنے کی طرف مائل ہوئے تو سکول کے ہیڈ ماسٹر پرتھوی ناتھ کھڈا اور ماسٹر گیان کرتار سنگھ سے وہ اصلاح لیتے رہے۔ رحمان راہی سے بھی وہ متاثر رہے۔ کالج میں پروفیسر اوتار سنگھ کی راہنمائی میں انھوں نے پنجابی میں لکھنا شروع کیا۔ اردو ادیبوں میں سے کنول، اقبال، پریم چند، کرشن چندر، راجیندر سنگھ بیدی، سعادت حسن منٹو اور فیض احمد فیض سے بہت متاثر ہیں۔ وہ شعر بھی کہتے ہیں اور افسانے بھی لکھتے ہیں۔

کنول نے بی، اے آنرز پنجاب یونیورسٹی سے اور ایم، اے کا امتحان تاریخ میں علی گڑھ یونیورسٹی سے کامیاب کیا۔ اور اس وقت اٹینا کے سکول کے مدرس تھے اب تحصیلدار ہیں۔ ان کی کچھ کہانیاں اور

کلام رسالوں میں شائع ہوا ہے۔ پنجابی میں وہ شعر کہتے ہیں اور افسانے اور ڈرامے بھی لکھتے ہیں۔

مالک رام آنند جو بزم فروغ اردو کے اہم رکن ہیں، جموں کے ادیبوں میں نمایاں ہیں، ادبی خدمات کا ایک وسیع پس منظر رکھتے ہیں۔ ان کا وطن پونچھ ہے، جہاں وہ سنہ ۱۹۳۹ء میں پیدا ہوئے۔ تعلیم سے فراغت پانے کے بعد سرکاری دفتر میں ملازم ہو گئے، لیکن مسلوں کے چکر نے بھی ان کے ذوق ادب کو ماند نہیں ہونے دیا۔ زمانہ طالب علمی سے انھیں شعر اور ادب سے لگاؤ رہا اور ترقی پسند تحریک سے وہ متاثر رہے۔ ابتدا میں کچھ گیت لکھے، جن میں سے ایک گیت کی ابتدائی بیت ہے:-

من مندر میں جوت جگا لو پیتم ملنے آئے ہیں
دیکھو، دورا سونا دیکھو پلٹ کہیں نہ جائے

گیت لکھنے کا یہ ذوق اب بھی جاری ہے۔ اور کئی نظمیں بھی لکھی ہیں، جن کا مجموعہ "خرام انقلاب" کے نام سے مرتب کر لیا ہے۔ سنہ ۱۹۵۵ء سے افسانہ نگاری اور ناول نگاری کی طرف بھی توجہ کی اور پچھلے دس بارہ برس کے عرصے میں بہت سے افسانے لکھے جن میں سے کچھ رسالوں میں شائع ہوئے ہیں۔ ان افسانوں کے تین مجموعے "پیار اور ترازو۔" "عشق ہو گیا ہے"، "عشق میں بھول نہیں" مرتب ہو گئے ہیں۔ چوتھا مجموعہ "جانے وہ کیسے لوگ تھے" بھی مرتب ہو چکا ہے۔ آخر الذکر مجموعے میں پانچ افسانے شامل ہیں۔ "تیرگی کو صلیب دو" "دھرتی کے داغ" "سرخ برف زرد پتے" "آندھیاں" اور "جانے وہ کیسے لوگ تھے"۔

آخری افسانہ "بزم فروغ اردو جموں کے مجموعے "منتخب ادب" میں بھی

شائع ہوا ہے۔ "تیرگی کو صلیب دو" ایک جانباز شیدائے وطن سپاہی افتخار کی کہانی ہے، جو گولیوں کی بوچھار میں بچ کر اپنے ہیلی کاپٹر میں میدان جنگ کے زخمیوں کو سمیٹ لانے میں کامیاب ہو جاتا ہے، لیکن خود گولیوں کے زخموں سے جان بر نہیں ہو سکتا۔

آنند نے ناول بھی لکھے ہیں۔ ان کا پہلا ناول "نئے خدا" ۱۹۵۸ء میں مرتب ہوا، اس کے بعد دوسرے ہی سال، ایک اور ناول "دہکتے پھول شبنم آنکھیں" کلدیپ بک ڈپو، جموں سے ۱۹۶۲ء میں شائع ہوا۔ دو اور ناول "صلیب اور دیوتا" اور "اپنے وطن میں اجنبی" ۱۹۶۴ء میں شائع ہوئے۔ ایک ناولٹ "نئے دن پرانے سال" بھی ان کی تصنیف ہے۔ اس طرح وہ ریاست کے سیر حاصل فلم کاروں میں سے ہیں۔ اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں:-

"اتنا کچھ لکھنے کے بعد بھی ابھی تشنہ ہوں، کیونکہ بعد کے دو سالوں میں مطالعہ بھی کچھ کم ہوا اور لکھنا بھی۔ لیکن اسکی وجہ میں سمجھتا ہوں کہ اردو ادب پر خاص کر ہماری ریاست میں جو جمود طاری ہے اور ہمارے ماحول نے ہم ادیبوں کے ساتھ جو سلوک روا رکھا ہے اس نے ہمارے خلوص اور ادب پر مکمل یقین کو ٹھیس پہونچانے کی کوشش کی ہے لیکن فن کی خدمت اور ادب کی خدمت جیالے کرتے ہی رہیں گے۔ کیونکہ ہم اردو ادب کے مستقبل سے مایوس نہیں ہیں۔"

اپنی تخلیقات کے بارے میں بھی آنند نے ایک دو باتیں کہہ دی ہیں۔ اور اس میں نہ خود سرائی ہے اور نہ غلط فہمی، بلکہ اپنے پڑھنے والوں کی رہنمائی ہے، وہ لکھتے ہیں:-

"ناول اور افسانے ہیں، میں نے عام روش سے ہٹ کر ایک نئی روش اپنانے کی کوشش کی ہے اور میں اس روش میں کہاں تک کامیاب ہوں ہوں یہ تو میری تخلیقات پڑھنے کے بعد ہی کوئی اندازہ لگا سکتا ہے۔"

اور یہ صحیح ہے کہ ان کی تخلیقات میں ایک وضع، ایک ندرت سی ہے۔ کہانی کہتے وقت وہ نئے نئے اسالیب، نئے موضوع اور نئی تکنیک کی حتی المقدور کوشش کرتے ہیں۔ "جانے وہ کیسے لوگ تھے" میں سنتوش خیالوں میں بہتے ہوئے، محبوبہ کو دل کی ساری بپتا سنا رہا ہے پھر سوچتا ہے:۔

"ایک سپاہی کے لاشعور میں یہ انتشار ایسا نہیں کہ اس کے فرض کو جھٹلا دے یہ ماضی کے گذرے ہوئے ریزے، اڑتی ہوئی چنگاریوں کی طرح بجھ جائیں گے یہ سفر بہت طویل ہے۔"

آنند کا اسلوب بیان کافی جاذب توجہ ہے، اور ان کا اردو ادب کی خدمت کا جذبہ قابلِ تحسین۔ چنانچہ ان نامساعد حالات کے باوجود، جن کی طرف انھوں نے اشارہ کیا ہے۔ ان کی مستقل مزاجی تقلید کے قابل ہے۔

بشن سروج کی ادبی زندگی کا آغاز ان کے بہت سے معاصرین کے برخلاف، پنجابی میں ہوا، پھر وہ اردو اور ہندی میں لکھنے لگے۔ ان کا پورا نام بشن رامپال ہے۔ جموں وطن ہے۔ جہاں ان کی ولادت ہوئی اور تعلیم پائی رہی، اتنے تک پہنچ سکے۔ یہ کمیونسٹ پارٹی کے سرگرم کارکن بھی رہے، اس وقت وہ روسی سفارت خانے کے اشاعت گھر میں مترجم کی خدمت انجام دے رہے ہیں۔

بشن سروج اردو اور پنجابی دونوں زبانوں میں لکھتے ہیں اور

ان کی تخلیقات کی تعداد کافی ہے ۔ وہ کہانیاں لکھتے ہیں اور شعر بھی کہتے ہیں ۔ ان کے افسانوں کا ایک مجموعہ " زمین پیاسی ہے "، ۱۹۶۲ء میں شایع ہوا ، اس میں کل بارہ افسانے ہیں ۔

' چیرہرن ' ' دوسرا روپ ' ' گھاٹ کنارے ڈوب گئے ' ' جینے کا سلیقہ ' ' رقص شرر ' ' وقت سفر یاد آیا ' ' ناچ جو دل میں چمنی کے دھوئیں سے ' ' دل کی وادی یادوں کے کھنڈر ' ' خون کا قرض ' ' کلائیمکس ' ' زمین پیاسی ہے '

ان کے علاوہ کچھ افسانے رسالوں میں شایع ہوئے ہیں ، جن میں " امرت جیسا زہر " اور " سسکتے کی لاٹ " قابل ذکر ہیں ۔ وہ بہت جذباتی انداز میں لکھتے ہیں ۔ اپنے ہم عصر اکثر نوجوان ادیبوں کی طرح انھیں بھی عوام اور پس افتادہ عوام سے دلچسپی ہے ، اور افسانوں میں وہ انھیں کی زندگی کے مسائل کو ابھارنے کی کوشش کرتے ہیں ۔ رومانی موقف ان کے ذہن میں بھی تحریک پیدا کرتے ہیں ۔ " زمین پیاسی ہے " ان کا شاید نمائندہ افسانہ ہے ، یہ ہند کے بٹوارہ کی کہانی ہے اور اشاروں اشاروں میں اس طرح کہی گئی ہے کہ تفصیل کا ماحول پڑھنے والے کے ذہن میں خود بخود پیدا ہو جاتا ہے ۔ انھیں انسانیت سے ہمدردی ہے ، چنانچہ افسانے میں انھوں نے افسانوں کے دُکھ درد کو پیش کیا ہے اور اپنے ذہن کو خانوں میں بٹنے نہیں دیا ۔ رومانیت کے ساتھ ساتھ حقیقت شعاری کا بھی خوشگوار امتزاج ان کے یہاں نمایاں ہے ۔ زندگی کے بارے میں ان کے اپنے تصورات ہیں ، اور کچھ تجربات ، جنہیں وہ اپنے افسانوں کا موضوع بناتے ہیں اور جنہیں کہنے کے لئے انداز وضع

کرنے کی کوشش کی، ان کے اور جموی معاصرین کی طرح ان کے یہاں بھی نمایاں ہے۔ "زمین پیاسی ہے" کا پیش لفظ انگریزی کے استاد ڈاکٹر اپورب سومناتھ نے لکھا ہے، جس میں انھوں نے اپنے عزیز شاگرد کی تخلیقات کا تجزیہ کیا ہے اور ان کی دوزیابی کی کوشش کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں :-

"بش سروج کے افسانوں کا مجموعہ "زمین پیاسی ہے" رومانیت اور حقیقت نگاری کی عکاسی کرتا ہے۔ جواں سال افسانہ نویس نے زندگی کا گہرا مطالعہ کیا ہے اور اس کی تخلیقات میں خلوص و شدت مشاہدہ کوٹ کوٹ کر بھرے ہوئے ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

آگے وہ لکھتے ہیں :-

"بش کے افسانوں میں حالانکہ ایک مخصوص سیاسی نظریہ کارفرما ہے، لیکن کسی بندھے کے ٹکے اور سیاسی فارمولوں کا مرہون منت نہیں ۔ ۔ ۔ ۔ بش کے فن میں دل و دماغ دونوں کا یکساں عمل ہے، جو کسی بھی کامیاب افسانہ نگار کیلئے لازم ہے۔"

بش کے نئے موقف پیدا کرنے کی اچھی مثال ان کا افسانہ "کلائمکس" ہے، جس میں رام لعل، ساوتری کی پیشانی سہلانے سہلانے اپنی اور اس کی ساری سرگذشت کہتا ہے۔ افسانے کا اختتام ایسے غیر متوقع انداز میں ہوتا ہے۔ یہ حصہ ذیل میں درج ہے :-

"اور پھر رام لعل نے غیر شعوری طور پر کسی کے گلے کو اپنی گرفت میں لے لیا اور پھر پکڑ شدید ہو گئی، حتیٰ کہ کسی کے گلے پر رام لعل کے ہاتھوں کی آہنی گرفت کا ہالہ بن گیا

اور کسی کی روح قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی۔ اور پھر ساونتری

کی گردن رام لعل کے ہاتھوں سے پھسل کر ایک طرف لڑھک گئی۔"

بیش اپنے عہد کی ادبی تحریکوں سے آگاہی رکھتے ہیں۔ اور ان سے متاثر بھی ہیں۔ افسانوں کے علاوہ انھوں نے ایک ناول بھی لکھا ہے جو "قمقموں کے سیاہ اجالے" کے نام سے موسوم ہے۔

ہری کرشن کول، ہندی کے لکچرار، جو پہلے سری پرتاب کالج میں متعین تھے اور اب امرسنگھ کالج میں کارگزار ہیں، ہندی کے اچھے افسانہ نگاروں میں شمار ہوتے ہیں۔ اردو میں بھی وہ لکھتے ہیں، اور کئی افسانے شائع کر چکے ہیں۔ ان میں قابل ذکر "کتے کا دم"، "داو"، "رادھا کے گھر آئے شیام"، "تغافل اور" "اور بھی غم ہیں"۔ ان کہانیوں میں عموماً نیا شعور جھلکتا ہے، اور فنی احساس میں بالیدگی اور رچاو ملتا ہے۔ فلسفیانہ موضوعات اور نفسیاتی پیش کشی میں کول بجا یک دست ہیں۔ ان کی کہانی "کتے کی دم" جو ۱۹۶۰ء میں شائع ہوئی تھی، پروفیسر سومناتھ کول کی اپنے پڑوسی کے لڑکے کے ساتھ فلسفیانہ ہمدردی ہے۔ "داؤ" دو دوستوں کی کہانی ہے، دونو جوان دوست اور دونوں نادار، ان دونوں کی ملاقات سرینگر شہر کے مرکز لال چوک میں ہوتی ہے۔ دونوں کے دل میں کسی ہوٹل میں بیٹھ کر چائے پینے کی خواہش چٹکیاں لے رہی ہے، لیکن دونوں اپنی جیب کے دو روپوں کو آئندہ کے خیال سے خرچ کرنا نہیں چاہتے۔ جہلم کے بند تک جا پہنچتے ہیں اور بند پر بیٹھ کر تاریخ، فلسفہ غرض دنیا جہاں کی باتوں میں دل بہلاتے ہیں۔ اور جب تھک جاتے ہیں تو گھروں کی طرف چل پڑتے ہیں، لیکن راستے میں ایک رسالے کا خاص نمبر سٹال پر رکھا دکھائی دیتا ہے، دونوں کی خواہش ہوتی ہے

کہ اسے خریدیں، لیکن وہی مستقبل کا خیال اب بھی مانع ہوتا ہے اور ستم ظریفی یہ ہوتی ہے کہ دونوں تاش کے پتے پر اپنے روپیوں کی بازی لگاتے اور ہارتے ہیں۔ یہ ہمارے عہد کے نوجوانوں کی خالی خولی زندگی پر ایک گہرا طنز ہے۔

"رادھا کے گھر آئے شیام" اور "اور بھی غم" ان کے اچھے افسانوں میں سے ہیں۔ "رادھا کے گھر" میں انھوں نے کچھ نئی تکنیک برتی ہے۔ اور نوجوان ہیرو کی نفسی افتاد پر روشنی ڈالی ہے۔ "اور بھی غم" میں بھی منوہر کی نفسیاتی اُلجھن کو پیش کیا ہے۔ لیکن وجے کا کردار، ایک معصوم پہاڑی دوشیزہ کی حیثیت سے بڑا ہی جاذب نظر ہے۔ یہ کہانی کشمیر کی گھاٹیوں، پہاڑوں اور دیودار کے درختوں کے پس منظر میں حقیقی زندگی کی کہانی معلوم ہوتی ہے۔ منوہر کو جب وجے کا گاؤں چھوڑ کر شہر جانے کا خیال آتا ہے، تو اس لگاؤ کو محسوس کرتا ہے، جو اسے وجے سے ہو گیا تھا، لکھتے ہیں:-

> "اور منوہر کو طالب علمی کے زمانے میں پڑھی ایک کہانی یاد آئی۔۔۔۔ ایسی ہی ایک پہاڑی بستی، وجی جیسی ایک الہڑ لڑکی اور اس جیسا ایک پردیسی بابو۔۔۔ کچھ مدت کے بعد پردیسی کا تبادلہ ہوا، چلتے وقت اس نے بھولی بھالی لڑکی کو دلاسا دیا تھا مگر اپنے شہر پہنچ کر دشنت سکنتلا کو بھول گیا۔ شکنتلا ساری زندگی روتی رہی۔۔۔۔"

مدن سنگھ ٹھاکر پونچھ کی سرزمین سے تعلق رکھتے ہیں۔ افسانہ نگاری کا انھیں ذوق ہے۔ کچھ افسانے رسالوں اور مجموعوں میں شائع ہوئے ہیں۔ مدن موہن شرما نے اپنے معاصر افسانہ نگاروں کے

منتخب افسانوں کا مجموعہ "نثار میں تری گلیوں کے" کے عنوان سے مرتب اور شائع کیا ہے، اس میں ٹھاکر کا ایک اچھا افسانہ "سورگ کی سیڑھی" بھی شامل ہے۔ افسانے کا مرکزی موضوع ایک عوامی عقیدہ ہے کہ پڑپوتا وہ سیڑھی تھام سکتا ہے جو سیدھی سورگ کو جاتی ہے۔ پردادی جو اپنے پوتے کی بیوی سے ہمیشہ جھگڑتی رہتی تھی، پڑپوتا پیدا ہونے پر، اس کا رویہ ایسا بدل جاتا ہے کہ وہ گویا بہو کی پرستش کرنے لگی ہے۔ اس تبدیلی کا احساس بہو کو بھی ہوا، اور پردادی نے بھی اسے محسوس کیا۔ اس نئے رویے کو سمجھانے کے لئے ٹھاکر نے پردادی کی زبان سے بڑی حسین توجیہہ پیش کی ہے۔ وہ بہو سے کہتی ہے:-

"تمہارا نام لے کر میں اپنے آپ کو کوستی تھی، تم گھر کی لکشمی ہو...."

اور اس سارے واقعہ میں اس کا ذاتی مفاد، اور نجات کا یقین پوشیدہ تھا۔ چنانچہ پردادی بہو کو بتاتی ہے:-

"تم نہ ہوتیں، تو میرا پرپوتا کہاں سے مجھے ملتا"

مدن موہن شرما، جن کا تذکرہ اوپر آیا ہے، جموں کے ذہین افسانہ نگاروں میں سے ہیں۔ ان کا اصلی وطن میرپور ہے، جہاں ان کی ولادت ۱۹۴۲ء میں ہوئی، لیکن ان کی تربیت اور تعلیم اور ذہنی نشو و نما جموں کی ادبی فضا کی مرہون ہے۔ یہ بھی ان نو عمر افسانہ نگاروں میں ہیں، جنھیں اپنے آپ پر اور اپنے فن پر بڑی خود اعتمادی ہے۔ "پتھر اور پانی" ان کے افسانوں میں شاید سب سے زیادہ انوکھے انداز کا افسانہ ہے، اور اس کا اظہار خود انھوں نے بھی ان الفاظ میں کیا ہے:-

"میری اس کہانی کا پلاٹ، ایک نئی تکنیک کی طرف اشارہ کرتا ہے"

پرکاش اس کہانی کا واحد کردار ہے، جس کے تاثرات کی اٹوٹ رو، ماضی کے زمانے اور بچپن کے عہد تک پہنچتی ہے۔ بچپن کی دلچسپیاں، کھیل، کود، آشا سے جھگڑنا، اس کے بعد حال کی واردانتیں، جوانی، اور اس کے جذبات کی عکاسی، آشا سے محبت، آشا سے دولت مند ہونا، یہ سارے مرقعے ایک تسلسل کے ساتھ ہمارے سامنے آتے ہیں۔

شرما کے افسانوں کے دو مجموعے مرتب ہو چکے ہیں، جن میں ایک "جہاں گناہ پلتے ہیں" چھپ چکا ہے۔ دوسرا "چاند کے آنسو" زیر طبع ہے۔ اپنے ہم عصر افسانہ نگاروں کے منتخب افسانوں کے مجموعہ "شار تری گلیوں پہ" ہیں جس کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے۔ شرما نے کرشن چندر کا "گلدان" مہندر ناتھ کا "پتھر کے بت" ٹھاکر پونچھی کا "وسوندھا سنگھ دردی" سرلا دیوی کا "عزت" وبدراہی کا "منجر کا میلہ" مالک رام آنند کا "سرخ برف اور زرد پتے" پشکر ناتھ کا "نیلے امبر تلے" نور شاہ کا "اجنبی سمندر اور لڑکی" دیانند کپور کا "بلا عنوان" خیراتی لال کا "پونم کا چاند" یش سروج کا "کلائیمکس" وجے سوری کا "جب کہانی جنم لیتی ہے" اور مدن ٹھاکر کا "سورگ کی سیڑھی" اور خود اپنا افسانہ "پتھر اور پانی" شامل کیا ہے۔ مالک رام آنند نے اس کا دیباچہ لکھا ہے، جس میں انھوں نے افسانہ نگاری کے فن کا جائزہ لیا ہے اور آخر میں شرما کو مبارکباد دی ہے کہ انھوں نے اپنے ہموطن افسانہ نگاروں کی تخلیقات کے اس مجموعے کو شائع کر کے دھرتی کا قرض چکایا ہے۔

مدن موہن شرما نے ناول بھی لکھے ہیں۔ ان کا ایک ناول "ایک منزل چار راستے" چھپ چکا ہے اور ایک اور ناول "پیاسے کنارے" چھپ رہا ہے۔

گھنشیام سیٹھی، کشمیر کے کہنہ مشق افسانہ نگار ہیں، یہ ہندی اور اردو دونوں زبانوں میں لکھتے ہیں۔ ان کے افسانوں میں "ایک اور شام" حسین افسانہ ہے، جس میں زندگی کی تلخیوں کے درمیان بچے کا صحت بخش اثر کہانی کے تانے بانے میں ابھارا گیا ہے۔ یہاں یہ بچہ ہریش ہے، جس کے ماں باپ ہر روز جھگڑتے ہیں، اور ماں، جیسا کہ فطرت ہے، میاں کے رویہ پر کڑھتی رہتی ہے، ہریش ان جھگڑوں سے ماں کی طرفداری اور باپ کی سرزنش کرتا ہے۔ اس طرح وہ اس فطرت کی تکمیل کا سبب بنتا ہے جو فوائد کے نظریہ کی بنیاد ہے۔

پریم چند ماتھر کو بھی افسانہ نگاری کا ذوق ہے۔ وہ افسانے اور مضامین لکھتے رہے ہیں۔ ان کا ہندی سے ایک ترجمہ جو "بھوکا روزہ دار" کے عنوان سے ہفتہ وار "وکیل" سرینگر مارچ سنہ ۱۹۴۹ء) میں شایع ہوا تھا، اچھا افسانہ ہے۔ اصل ہندی افسانہ پنڈت شری رام شرما کی تخلیق ہے۔

او۔ پی شرما، جو روشن راہی کے نام سے بھی لکھتے ہیں، جموں کے نوجوان افسانہ نگاروں میں اپنا ایک مقام رکھتے ہیں۔ وہ مصور بھی ہیں، اور اس حیثیت سے بھی، ریاست کے فنکاروں میں اپنی جگہ رکھتے ہیں۔ شرما جموں کی ریسرچ لیبارٹری میں کارگذار ہیں۔ اپنے افسانوں کا ایک مجموعہ انھوں نے "عمر بیا" کے عنوان سے مرتب کیا ہے، جس میں "رمتا جوگی" "ایندھن" "رخ بدل گئے" "درد" "مجرم کون" "راہ سے پیچھے اور آگے" "شاہکار" "یاسمین کے پھول" "اپنے وطن سے، اپنے وطن میں" "دھرم کی ودھوا" "عمر بیا" اور "بڑی ماں" شامل ہیں۔

کہانی "عمر بیا" جس کو شرما نے مجموعے کے عنوان کے لیے منتخب کیا ہے، غالباً ان کی نمائندہ کہانی ہے۔ یہ زندگی کے المیہ پر ایک ایمائی طنز ہے۔

"رمنا جوگی" بھی جو ایک فوجی کی کہانی ہے اس مجموعے کی اچھی کہانیوں میں سے ہے۔ فوجی اپنی مرحوم بیوی کی تصویر بنوانے کے مقصد سے اپنے مصور دوست کے پاس جاتا ہے، لیکن دوست سے ملے ہوئے اسے زمانہ بیت گیا تھا۔ جب وہ مصور کے پہنچتا ہے، تو دوست کو پہچان نہیں سکتا اور انجانی میں اسے فوجی زندگی کی کہانی سُناتا ہے:-

"ہاں صاحب، اٹھارہ سال اوپر، لیکن یہ آرمی کی نوکری بھی بڑی عجیب ہے، مزے تو بہت ہیں، لیکن بندشیں بھی ہیں۔ دیکھیے نا (حوالدار نے بیڑی دانت میں دبائے ہوئے کہا) چالیس دن کی چھٹی پر گھر گیا تھا، بائیس دن میں واپس بُلا لیا، یونٹ والوں نے تار بھیج کر۔ دستور میں رہنا پڑتا ہے ہمیشہ، آدھی رات میں بگل بج جائے تو لوہے کی دیوار کی طرح، فال ان، ہو جائیں گے سبھی۔"

واقعات کے ارتقا اور انجام سے یہ شرما کی اچھی کہانیوں میں سے ہے۔

گیان چند شرما، بھی، جموں کے نوجوان افسانہ نگاروں کے حلقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور کئی افسانے لکھ چکے ہیں جن کا ایک مجموعہ "بنجر دھرتی پتھر لوگ" کے عنوان سے مرتب کیا ہے، جس میں حسب ذیل افسانے شامل ہیں:

"چڑھتے سورج کی پوجا" "کڑوے گھونٹ" "بنجر دھرتی پتھر لوگ" "وہ کون تھا؟" "سسکتے ارمان" "ٹوبا جرنیل سنگھ" "ایک چہرہ دو روپ" "فریب اور شکایت"۔

یہ افسانے عموماً متوسط اور نیچے کے طبقے کے لوگوں کی زندگی، اُن کے مسائل، اُن کے مصائب اور ان کی کمزوریوں کو پیش منظر میں لانے کی کوشش ہے۔ بعض کہانیوں میں انسانوں کی کمزوریوں کو بہت غیر رسمی

اور کہیں کہیں غیر فنی انداز میں پیش کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر مذکورہ بالا افسانوں میں سے ایک افسانے میں، ایک نوجوان لڑکی کے لالہ جی کے فاسد ارادے۔ کچھ کہانیاں، واقعات کا مجموعہ بن گئی ہیں۔ کہانی لکھنے کا انھیں بہر حال شوق اور ملکہ ہے۔

جموں کے کہانی لکھنے والوں میں اوم ڈوگرہ کی عجیب حیثیت ہے۔ ان کو کہانی اور نئی کہانی کا بڑا اچھا تصور ہے، لیکن لکھنا پڑھنا نہیں جانتے دوستوں سے لکھواتے ہیں اور اس طرح ان کی کئی کہانیاں رسالوں میں چھپی ہیں۔ فلموں کے لئے بھی انھوں نے ایسی کہانیاں فراہم کی ہیں۔

سوم ناتھ ڈوگرہ افسانہ نگاری کا ستھرا ذوق رکھتے ہیں۔ ان کے چھ افسانوں کا ایک مجموعہ جو "دو خط ایک کہانی" "سنیاسی" "دو آنسو" "میرے ارمان میرے سپنے" "ساتھی تو ملا منزل نہ ملی" اور "رادھا" پر مشتمل ہے، مرتب اور شایع ہو چکا ہے۔ ان افسانوں کے موضوع رومانی ہیں۔ لیکن ان کے محرکات اور مرقعے الگ الگ ہیں۔ اکثر کہانیاں پہاڑی زندگی کے عمدہ نقشے پیش کرتی ہیں۔

خیراتی لال، جموں کے حلقہ کے افسانہ نگاروں سے تعلق رکھتے ہیں، لیکن ان کا اصلی وطن میرپور ہے۔ جموں میں تعلیم پائی اور جموں کی ادبی فضا میں ان کے ذوق کی تربیت ہوئی۔ اپنے افسانوں میں وہ عموماً نیچے طبقے کے مفلوک الحال لوگوں کی زندگی کو پیش کرتے ہیں، اور مدن موہن شرما نے ان کے حالیہ افسانوں میں نئے رجحانات کی نشاندہی بھی کی ہے۔ "پونم کا چاند" ان کے افسانوں کا مجموعہ ہے، جو شائع ہو چکا ہے۔ عنوان کا افسانہ

شاید ان کا سب سے اچھا افسانہ ہے، یہ پریتش اور و بنا کی داستان محبت ہے۔

لیکن وہی اونچے اور نیچے کے طبقوں کے نوجوانوں کے درمیان محبت، جسمیں لڑکی ہمیشہ اونچے طبقے سے تعلق رکھتی ہے، اور وینا بھی اسی ضابطے کی ایک شکل ہے۔ جموں کے اس انداز کے افسانوں میں، نوجوان عموماً شاعر یا ادیب ہوتا ہے اور کبھی کبھی سکول ماسٹر۔ پونم کی ایک رات ہریش کے وینا سے محبت نباہنے کے قول وقرار ہوئے، لیکن یہ قول وقرار، محبت کرنے والے دلوں کے درمیان سیم و زر کی دیواروں کو چھید نہیں سکتے۔ افسانے میں بیان کے کئی اچھے مواقع بھی آتے ہیں۔ ہریش کا ذہن وینا کی تصویر کھینچتا ہے، جس میں تشبیہوں کی ندرت جاذب نظر ہے۔ لکھتے ہیں: ۔

"نیلی جھیل میں ڈولتے ہوئے کنول جیسا چہرہ، چنچل ہرنی کی سی بڑی بڑی آنکھیں، رخساروں کو چھوتی ہوئی رات کی سی زلفیں، جیسے کہ کسی مصوّر کی تصویر میں جان آگئی ہو۔"

خیراتی لال کے ایک ہم وطن ارجن دیو رشک بھی افسانہ نگار ہیں۔ ان کا خاندان تقسیم ھند کے بعد ترک وطن کر کے جموں آگیا۔ یہیں رشک نے ادبی ذوق بڑھایا، اور افسانے لکھنے لگے۔ اس وقت وہ آل انڈیا ریڈیو دہلی میں ملازم ہیں۔ کئی افسانے، فلمی کہانیاں اور مکالمے ان کی تخلیقات ہیں۔ مشہور فلموں جیسے "جس دیش میں گنگا بہتی ہے"، "دل ایک مندر"، "روپالی" وغیرہ کے مکالمے انھوں نے ہی لکھے ہیں۔

شمس نوید بھی افسانے لکھتے ہیں اور بعض حسین افسانے ان کی تخلیق ہیں۔ "مجسمہ کے بعد" ان کے اہم افسانوں میں سے ہے۔ ایک راجکمار اپنی محبوبہ کا مجسمہ ایک صاحب فن بت تراش سے تیار کرواتا ہے۔ مجسمہ کے تیار ہو جانے کے بعد بت تراش کو اس پر فریفتہ ہو جاتا ہے ——

"عشق اوّل در دل معشوق" والی بات یہاں بھی صادق آتی ہے، لیکن اس خیال کے افسانہ نگار اپنے انداز سے اٹھاتا ہے۔ راجکماری بت تراش کا دم بھرنے لگتی ہے۔ وہ محل کا آرام اور عیش چھوڑ کر، بت تراش کے فراق میں نکل پڑتی ہے، لیکن اس کا بت تراش تک پہنچتے پہنچتے، بت تراش کی محبت اس سے آگے نکل چکی تھی۔

ڈاکٹر ششنکر رینہ، کشمیری کے افسانہ نگار ہیں، ڈرامے بھی لکھتے ہیں، اردو میں بھی ان کی کچھ کہانیاں شائع ہوئی ہیں۔ "مرجھائی ہوئی کلی" جو "شیرازہ" (مارچ ۱۹۶۴ء) میں شائع ہوئی ہے، ڈاکٹر رینہ کی دلچسپ کہانی ہے۔

برج کتیال، وید راہی اور موہن یاور، جن کا حال لکھا جا چکا ہے، ایک مثلث کے تین ضلعے ہیں، اور ان کے آپس کا رشتہ مواخاۃ، ان کے لئے فن کی تحریک کا کام کرتا ہے، بعض اوقات ان کے آپس کی دوستانہ مسابقت ان کی تخلیقات کے لئے مہمیز کا کام بھی دیتی ہے۔ برج کتیال اور وید راہی افسانوں کے علاوہ ناول بھی لکھتے ہیں۔ برج کتیال کا تعلق ایک مرفہ الحال گھرانے سے ہے۔ جموں وطن ہے اور یہیں تعلیم اور ادبی تربیت بھی حاصل ہوئی۔ ادبی ذوق زمانہ طالب علمی ہی میں نمایاں ہونے لگا تھا۔ چنانچہ کالج کے رسالے میں وہ باضابطہ لکھا کرتے تھے۔ اسی زمانے میں انھیں ڈراما سے بھی دلچسپی پیدا ہوئی، کالج کے ڈراموں میں وہ کام بھی کرتے رہے۔ اس وقت وہ بمبئی میں ہیں اور فلموں کے لئے کہانیاں لکھ رہے ہیں۔

برج کتیال منجھے ہوئے ادیب ہیں اور ان کی تخلیقات میں فکر کی پختگی اور پیش کشی میں فنی پہلو نمایاں ہیں۔ ان کے افسانوں میں حقیقی زندگی متحرک نظر آتی ہے اور زندگی کے فیصلے پہلو ان کے یہاں ملتے ہیں۔ ان میں

حسن وخوبی کے گوشے، ان کی پیش کشی کے انداز سے نمایاں ہو جاتے ہیں۔ برج کتیال کے قلم نے کئی حسین افسانے اردو کو دیئے، جن میں 'ایک لڑکی'، 'آتند'، "نقاب اور چہرے"، "مایا پنجابن"، "چھوکرا"، "آئینہ"، موضوعات کے انوکھے پن اور بعض وقت تکنیک کی ندرت اور عموماً تاثر کے اعتبار سے۔ اردو کے اچھے افسانوں میں شمار ہوتے ہیں۔ بمبئی میں رہتے ہوئے اور فلمی کاروبار سے متعلق ہوتے ہوئے، انھوں نے فلمی ضابطوں کے انداز کے افسانے نہیں لکھے، بلکہ اپنے ہیروین کی تلاش بسااوقات وہ جھونپڑیوں اور خستہ حال آبادیوں میں کرتے ہیں۔

"ایک لڑکی"، ایک غیر معتمد موضوع پر مبنی ہے۔ ایک پاگل لڑکی، جس کا کردار ایسے حقیقت شعارانہ اور انفرادی انداز میں پیش کیا گیا ہے کہ وہ ایک نمونے کے کردار کے طور پر پڑھنے والے کے ذہن میں زندہ رہ جاتی ہے۔ ان کے افسانوں کے مجموعے "موت کے راہی" پر پیش لفظ لکھتے ہوئے رامانند ساگر نے کہا ہے کہ انھوں نے اپنے کردار خود ڈھونڈھے ہیں۔ ان ڈھونڈے ہوئے کرداروں کو اپنی جانی پہچانی فضا میں بساتے ہیں، اور اپنے پلاٹ یا خاکے کے تانے بانے میں ان کی فطرت کے نقوش ابھارتے ہیں۔

رومانی رجحانات سے بھی برج کتیال کے افسانے کلیتہً اجنبی نہیں ہیں۔ اس انداز کی کہانیوں میں "نرگس کے پھول" بہت دلچسپ ہے۔ موضوع عام ہے لیکن ان کی پیش کشی کا انداز اپنا ہے۔ "آئینہ" بھی ایک اور اچھی کہانی ہے، جس میں نفسیاتی پہلو موثر ہے۔ فلموں کے لیے انھوں نے جو کہانیاں لکھی ہیں، ان میں "جب جب پھول کھلے" اپنے انداز کی اچھی کہانی مانی گئی ہے۔ فلموں کے لئے کہانیاں بھی وہ لکھ رہے ہیں

برج کتیال نے ناول پر بھی طبع آزمائی کی ہے۔ ان کا لکھا ہوا ناول "چراغ بجھنے سے پہلے" مکمل ہو گیا ہے اور یقین ہے کہ جلد چھپ کر شائع ہو جائے گا۔

غلام محمد جانباز، جو عموماً غ۔ م۔ جانباز کے نام سے لکھتے ہیں، کچھ اچھے افسانوں کی تخلیق کر سکے ہیں۔ "دل کی بات" اس لحاظ سے اچھا افسانہ ہے کہ کچھ نفسیاتی پیچیدگی سے قطع نظر، اس میں تکنیک کی ندرت ہے، بیان میں حُسن بھی ہے اور کہیں کہیں فکر زا اشارے بھی اس میں ملتے ہیں۔ پال اور اس کا ایک دہلی والا دوست محمود نج دن میں شکار کے لئے جاتے ہیں۔ اس جنگل کی فضا سے افسانے کے خط و خال ابھارنے کی بجائے، رومان کی تخلیق کیلئے پال کی بہن سرینا کو بھی افسانہ نگار ساتھ لے جاتا ہے۔ محمود افسانہ نگار ہے' اور وہ پال سے کہتا ہے :-

"پال میں کہانیاں لکھتا ہوں کہ اپنا درد لوگوں میں بانٹ سکوں"۔

سرینا کی زبان سے ایک بڑی لگتی ہوئی بات کہہ دی ہے۔ محمود سے یہ سُن کر کہ وہ کشمیر کے بارے میں ناول لکھنا چاہتا ہے، حالانکہ اسے کشمیر آئے دو چار ہی دن ہوئے تھے، سرینا کہتی ہے :-

"آج تک بہت ہی کم لکھنے والے کشمیر کے باسیوں کی صحیح عکاسی کر سکے ہیں۔ آپ کشمیر کے دیہاتوں میں جائیے، یہ وہ جگہیں ہیں جہاں کشمیر کے اسی فیصد لوگ رہتے ہیں"۔

امرناتھ رینہ، جو اے۔ این۔ رینہ کے قلمی نام سے لکھتے ہیں، کشمیری زندگی کے کچھ مخصوص پہلوؤں کو اپنے افسانوں کے ذریعے منظر عام پر لانے کا باعث ہوئے ہیں۔ "نُقل" اس کی عمدہ مثال ہے۔ "نُقل" اہل کشمیر کی ایک رسم ہے، جو اماک باراں کے وقت انجام دی جاتی ہے۔ رینہ نے

اس کے اہتمام کی تفصیل افسانے میں خوبی سے بیان کی ہے۔

اومبنش چندر نے کچھ افسانے لکھے ہیں، لیکن چیخوف کے افسانے کا ترجمہ جو انھوں نے "آخر کس نے کہا" کے عنوان سے شایع کیا خاصہ دلچسپ ہے۔

وادی کے دو نوخیز افسانہ نگار ظفر احمد اور محی الدین، محمد عمر نور الٰہی کی روایت کو برقرار رکھتے ہوئے ساتھ لکھتے ہیں۔ ان کے افسانوں کا مجموعہ "پھول اور آویزے" ۱۹۶۳ء میں شایع ہوا۔ اس میں ایک اور مجموعہ "میری آرزو تیری تمنا" زیر طبع ہونے کی نوید بھی دی گئی ہے۔ "پھول اور آویزے" میں ظفر احمد کی لکھی ہوئی پانچ اور محی الدین شاہ کی لکھی ہوئی چھ کہانیاں شامل ہیں۔ ظفر احمد کی کہانیوں کے عنوان ہیں "سرخ گلاب اور آویزے" "پرواز" "مہذب آئینے" "برف" اور "شب خوں"۔ محی الدین شاہ نے مجموعہ کے لئے "خوبصورت شیشے بدصورت دل" "سیاہ گلاب کالا داغ"۔ "حویلی کا دل" "احمد کی لڑکی" "جنم جنم کا بندھن"۔

عنوانات کی منظر کشی فکر کے انداز کی غماز ہے۔ لیکن کہانیوں میں فن کی نگہداشت سے زیادہ ندرت اور سنسنی خیزی کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔ "سرخ گلاب اور آویزے" میں ترجمہ پن ہے۔ افسانوں میں چند کشمیر کی زندگی کو پیش کرتے ہیں، لیکن یہ بھی اب افسانہ نگاروں کے لئے رسم سی بن گئی ہے۔ کچھ کہانیاں خیال کو اُکساتی ہیں، لیکن اسلوب میں گنجلک بعض وقت ان سے لطف اندوز ہونے میں حارج ہوتا ہے۔ محی الدین شاہ کی پہلی دو کہانیاں بچوں کی زندگی کو خوبی سے پیش کرتی ہیں، لیکن ان میں برائی یہ ہے کہ مصنف نے ان پر بعض وقت جوانی کے جذبات طاری کر دئیے ہیں۔

اپنی ان کہانیوں کے لئے مصنفین نے معذرت چاہی ہے کہ وہ کچھ

افسانوں کو جو اس مجموعے میں شامل ہیں، جریدوں میں شایع کرنے کی جسارت نہ کر سکے۔ اس کا سبب یہ تھا کہ "اکسپیریمنٹل" کہانیوں کے لئے ملک میں جگہ نہیں ہے۔

محمود حسین بدخشی، لیکچرار اردو اسلامیہ کالج، سرینگر افسانوں کے ایک مجموعے "نیل کمل مسکائے" کے مصنف ہیں۔ ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور جس زمانے میں جموں و کشمیر یونیورسٹی میں پوسٹ گرایجویٹ شعبہ اردو کے صدر تھے، بدخشی تعلیم پا رہے تھے، ان کے شوق کو دیکھ کر ڈاکٹر زور نے ان کی بڑی قدر دانی کی اور اس مجموعے کو اپنے ادارہ ادبیات اردو حیدر آباد سے شایع کیا۔

شبنم قیوم، افسانہ نگار کی حیثیت سے ابھی ابھی منظر عام پر آئے ہیں۔ یوں وہ افسانے پچھلے آٹھ دس سال سے لکھ رہے ہیں اور دو سال پہلے افسانوں کا ایک مجموعہ بھی شائع کر چکے ہیں۔ ناول بھی لکھے ہیں، جن کی تعداد کافی ہے۔ شبنم قیوم سرینگر کے محلہ ڈل گیٹ میں ۱۹۳۶ء میں پیدا ہوئے۔ متوسط گھرانے سے ان کا تعلق ہے۔ گھر کے حالات نے اعلیٰ تعلیم سے محروم رکھا، لیکن ذاتی مطالعے سے ان کا ادبی شوق بڑھتا گیا، یہاں تک کہ وہ کئی افسانے، ناول اور ایک دو ناولٹ لکھ چکے۔ ناول میں "زندگی اور موت" "بے غیرت سماج" "انسان اور کتے" "جس دیش میں جہلم بہتی ہے"۔ "انسان اور کتے" کرشن چندر کی "گدھے کی سرگذشت" سے متاثر ہو کر تصنیف کیا، اور یہ سماج پر ایک طنز ہے، "جس دیش میں جہلم بہتی ہے" کافی ضخیم ناول ہے، جس کی داستان، کشمیر سے ماخوذ ہے۔

"شبنم قیوم کے ناولٹ "پرانی ڈگر سے قدم" میں موجودہ سیاسی سماج

میں جنسی رجحان پر روشنی ڈالی ہے۔ دوسرا ناولٹ "چراغ کا اندھیرا"، حکومتی طبقوں کی تنقید ہے۔ شبنم عام طور پر اپنے تجربوں کی روشنی میں اپنے موضوع منتخب کرتی ہیں اور زندگی سے ایسے پہلو چن لیتے ہیں، جن سے وہ متاثر ہوتے ہیں۔

عمر مجید پچھلے تین چار سال سے افسانے لکھ رہے ہیں۔ ان کی ولادت ۱۹۴۴ء میں ہوئی۔ بسکو میموریل سکول سرینگر میں تعلیم حاصل کی۔ جموں وکشمیر یونیورسٹی سے بی۔ اے کا امتحان کامیاب کیا۔ اور اب بسکو سکول ہی میں ماسٹر ہیں۔ ان کے افسانوں کا ایک مجموعہ "اجالوں کے گھاو" ۱۹۶۸ء میں شائع ہوا۔ جس میں ۹ افسانے "نمرود کی خدائی"، "ڈل کے باسی" "مردہ چنار" "اجالوں کے گھاو"، "میرے وطن"، "دھوئیں کا راستہ"، "گونگا مجنون اندھی لیلا" "آدمی" اور "زندگی ایک کھلونا" شامل ہیں۔ ایک ناول "یہ بستی یہ لوگ" کے عنوان سے لکھا ہے جو زیر طبع ہے۔

عمر مجید کو افسانے لکھنے کا ڈھنگ آتا ہے۔ ان کی نظر اپنے اطراف کی زندگی کا مشاہدہ کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ اور ان کے مشاہدات کو وہ سلیقہ سے بیان کرنے کے اسلوب پر بھی قدرت رکھتے ہیں۔ نیچے کے طبقے کے لوگوں، کسانوں اور مزدوروں کی ناقابل رشک زندگی ان کا عام موضوع ہے۔ "نمرود کی خدائی" زندگی کے ڈھنگوں پر زہر خند ہے۔ ایک بھوکا نوجوان رات کی تاریکی میں دو موٹروں کے تصادم دیکھ قریب جاتا ہے، موٹر نشین حادثہ کا شکار ہو چکے تھے، ایک کیس موٹر سے اٹھا لیتا ہے، جس میں نوٹ بھرے ہوئے تھے، گھر کی طرف روانہ ہوتا ہے، لیکن کسی نامعلوم جذبے کے تحت، جب وہ کیس موٹر میں واپس رکھنے کے لئے لوٹتا ہے، تو پولیس اسے گرفتار کر لیتی ہے۔ "اجالے کے گھاو" ایک غریب کاشتکار کی تباہی کا افسانہ ہے۔

پیارے لال کول وکیل، پنڈت سالگرام سالک کے پوتے اور شمبوناتھ کول وکیل کے فرزند ہیں۔ وکالت، صحافت اور سیاست، جو اس خاندان کا طرۂ امتیاز رہے ہیں۔ پیارے لال کے حصے میں بھی آئے۔ ان کا پیشہ وکالت ہے، اور وہ ان کے بھائی پنڈت پشکرناتھ وکیل مرحوم نے اپنے والد کے اخبار "وکیل" کو جاری رکھنے کی کوشش کی، لیکن وہ چل نہ سکا، پشکرناتھ اب بھی کبھی کبھی کوئی انگریزی اخبار نکال لیتے ہیں، پیارے لال کو ادب سے لگاؤ بھی خاندانی ورثہ میں ملا ہے، اور چند افسانے لکھ کر شائع کئے ہیں۔ ان میں "پن چکی" اور "ایک ندی دو کنارے" اچھے افسانے ہیں، جو کشمیری دیہات سے اٹھائے گئے ہیں۔ "پن چکی" کشمیر کے ایک گاؤں کے غریب نوجوان، رحمان کی کہانی ہے، جو محنت مزدوری کرنے کے لیے پنجاب جاتا اور وہاں کچھ عرصہ قیام کرکے تھوڑا روپیہ پیس انداز کرکے وطن لوٹتا اور ایک پن چکی لگاتا ہے۔ گاؤں کی ایک لڑکی مہتاب، آٹا پسوانے پن چکی پر آتی ہے، اس آمد و رفت سے، دونوں میں اُنس اور محبت پیدا ہو جاتی ہے۔ رحمن مہتاب سے کسی طرح آشنائی بڑھاتا جاتا ہے، اسے خوبی سے بیان کیا ہے۔ لکھتے ہیں:-

"ایک دن اس نے اس کے پھول جیسے گالوں کو تھپکایا، اسکی انگلیوں کی پوروں کو چھُوا، اس کی نازک کلائیوں میں کھنکھناتی ہوئی چوڑیوں سے کھیلا، اور بھونرے کی طرح اس کے اردگرد منڈلاتا رہا" ___

افسانے کا انجام دلکش ہے، دوسرا افسانہ ایک یتیم لڑکی سوہنی کی داستان ہے۔ پیارے لال ترقی پسند تحریک سے متاثر ہیں۔ جس کے

آثار اس افسانے میں ملتے ہیں۔ یہ دونوں افسانے "پیام انقلاب" (۱۹۵۷ء) میں شائع ہوئے۔ اسی اخبار میں ان کے کچھ مضامین بھی شایع ہوئے ہیں۔ ایک مضمون ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی پر ہے۔

کُلدیپ رعنا کے نام سے جانکی ناتھ رینہ افسانے اور تنقیدی مضامین بھی لکھتے ہیں۔ وہ کشمیر کے ایک گاؤں سے تعلق رکھتے ہیں، تعلیم انھوں نے سرینگر میں پائی اور جموں و کشمیر یونیورسٹی سے اردو میں ایم، اے کامیاب کیا۔ اس وقت ڈاکٹریٹ کے لئے پریم چند کے بعد اردو افسانوں کے ارتقا پر مقالہ مرتب کر رہے ہیں۔ کہانی کہنے کا ذوق انھیں زمانہ طالب علمی سے رہا۔ ۱۹۶۶ء کے آخر تک ان کے افسانے اکھٹے ہو گئے کہ انھیں ایک مجموعے کی صورت میں شائع کیا۔ اس مجموعہ میں گیارہ افسانے اور ایک ڈراما شامل ہے۔ ڈراما کا عنوان "نرگس کے پھول" رکھا ہے۔ مجموعے پر تقریظیں، کمال احمد صدیقی، ڈاکٹر شکیل الرحمٰن، اور ڈاکٹر شمیم نکہت عباس نے لکھی ہیں۔

کلدیپ میں افسانہ نگار کے جوہر ہیں، اور وہ اپنے موضوع اور اپنے کرداروں سے بخوبی واقفیت رکھتے ہیں۔ وادی کے دوسرے افسانہ نگاروں کی طرح، اُن کے افسانوں کا پس منظر بھی عموماً کشمیر کی زندگی ہے، اور کشمیری زندگی کے حسن و قبح کا انھیں عرفان ہے، اکثر وہ نیچے طبقے سے تعلق رکھنے والوں کی زندگی کو موضوع بناتے ہیں، کچھ افسانے اپنے طالب علمی کے زمانے کے مشاہدات کے بارے میں بھی لکھے ہیں۔ ریڑھا یا ٹھیلا کھینچنے والے، بوٹ پر پالش کرنے والے، ہوٹل کے بیرے اور نادار طالب علم کی زندگی اور اس کی نفسیات کا مشاہدہ وہ گہری نظر سے کرتے ہیں اور انھیں صاف ستھری

زبان اور ادبی اسلوب اظہار پر بھی قدرت ہے۔ افسانے کا دیباں کے

اتار چڑھاؤ کو بھی اچھی طرح سمجھتے ہیں، اسی لئے ان کے مجموعے "تنہائیاں"
کے سارے افسانے فن کے ایک معیار کو چھو لیتے ہیں۔

افسانوں میں انداز اور تکنیک کو بدلنے کی ضرورت اور اس کے گر سے
بھی کلدیپ ناشناس نہیں۔ بلکہ افسانے کو حقیقت کا روپ دینے اور
تاثر پیدا کرنے کے لئے، ان کی حیثیت کے لحاظ سے ان کے لب و لہجے کی
تبدیلی کو بھی نظر انداز نہیں کرتے، اس سے ان کی افسانہ نگاری کے
بارے میں بڑی اچھی توقعات وابستہ ہو جاتی ہیں۔ کہیں کہیں کرداروں
کی نفسی، الجھنوں اور کیفیتوں کو سمجھنے اور انھیں پیش کرنے کا بھی انھیں
شعور ہے۔ بعض افسانے خاص طور پر "نفرت" جو اس مجموعے میں شامل
ہے، مکالموں کے اعجاز اور برجستگی کی اچھی مثال ہے۔

"جاوید، میں تم سے آخری بار کہہ رہی ہوں کہ تم ان شرارتوں سے
باز آ۔۔۔ ورنہ۔۔۔

ورنہ کیا؟

تمہارا سر اڑا دوں گی۔

میرے سر کی قسم

جاوید!

فرمائیے

مکالموں میں لفظوں کی یہ حسین کفایت، دوسرے افسانوں میں بھی
ملتی ہے۔

غلام محمد آخیر، بارہمولہ کے متوطن، ایک سکول کے مدرس ہیں۔ اور افسانے
لکھنے کا بھی انھیں ذوق ہے۔ کچھ افسانے اخباروں یا رسالوں میں شائع ہوئے

ہیں۔ ان کا ایک افسانہ "ولر کے کنارے" ولی آہنگر اور اس کی بیوی سارہ کی کہانی ہے، جو خزاں کی ایک صبح شکارے پر چڑھ کر بابا شکر الدین کی زیارت کو جارہے تھے کہ راستے میں برف و باراں کے طوفان نے آگھیرا۔ وہ ولر میں محمد شونٹھ کے ڈونگے میں پناہ لیتے ہیں۔ اس کے دو لڑکوں کو دیکھ کر لاولد سارہ کے دل میں اولاد کے لیئے جذبہ اٹھا ہے، اسے آجر نے خوبی سے بیان کیا ہے۔ ان کا دوسرا افسانہ "بیساکھی" ایک سپاہی کے محاذ پر لڑتے ہوئے اپنی ٹانگ نذر کر دینے کا افسانہ ہے، جس کی تہ میں انسانی ہمدردی پوشیدہ ہے۔

وادی کے افسانہ نگاروں، جنھیں افسانہ نگار کی حیثیت سے ایک خصوصیت حاصل ہوگئی ہے۔ نور شاہ بہت نمایاں ہیں۔ ان کی ولادت سری نگر کے محلہ ڈل گیٹ میں ۱۹۳۶ء میں ہوئی۔ سرینگر ہی میں تعلیم پائی، لیکن ان کی دلچسپی کے مطالعے درسی مطالعے پر غالب آتے رہے۔ اسلیئے تعلیم ترک کرنا پڑی اور ملازمت اختیار کرلی۔ کچھ عرصہ مشیر تعلیم کے دفتر سے وابستہ رہے۔ معتمدی تعلیمات میں بھی کارگذار رہے۔ اب دیہات سدھار میں کارگذار ہیں اور رسالہ "دیہات سدھار" کی ادارت بھی ان کے سپرد ہے۔

ادب اور خاص طور سے افسانہ نگاری کا شوق انھیں بچپن سے رہا، لیکن ۱۹۵۸ء سے باضابطہ میدان میں آگئے۔ پہلے وہ "شاہدہ شیریں" کے فرضی نام سے لکھتے تھے۔ اس فرضی نام کو اختیار کرنے کا سبب وہ اڈیٹر حضرات کی عجیب نفسیاتی افتاد بتاتے ہیں۔ پہلے جب وہ اپنے نام سے رسالوں کے لئے افسانے بھیجتے تو اڈیٹر انہیں لوٹا دیتے۔ بعد میں جب یہی افسانے وہ شاہدہ شیریں کے نام سے بھیجنے لگے، تو اڈیٹر صاحبان

نے انھیں سر آنکھوں سے لگایا۔

نور شاہ وادی کے افسانہ نگاروں میں غالباً سب سے زیادہ لکھنے والے افسانہ نگار ہیں۔ ان کے افسانوں کے چار مجموعے (۱) "بے گھاٹ کی ناؤ" جس میں دس افسانے شامل ہیں۔ (۲) "ویرانے کے پھول" جو بارہ افسانوں پر مشتمل ہے۔ (۳) "من کا آنگن اداس اداس"، اس میں چھ افسانے شامل ہیں۔ (۴) ان افسانوں میں ایک "لمحے اور زنجیریں" طویل مختصر افسانہ ہے۔ (۴) "ایک رات کی ملکہ" اس میں گیارہ افسانے ہیں۔ پانچواں مجموعہ جو کوئی بائیس یا چوبیس افسانوں پر مشتمل ہے، مرتب کر لیا ہے۔

نور شاہ نے ایک ناول بھی لکھا ہے اور ایک ناولٹ بھی ان کی تصنیف ہے۔ کہانی لکھنے میں انھیں نہ صرف ذوق ہے، بلکہ سلیقہ اور اچھا سلیقہ ہے۔ ایک اچھے افسانہ نگار کی طرح، وہ ہر موضوع سے ایک موثر افسانہ اور ہر موقف سے دلچسپ مرقع پیدا کر سکتے ہیں۔ جہاں ان کے موضوع میں دم نہیں، اسے بھی اپنے پیش کشی کے انداز اور فنی چابک دستی سے وہ جیتا جاگتا بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ سینکڑوں کردار انھوں نے پیدا کئے ہیں، تاہم ان میں یکسانیت بہت کم ہے، وہ حقائق کے افسانے لکھتے ہیں، لیکن رومانی حقائق کے۔ اس عہد کے افسانہ نگاروں کی طرح انھیں بھی مظلوم اور مفلوک انسانوں سے ہمدردی ہے، اکثر افسانوں میں انسان دوستی کے جذبے کا کام لیتے ہیں۔ کشمیری عوام کی زندگی، ان کے جذبات ان کے رنج و غم، ان کی مسرتوں، ان کی تمناؤں اور خواہشات کے کتنے ہی مرقعے ان کے افسانوں کی کثیر تعداد میں ملتے ہیں۔ بیانیہ کے سلسلے سے گرچہ نور شاہ کا ایک ۔۔۔ ایک وضع

پیدا ہو جاتی ہے۔ "گلاب کا پھول" کلرکوں اور چھوٹے عہدہ داروں کی زندگی کا افسانہ ہے، لیکن اس میں ایک نوجوان کلرک لڑکی، رانی کے داخل ہونے سے افسانے میں ایک دلچسپی پیدا ہو جاتی ہے۔ مٹھو رام چپراسی کے بیانیہ میں آپ بیتی کے اشارے بیانیہ سلسلہ سے گریز کی اچھی مثالیں ہیں۔ رانی کے کمرہ میں چہل پہل کے ذکر کا انداز:۔

"لیکن زیادہ چہل پہل رانی کے کمرہ میں رہتی تھی، ایسی چہل پہل جو صرف اشاروں اور سرگوشیوں کی پیداوار ہوتی ہے۔ زبانیں خاموش رہتیں، آنکھیں باتیں کرتیں۔"

نور شاہ کرداروں کی بیرونی رنگ کاری کے علاوہ، اکثر ان کے بطون کی گہرائیوں میں بھی جھانکنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مثلاً "اندھے کا خواب" میں بچے کی بیقراری، جو اس کے اسی احساس کی پیدا کردہ ہے کہ کوئی اسے ماں کا پیار نہیں دیتا۔ "گلاب کا پھول" کے مٹھو رام کا کہنا کہ "میں اپنی خوشی کا اندازہ اپنی اداسی سے لگاتا ہوں۔ اُداس ہو جاوں تو سمجھ لیتا ہوں کہ آج بہت خوش ہوں۔" ایک عجیب پیچیدہ نفسی کیفیت ہے۔

افسانوں میں ڈرامائی موقف پیدا کرنے کی وہ شعوری کوشش کرتے نظر آتے ہیں۔ مذکورہ بالا افسانے میں یہ صورت نمایاں ہے۔ "اندھے کا خواب" میں واقعات کی نشو و نما اس طرح ہوتی ہے کہ موقف خود بخود پیدا ہو جاتا ہے۔ فرائڈ کے جنسی نظرے سے وہ متاثر ہیں، اور جنسی نفسیات کو پیش کرنے میں انھیں دلچسپی ہوتی ہے، تاہم وہ بات کھل کر کہنے سے ہچکچاتے ہیں۔ اس لئے انھیں اکثر بیان کے پیچ و خم کی راہیں اختیار کرنی پڑتی ہیں۔

فضائی عہد کے اس افسانہ نگار نے عہد کے شعور کو افسانوں میں نمایاں

کرنے کے لیئے بھی مواقع نکال لیئے ہیں۔ مثلاً "بے گھاٹ کی ناو" میں پوشکر گاوں میں بیٹھا ہوا سوچتا ہے :۔

"شہر میں رہ کر ہم لوگ روس اور امریکہ کے چاند تک پہنچنے کے منصوبوں پر غور کرتے ہیں، لیکن آج میں سوچتا ہوں۔ ہم بیوقوف ہیں ...... "

آگے وہ اپنے ادب اور اس ادب کی فضا میں نشو ونما پائے ہوئے ذہن کی اپیج اس انداز سے کرنا چاہتا ہے :۔

"ہم بیوقوف ہیں۔ چاند تو پوجنے کی چیز ہے۔"

اور پھر اس کے ساتھ ہی ایک نفسیاتی دباو کو ظاہر کرنے والا فقرہ یہ جوڑ دیتا ہے۔

"لیکن ہم ہیں کہ خوبصورتی کو کی جستجو میں مبتلا رہتے ہیں۔"

"مونالیزا" نورشاہ کے حسین افسانوں میں سے ہے۔ اس کے نام کی طرح اس کا موضوع اور اس کی تکنیک بھی افسانے کے لیئے اجنبی سے معلوم ہوتے ہیں۔ نورشاہ کو کہانی لکھنے پر اب اتنی دسترس حاصل ہوگئی ہے کہ وہ تکنیک بدل بدل کر لکھتے ہیں۔ "مونالیزا" کے علاوہ "ایک رات کی ملکہ" بھی اس نقطہ نظر سے پڑھنے کے قابل ہے۔ وہ کافی لکھتے ہیں، اس لیئے، ان کے افسانے سب کے سب ایک ہی معیار کے نہیں ہیں، تاہم افسانے کو کچھ دینے کی ان کی کوشش مستحسن ہے۔ ان کے حالیہ افسانوں میں شعوری رو کی تکنیک بھی آزمائی گئی ہے۔

نورشاہ کا ایک ناولٹ "پایل کے زخم" اور ایک ناول "نیلی جھیل کے کالے سائے" بھی چھپ چکے ہیں۔ ناول ناکام محبت لڑکی انیتا کی داستان ہے، جو محبت کی تلاش میں سایوں کو حقیقت سمجھ کر ان کے

پیچھے دوڑتی ہے۔ 'نیلی جھیل اور کالے سائے' دراصل علامتیں ہیں، جن کو بلیغ انداز میں استعمال کیا گیا ہے۔

ساگر کاشمیری اور میرزا محمد یٰسین بیگ نے بھی افسانے لکھے ہیں۔ برج کشن لابرو ساگر نے جموں و کشمیر یونیورسٹی سے اردو میں ایم، اے کا امتحان کامیاب کیا ہے۔ افسانہ وہ عرصے سے لکھ رہے ہیں، اور کچھ افسانے شایع بھی ہوئے ہیں۔ ان کے ابتدائی افسانے مشقیں ہیں، لیکن اب وہ فن اور اسلوب پر قابو پا رہے ہیں۔ ان کے شائع شدہ افسانوں میں "زلزلہ"، جو "ہمارا ادب" (سنہ ۱۹۶۹ء) میں چھپا ہے۔ افسانہ کشمیر کے ایک گاؤں کی زندگی کا بڑا اچھا مرقع ہے، جہاں مختلف فرقوں میں صلح و آشتی گویا وہاں کی فطرت تھی، اسی فضا میں ایک اتفاقی واقعہ ایک ہل چل پیدا کرنے کا سبب بن جاتا ہے۔

یٰسین بیگ کا ذکر ان کی شاعری کے سلسلے میں گذر چکا ہے، اب وہ افسانے بھی لکھ رہے ہیں۔ ان کا ایک اچھا افسانہ "من کے منڈپ میں" شائع ہوا ہے، یہ مختصر افسانہ، جس میں ایک بوڑھے کسان کی بیوی مرنے کے بیس سال بعد، نئی شادی کی خواہش کو ایمائی انداز سے پیش کیا گیا ہے۔

نور محمد روشن جو ترقی پسند تحریک کے صف اول میں نمایاں رہے، کشمیری کے ادیب، شاعر اور ڈراما نگار ہیں۔ کلچرل فرنٹ، کلچرل کانگریس اور انجمن ترقی پسند مصنفین کے وہ سرگرم کارکن رہے۔ ان کی مخصوص دلچسپی ڈراما اور اسٹیج ہے۔ خود ڈرامے لکھے اور انھیں اسٹیج پر کیا اور اداکاری میں بھی حصہ لیا۔ اردو میں ان کی کہانیاں چھپی ہیں۔ علی محمد لون کی شرکت میں، روشن نے ایک لوک کہانی کو ایک نئے روپ میں پیش کیا ہے۔ راجا کے محل میں ٹکڑوں پر پلنے والے [illegible] کے [illegible] اور عیش و عشرت کی

زندگی کو دیکھ دیکھ کر، خود بھی عیش و عشرت کی زندگی گذارنے کے خیال پکاتا ہے، لیکن عیش کی زندگی گذارے کیسے؟ اس کی سہیلی اس کے ذہن میں یہ آتی ہے کہ وہ ٹھگی اختیار کرے۔ وہ ٹھگ بن جاتا ہے۔ جب لوگ اس کی کرتوت سے تنگ آکر راجا سے فریاد کرتے ہیں، تو وہ اپنے پولیس کے افسر کو اس کی گرفتاری کے لئے بھیجتا ہے، جب اُسے کامیابی نہیں ہوتی تو وزیر کو روانہ کر دیتا ہے۔ آخر خود جا کر اسے گرفتار کرنا چاہتا ہے۔ لیکن لڑکا اسے بھی ٹھگتا ہے۔ راجا اس کی چالاکی دیکھ کر اس کے قصوروں کی معافی کا اعلان کرتا اور ٹھگ کو اپنے دربار میں ایک اونچا عہدہ دے کر، لوگوں کو اس کی لوٹ کھسوٹ سے نجات دلاتا ہے۔

اس کہانی کا عنوان "ٹھگ" ہے اور یہ "کونگ پوش" کے شمارہ جون ۱۹۵۴ء میں شائع ہوئی ہے۔

ناول

ناول عام طور پر افسانے کی طرح مقبول صنف نہیں ہے، اس کے باوجود ریاست کے ادیبوں کے افکار سے جو ناول اس عہد میں تخلیق پائے ان کی تعداد، کسی اور ریاست میں لکھے گئے ناولوں کے مقابلے میں زیادہ ہی ہے۔ اکثر ناول نگار افسانہ نگار بھی ہیں، لیکن جن ادیبوں کو خصوصی افسانہ نگار کی حیثیت حاصل ہو گئی ہے، ان کے ناولوں کا تذکرہ پچھلے باب میں گذر چکا ہے۔ ایسے ادیب جن کو خصوصی ناول نگار کا مقام حاصل ہو چکا ہے، وہ آزادی کے بعد کے نئے حالات میں جو سماجی شعور بیدار ہو رہا ہے، اور جو مسایل اہلِ فکر ادیبوں کے ذہن کو مصروف رکھے ہوئے ہیں، ان سے نبٹنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ یہ ادیب اور ناول نگار اکثر سماجی نابرابری، استحصال اور استحصال کرنے والی قوتوں کے خلاف، خواہ وہ سیاسی ہوں، مذہبی یا سماجی، ان سب کے خلاف احتجاج کر رہے ہیں۔

ریاست میں افسانہ نگاری اور ناول نگاری کا رجحان، پریم چند کی تخلیقات کے اثر میں ابھرنے لگا تھا، لیکن پریم چند کا اثر زیادہ افسانوں میں نمایاں ہوا، اس دور میں جب اچھے اور فنی ناول لکھے جانے لگے، تو ان پر بھی پریم چند کی فکر اور فن کا سایہ پڑتا رہا۔ تاہم یہ عہد نئے مسایل کو جنم دینے کا باعث ہوا تھا اور نئے مسایل نئے انداز کا برتاو چاہتے تھے۔ قدیم نظام زندگی سے اکتاہٹ، اور ذہنی تسکین کے لئے نئے نئے خیابانوں کی تلاش، اس کے عہد کے افسانوں کی طرح ناولوں کا بھی خاصہ ہے۔ نیا اندازِ فکر، نئے اندازِ اظہار اور نئے اسالیب کا بھی متقضی تھا، چنانچہ ناول میں بھی نئے اسالیب کو نمایاں اہمیت حاصل ہو گئی ہے۔

ریاست کے موجودہ دور کے ادیبوں میں، جن کی شہرت کی بنیاد ان کے

ناول ہیں، ٹھاکر پونچھی ایک مقام رکھتے ہیں۔ یوں انھوں نے افسانے بھی لکھے
ہیں، اور ان کے افسانے نقادوں کی نظر میں معیاری تسلیم کئے جاتے ہیں۔ تاہم
ان کی شہرت کی بنیاد ان کے ناول ہیں۔ پونچھ کی مردم خیز سرزمین جہاں سے
قد آور ادیب پیدا ہوتے رہے، ان کا وطن مالوف ہے، جہاں ان کی ولادت
۱۹۲۵ء کے لگ بھگ ہوئی۔ ابتدائی تعلیم پونچھ میں پائی، اور اس زمانے
میں ٹھاکر کو ڈراما سے بڑا لگاؤ پیدا ہو گیا تھا۔ انھوں نے کئی ڈراموں میں
کام بھی کیا۔ ڈرامے کی طرف ان کی رغبت، آغا حشر کاشمیری کے ڈرامے تھے،
جو جموں میں تھیٹریکل کمپنیاں، اسٹیج پر دکھاتی تھیں۔ ان کی نوعمری کا دوسرا
شوق، جیسا کہ دیوندر ستیارتھی نے لکھا ہے، قوالی تھی۔

پونچھ میں اپنی تعلیم ختم کر کے ٹھاکر، جب جموں آئے اور پرنس آف
ویلیز کالج میں داخل ہوئے تو ان کے استفادے اور نقل و حرکت کی فضا
وسیع تر ہو گئی۔ یہاں وہ پریم چند سے بہت متاثر ہوئے، اور یہ اثر
اب تک بھی کسی نہ کسی صورت میں ان کی تخلیقات میں نظر آتا ہے۔ ٹھاکر
افسانے لکھنے لگے اور ان کا پہلا افسانہ "راجہ" کالج کے رسالے "توی"
میں شائع ہوا۔ اس کے بعد کئی اور افسانے انھوں نے لکھے جو کشمیر اور
بمبئی کے رسالوں میں شائع ہوئے۔

تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد ٹھاکر کو محکمہ سیلائز میں ایک اسامی
مل گئی۔ یہ کام ان کی طبیعت کے مناسب نہیں تھا، تاہم وہ کچھ عرصہ تک
اس سے وابستہ رہے اور بالآخر ۱۹۴۸ء میں ریڈیو کی ملازمت کے سلسلے
میں وہ دہلی چلے گئے اور ڈوگری اور کشمیری یونٹ میں برسرکار ہیں۔ لیکن
جیسا کہ دیوندر ستیارتھی نے اشارہ کیا ہے، دہلی کی زندگی سے ان کو دلبستگی

پیدا نہ ہو سکی، کیونکہ جنم بھوم کی یاد اُسے بُری طرح سے ستاتی ہے ... ...

بات چیت میں ٹھاکر کشمیر کا ذکر لے بیٹھتا ہے اور کشمیر کا ذکر شروع ہوتے ہی، اس کی آنکھوں میں چمک سی آجاتی ہے۔ گاؤں گاؤں، پہاڑ پہاڑ گھومنے کی باتیں سُنانے ٹھاکر پر ایک نشہ سا طاری ہو جاتا ہے۔" وطن کے گاؤں اور پہاڑوں کی یہی محبت، ان کے اکثر افسانوں اور ناولوں کا پس منظر بھی ہے۔

ٹھاکر بہت سے افسانوں اور پانچ ناولوں کے مصنف ہیں۔ ان کے افسانوں کے دو تین مجموعے بھی شائع ہو چکے ہیں۔ " زندگی کی دوڑ"، جس میں دس افسانے شامل ہیں، ان کے بہترین افسانوں پر مشتمل ہے۔ دیویندر ستیارتھی نے اس پر پیش لفظ لکھا ہے، جس میں ٹھاکر کی افسانہ نگاری کے رجحانات پر روشنی ڈالی ہے۔ وہ لکھتے ہیں :-

" ٹھاکر کے بیشتر افسانوں میں بڑی چابکدستی سے کام لیا گیا ہے۔ افسانے کی ہیئت میں مصنف ایک کہنہ مشق ایکٹر کی طرح اپنی شعوری پختگی سے کام لیتا ہے۔ زبان کا بہاؤ پورے رکھ رکھاؤ سے آگے بڑھتا ہے۔"

ٹھاکر کے افسانوں اور ناولوں میں بیانات کی دلچسپ تفصیلات اور اثر اس وجہ سے نمایاں ہے کہ وہ عموماً اپنی جانی بوجھی فضاؤں، شناسا ماحول اور جانے پہچانے اشخاص سے متعلق لکھتے ہیں۔ ان کے مرقعوں میں حقیقت کی پوری جھلک بھی اسی وجہ سے پیدا ہو جاتی ہے۔ پریم چند کے انداز فکر کا اثر ٹھاکر پر گہرا ہے۔ مثلاً ان کے ناول " بادل برسے" کا ہیرو، ہردیش اپنے اصلاحی تصورات میں پریم چند کے بعض کرداروں سے بہت مشابہ ہے۔ لیکن وہ پریم چند کے اس نوع کے کرداروں سے زیادہ رومانی ہے، اور

دن کو خواب دیکھنے کا عادی۔ چنانچہ جب ہم دیکھتے ہیں کہ بوڑھا پنڈت لبھو رام، جس سے ایسے اصلاحی خیالات کی توقع نہیں ہو سکتی تھی، اونچ نیچ، ذات پات کے بندھنوں کو توڑنے کے لئے میدان میں اُتر آتا ہے، تو ہر دلیش ایک منفی کردار بن کر رہ جاتا ہے۔ پریم چند کے ناولوں میں خاص طور پر، اپنے عقیدہ کے مطابق انجام دکھانے کے لئے، واقعات کی فطری رفتار کو قابو میں رکھنے کی کوشش ملتی ہے، لیکن ان کے ہاں انجام واقعات کی رفتار کا فطری نتیجہ ہوتا ہے۔ یہ ٹھاکر پونچھی کے عہد تک فن کے ارتقا کا بھی نتیجہ ہے۔ ایک اور بات یہ ہے کہ ٹھاکر کا سماجی شعور بھی پریم چند کے عہد سے آگے بڑھا ہوا ہے۔ ٹھاکر کے مکالموں کے بارے میں ستنیارتھی نے یہ بات ٹھیک لکھی ہے کہ ان میں موقعہ محل اور کردار کی حیثیت کے مناسب اتار چڑھاو اور لوچ نہیں ہے۔

ٹھاکر نے کوئی پانچ ناول لکھے ہیں، جن میں سب سے پہلا ناول "رات کے گھونگھٹ" ان کے فن کے ابتدا کی نمائندگی کرتا ہے۔ ان کا دوسرا ناول "ڈیڈی" اس کے بعد جلد ہی شائع ہوا۔ ان کے تیسرے ناول "وادیاں اور ویرانے" کی اشاعت کے بعد، ناول نگار کی حیثیت سے ان کا مرتبہ بہت بلند ہو گیا۔ بعد کے ناولوں میں "یادوں کے کھنڈر"، "شمع ہر رنگ میں جلتی ہے"، "زلف کے سر ہونے تک"، "چاندنی کے سائے" یکے بعد دیگرے لکھے گئے۔ "یادوں کے کھنڈر" ٹھاکر پونچھی کے دو اردو کے ناولوں میں ایک منفرد انداز کا کارنامہ ہے۔ پہاڑی سینی ٹوریم، اس کی جائے وقوع، دلکش ماحول، اور سب سے بڑھ کر، زندگی کے مرقعے، ایسے ہیں جو شاید ٹھاکر کے علاوہ کسی اور کے قلم سے نہیں کھینچے جا سکتے تھے۔ سینی ٹوریم اور اس کے دق کے مریضوں کی فضا خود ایک گھمبیر موضوع ہے لیکن یہیں

اور رابرٹ کا المیہ، جس کو ناول نگار بڑی خوبی کے ساتھ حسن انجام کو پہنچاتا ہے، ایسا موثر اور محویت زا ہے کہ اس خاص ماحول میں ایسے مرقعے اردو ناولوں میں کم ہی مل سکیں گے۔ رابرٹ کی محبت میں از سر تا پا ڈوبی ہوئی ننیتی، ناول کی اصل ہیروئن بن جاتی ہے، اور اس کے مقابلے میں ڈاکٹر اور رحمن، جن کے کردار کو ابھارنے میں ٹھاکر نے پورے جتن کئے ہیں ثانوی حیثیت کے کردار بن جاتے ہیں۔

ناول کے درمیانی وقفوں میں ٹھاکر افسانے لکھتے رہے "زندگی کے موڑ" کے علاوہ ان کا ایک اور مجموعہ "چناروں کے چاند" شائع ہو چکے ہیں۔ ان کے مجموعے "زندگی کے موڑ" کے افسانوں کے بارے میں دیوندر ستیارتھی نے جو تبصرہ کیا ہے، وہ ان کے اکثر افسانوں پر صادق آتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ ہر ایک افسانے کا موضوع جدا اور ان کو پیش کرنے کا انداز بھی منفرد ہے، تاہم جو رجحانات عام طور پر ان کے افسانوں میں نمایاں ہیں، وہ سمجھ میں آجاتے ہیں۔ اس مجموعے کے افسانوں "موت کے سائے کے تلے"، "ڈھولک بجتی رہی" کے علاوہ "اندھے کی بیوی"، "معاوضہ"، "زعفران"، "وسوندھا سنگھ دردی" بھی موضوع کی ندرت، کرداروں کی اٹھان اور تکمیل کے لحاظ سے اچھے افسانے ہیں۔

ٹھاکر پونچھی کا ایک اہم ادبی کارنامہ نیلامبر دیو شرما کی ڈوگری ادب پر تصنیف کا اردو ترجمہ "جدید ڈوگری ادب کا ارتقا" ہے جو بہت سلیس انداز میں کیا گیا ہے۔ یہ ترجمہ کلچرل اکادمی کی جانب سے شائع ہوا ہے۔[1]

ٹھاکر پونچھی کے بھائی مدن ٹھاکر بھی افسانہ نگار ہیں۔ یہ اس وقت

[1] ٹھاکر صاحب چند سال پہلے جموں میں ایک حادثے کا شکار ہو گئے۔

جموں کے صدر خزانہ میں کام کر رہے ہیں۔

علی محمد لون، جو اس وقت[1] کلچرل اکادمی کے ڈپٹی سکریٹری ہیں، گوناگوں صلاحیتوں کے ادیب ہیں۔ انھوں نے ایک دریا کا ناول اردو کو دیا ہے، اس کے علاوہ کئی افسانے اور کچھ ڈرامے بھی لکھے ہیں، کئی تنقیدی مضامین ان کے قلم سے نکلے ہیں۔ اردو کے علاوہ وہ کشمیری میں لکھتے ہیں، اور کشمیری کے موجودہ ادیبوں میں ان کا ایک پایہ ہے۔

لون کی ولادت ۲۷ ستمبر ۱۹۲۷ء میں کو سرینگر کے تاریخی محلہ درگجن میں ہوئی۔ ان کے والد فارسی کے عالم تھے، چنانچہ ابتدائی تعلیم والد ہی کے یہاں پائی اور کریما، اور گلستان کے درس کی تکمیل کی۔ اسی عرصہ میں انھیں اردو کی داستانیں پڑھنے کا شوق پیدا ہوا، چنانچہ سکول میں شریک ہونے تک وہ طلسم ہوشربا اور کچھ سراغ رسانی اور ڈاکوؤں کے ناول پڑھ چکے تھے۔ ساتویں جماعت میں انھیں جدید دور کے اردو افسانہ نگاروں، پریم چند اور سدرشن، اور حافظ نذیر احمد کے قصوں اور عبدالحلیم شرر اور راشد الخیری کے ناولوں کو پڑھنے کا موقع ہوا۔ یہی مطالعہ ان میں قصہ گوئی کی حس کو بیدار کرنے کا باعث ہوا۔

جب وہ دسویں میں تھے، ترقی پسند ادب کی تحریک ہندوستان میں پھیل رہی تھی، اور سعادت حسن منٹو، کرشن چندر، عصمت چغتائی وغیرہ کے کارنامے مقبولیت حاصل کر رہے تھے۔ لون نے ان کی تخلیقات کا مطالعہ بھی شروع کیا۔ ترقی پسند شعرا کے کلام سے بھی انھیں اسی زمانے میں دلچسپی پیدا ہوئی۔ انگریزی کی شد بد جب بڑھی، تو انگریزی مصنفین کے کچھ کارنامے مطالعہ کیے اور انگریزی کے واسطے سے روسی

[1] لون صاحب اب وظیفہ حسن خدمت حاصل کر چکے ہیں۔

ادیبوں کی تخلیقات تک رسائی حاصل کرنے کا انھیں موقع ملا۔ لکھنے کا شوق انھیں بچپن سے تھا، لیکن ۱۹۴۶ء میں انھیں سب سے پہلے طباعت کیلئے لکھنے کی جرأت ہوئی، ان کا پہلا افسانہ "گھر سے کالج تک" جموں کے ماہ نامہ "پریم" میں چھپا اور ایک مضمون بمبئی کے ہفتہ وار "نظام" میں شائع ہوا۔ اس سے ان کے حوصلے بڑھ گئے۔ اسی دوران ۱۹۴۸ء میں نون کو ریڈیو کشمیر میں ملازمت مل گئی ہے اور جیسا کہ ان کا اعتراف ہے ــــ "ریڈیو ملازمت کے دوران میری صلاحیتوں کو جلا ملی"۔

ریڈیو میں وہ کئی حیثیتوں سے کام کرتے رہے، لیکن ان کی دلچسپی کا مرکز ریڈیو ڈراما رہا، چنانچہ بیسوں ڈرامے لکھے، جن میں چند دوسری زبانوں سے ماخوذ ہیں اور بہت سے طبعزاد۔ اس وقت تک نون کو اپنے مشاہدہ میں اعتماد پیدا ہو چکا تھا، اور انھوں نے کچھ مقامی موضوعات کو اپنے افسانوں میں برتنے کی کوشش کی۔ ان میں سے ایک ڈراما "گھروندے" ہانجیوں کی زندگی کے بارے میں تھا، اس کے بعض حصوں سے اس طبقے کے لوگوں میں ناراضگی پھیل گئی اور ایک دن وہ ریڈیو سٹیشن کے سامنے جمع ہوئے، اور نون کے خلاف مظاہرہ کیا۔ سوفوکلیز کے ڈرامے "انٹی گونی" کا ترجمہ بھی نون نے "چور" عنوان سے کیا ہے، یہ جب نشر ہوا، تو اس وقت کی حکومت ان سے ناراض ہو گئی تھی۔ لیکن یہ ڈرامے ادبی حلقوں میں بہت پسند کئے گئے۔ اور نون اپنے زمانے کے چوٹی کے اردو ڈراما نگاروں میں شمار ہونے لگے تھے۔

نون نے اسٹیج کے لئے بھی کچھ ڈرامے تصنیف کئے ہیں، جن میں سے "دیوانے کا خواب" کلچرل کانگریس کے اہتمام سے ۱۹۵۶ء میں اسٹیج پر دکھایا گیا۔ "چٹان" ۱۹۵۴ء میں سرینگر کالج کے طلبا نے پیش کیا، ایک اور ڈراما

"غالو جان کا خواب"، سنہ ۱۹۶۲ء میں ایک کلب کی جانب سے پیش ہوا۔ یہ ڈراما دوستو ویسکی کے انگریزی ترجمے "مائی انکلز ڈریم" پر مبنی ہے۔

افسانہ، جوان کی پہلی دلچسپی تھی، اس کی پیش رفت میں لون نے وقفہ وقفہ سے اب تک کوئی سولہ افسانے لکھے، اور یہ سب ملک کے ادبی رسالوں جیسے "آجکل" "شیرازہ" "تعمیر" (سرینگر) "شاہراہ" "پگڈنڈی" (امرتسر) "راہی" (امرتسر) "محور" (دہلی) اور "بیسویں صدی" میں شائع ہوئے۔ ان میں سے کئی کہانیاں فنی لحاظ سے اونچا پایہ رکھتی ہیں۔ لون کو کہانی لکھنے کا اچھا شعور ہے اور وہ انھیں فن اور اسلوب پر ہر لحاظ سے سڈول بنانے کے گُر پر پوری دسترس رکھتے ہیں۔ ان میں نئے فن اور فکر کی جھلکیاں بھی ملتی ہیں۔ اسی لئے ان کی کہانیاں ملک بھر میں مقبول ہوئیں اور کئی کہانیوں کے ترجمے ہندوستان کی مختلف زبانوں میں کئے گئے ہیں۔ لون کے موضوعات کی طرح ان کی تکنیک میں بھی بڑا تنوّع ہے۔ وہ ہر کہانی کا ٹھاٹھ نئے انداز سے باندھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ "پاپی پجاریوں کی سنتان" کا آغاز، کلہن کی "راج ترنگنی" کی طرف اشارے سے اس طرح ہوتا ہے:۔

"تم نے پنڈت کلہن کی راج ترنگنی پڑھی ہے؟"

"نہیں صرف نام سُنا ہے۔"

کشمیری زندگی اور اس کی تہذیب اور شائستگی کی طرف اشارے اکثر افسانوں میں ملتے ہیں اور کئی افسانے کشمیر کی زندگی پر مبنی ہیں۔ "چھینٹے اور انسان" جو "پرتاپ" (اکتوبر سنہ ۱۹۵۸ء) میں شائع ہوا ہے۔ سرینگر کے ایک محلے کی مٹر اور موٹھ بیچنے والی بڑھیا کی کہانی ہے۔

ان کے اور افسانوں کے عنوان ہیں :۔ "بچے" "شب خون" "نالے کا بادشاہ" "یہ محلہ" "مونچھوں والی گڑیا" "درد تنہائی" "سُکھ کا ساحل" "مطلب یہ کہ" "تصادم" "مسکراہٹ کا زخم" "آرزو کا سلسلہ" "تم سب میرے ہو" "تعویذ" "بت شکن" "مہمان"۔

اسلوب کا سنفرا پن اور اظہار میں اعجاز، لون کی اکثر کہانیوں کی نمایاں خصوصیت ہے۔ "مونچھوں والی گڑیا" معنی خیز ایجاز اور تنظیم کی اچھی مثال ہے۔ باپ اور ننھی لڑکی کا مکالمہ ہے :۔

تاشی !

ہاں پپا

ایک چیز

نہیں پپا

کیوں نہیں

ہم کھیل رہے ہیں

ہم بھی کھیلیں گے

نہیں پپا، بری بات ہے

لون ایک عمدہ ناول "شاہد ہے تیری آرزو" کے بھی مصنف ہیں۔ یہ ان کے دہلی میں قیام کے زمانے کے مشاہدات اور تجربات کی پیداوار ہے۔ لون ترقی پسند تحریک سے متاثر ہیں، وہ سٹیٹ کلچرل کانفرنس سے منسلک رہے اور اس کے ترجمان۔ "کونگ پوش" کی ادارت کے فرائض بھی انھوں نے انجام دیئے، لیکن ترقی پسندی کی شعوری تحریک اور نعرہ بازی کے اثر سے انھوں نے اپنی تخلیقات کو ہمیشہ بچائے رکھا۔ ادب وہ ایک آفاقی چیز

مانتے ہیں۔ اور زندگی سے اس کے گہرے رشتوں کی بھی آگاہی رکھتے ہیں۔ جدیدیت کے موجودہ رجحان کو بھی وہ ایک نعرہ بازی سمجھتے ہیں۔

لون نے کئی اچھے تنقیدی مضامین بھی لکھے ہیں۔ اردو کے علاوہ کشمیری کے بھی وہ اچھے ادیب ہیں اور کشمیری زبان اور ادب کی ترقی کی انھیں بڑی ٹوہ ہے اور ان کی کوشش ہے کہ اپنی نگارشات سے زیادہ سے زیادہ ہمدردیاں اپنی زبان کے لئے حاصل کریں اور یہ ایک فطری تقاضا ہے۔

تیج بہادر بھان، سرینگر کے ایک پنڈت خاندان سے ہیں، اور انھیں افسانے اور ناول سے گویا عشق ہے۔ افسانوں کا ایک مجموعہ "جہلم کے سینے پر" اور ایک ناول "سیلاب اور قطرے" شائع کر چکے ہیں، اور یہ ساری کاوش انھوں نے فلڈ کنٹرول کے محکمہ میں فورمین رہتے ہوئے کیں۔ بھان سرینگر کے محلہ حبہ کدل میں ۱۹۳۱ء میں پیدا ہوئے، تعلیم یہیں پائی اور پنجاب یونیورسٹی سے سائنس کے مضمون میں انٹرمیڈیٹ کا امتحان کامیاب کیا۔ ٹکنیکل کام سے انھیں بچپن سے دلچسپی تھی، اس لئے ہنگلی جاکر تربیت حاصل کی اور ملازم ہو گئے۔ اس وقت بارہمولہ میں کارگذار ہیں۔

افسانے لکھنے کا شوق انھیں بچپن سے تھا، لیکن ان کا پہلا افسانہ "لال چُنری" ۱۹۵۱ء میں لکھا گیا اور لوگوں کو بہت پسند آیا۔ اس سے بھان کا حوصلہ بڑھا اور انھوں نے کئی افسانے لکھ ڈالے۔ اس وقت تک ان کے افسانوں کے دو مجموعے "جہلم کے سینے پر" اور "عورت" شائع ہو چکے ہیں۔ پہلا مجموعہ ۱۹۶۰ء میں چھپا تھا، اور اس کے چار سال بعد دوسرا مجموعہ شائع ہوا۔

"جہلم کے سینے پر" جو اس تاجر کے مجموعے کا ابتدائی افسانہ ہے، منفرد

انداز کا افسانہ مانا گیا ہے، اور یہ بہت مقبول بھی ہے۔ یہ ایک حاملہ ہانجی عورت زونی کی کہانی ہے۔ وہ اور اس کا شوہر رزاق گھر میں چاول نہ ہونے کی وجہ سے شہر جاکر ٹھیکہ دار کو بجری پہنچانے اور اس سے کچھ روپیہ لے کر چاول اور ضرورت کی چیزیں شہر سے لانے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ ان کی کشتی جہلم کے سینے پر ڈولتی چلی تھی کہ زونی کو شدید دردِ زہ شروع ہوتی ہے۔ دونوں چپو تھامے کشتی کو کھے رہے تھے۔ کشتی اتنی بھاری تھی کہ کوئی ایک بھی اپنا چپو چھوڑنے سے ہراساں تھا کہ ندی کے بہاؤ سے کشتی بے قابو نہ ہو جائے، پاس دور تک کوئی آباد کنارہ بھی نہیں تھا کہ کسی کو مدد کے لئے پکارے۔ پیسہ نہیں تھا کہ کشتی چلانے میں مدد کے لئے اجرت پر مزدور مہیا کرے، پھر زونی کی تکلیف اور رزاق کی اس کی مدد کو دوسرے کنارے پہنچنے کی خواہش، لیکن چپو چھوڑ کر کشتی کے کنارے سے ٹکرا کر ٹوٹ جانے کا ڈر، اس ساری مجموعی اور پیچیدہ صورت حال کو بھان نے بڑی ہی ایمائی تفصیل کے ساتھ پیش کیا ہے۔ اسی کرب میں جو شدنی تھی وہ ہوئی، اور یہ اس کا پہلا تجربہ تھا۔

زونی کے کرب کا مرقع کھینچتے ہوئے بھان نے بڑے نازک موقعوں سے عہدہ برآ ہونے کی کوشش کرتے ہیں۔ ایک مرقع ہے:۔

"زونی کشتی کے کنارے بے بس دوہری پڑی تھی، وہ کچھ نہیں جانتی تھی کہ کیا ہو رہا ہے۔۔۔ کیوں ہو رہا ہے؟ صرف پیٹ کے نچلے حصے میں آگ سی دھک رہی تھی، جو اسے بُری طرح جلائے جا رہی تھی، وہ چپو سے سہارا لینے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس کے دماغ میں یہ خیال بُری طرح سے سما گیا تھا کہ یہ چپو ہی اسے اذیت سے نجات دلا سکتا ہے۔ اس کی انگلیاں چپو میں

گھس جانے کی ناکام کوشش کر رہی تھیں، لیکن یہ آگ، یہ تپش
کیوں کم نہیں ہوتی؟ .... اوہ .... یہ لال لال شعلے ....
خوفناک دہکتے انگارے اس کے چاروں طرف پھیلتے جا رہے
تھے ......"

اس مجموعے اور ان کے دوسرے مجموعے "عورت" میں متنوع کرداروں
جیسے ہانجی، مزدور، بیوپاری، اہل سیاست، طالب علم، نوجوان عورتوں،
کمسن بچوں، پولیس کے اہلکاروں، غرض انسانوں اور خاص طور پہ نیچے اور
متوسط طبقوں کی زندگی سے متعلق رکھنے والے انسانوں کا احاطہ سا ہو گیا
ہے۔ وہ انسانوں کی کمزوریوں کو بھی بیان کرتے ہیں اور ان کے محاسن کو بھی،
لیکن توازن کو کہیں ہاتھ سے نہیں دیتے۔ "سنتوش"، کہانی کی نوجوان لڑکی
سامنے کی کھڑکی سے ایک نوجوان کو روز گھورتا دیکھ کر اپنی روز بانی کا
احساس، "آخ تھو" کے مزدور محمدو کے دل میں سیاسی لیڈروں کی آمد کے موقع
پر جو مبالغہ آمیز انتظامات روا رکھے جاتے ہیں، جن میں سکولوں کے لڑکوں
کے وطنی یا قومی گیت بھی ہیں، جو بغاوت کے جذبات ابھرتے ہیں، وہ دراصل
نئے عہد کے مزدور کے جذبات بغاوت ہیں، جو ہمیشہ پیدا ہوتے رہے، لیکن
ان کے اظہار کے مواقع نصیب ہوئے ہیں۔ "میری اپنی بچی" ایک حزنیہ
ہے، جس میں شخصی تاثرات نمایاں ہیں۔

"عورت"، پر تبصرہ کرتے ہوئے "شیرازہ" تبصرہ نگار نے بھان
کے افسانوں کے بارے میں لکھا تھا:۔

"رومان پرور مگر سطحی داستانوں کو اس نے ہاتھ تک نہیں

لگایا۔ اس کے پاس کچھ ایسی باتیں کہنے کو ہیں جو کسی روایت

اور رسم کی پیداوار نہیں ہیں، بلکہ تخلیق اور اپج کی چھاپ لیے ہوئے ہیں۔ اس کے پاس ایک اعلیٰ فنکار کی درد مندی بھی ہے اور اس کی بے نیازی بھی ... انسانی نفسیات کے کچھ ایسے پہلوؤں کو آشکارا کر سکتا ہے جو بہت کم نگاہوں کی زد میں آسکتے ہیں۔"

بھان کا ناول "سیلاب اور قطرے" ولر اور اس کے اطراف و اکناف کی سرزمین اور مناظر کے درمیان ایک غریب خاندان کی زندگی کی داستان ہے۔ ولر کے کنارے کے پانی میں پو پھٹنے سے پہلے، چوری سے سنگھاڑے جمع کرنے والی ایک غریب مفلوک الحال لڑکی بھولی اور سنگھاڑے گارڈ عبدالسلام کے اس سے جذباتی اور جسمانی استحصال کی یہ کہانی، بڑے فطری انداز میں شروع ہوتی ہے۔ بھان نے موقعے اور موقف سے فائدہ اٹھانے کی انسانی نفسیات کو نہایت حقیقت پسندانہ انداز میں پیش کیا ہے۔ بعد میں سونہ واری کے اس گاؤں میں ایک نو دولتیہ ٹھیکہ دار، اس کے منشی دینا ناتھ اور اس کی بیوی سوماوتی اور ایک نوجوان مزدور، رحمان اس بیانیہ میں داخل ہوتے ہیں۔ لیکن سوماوتی ناول کے اصلی واقعات کے ارتقا میں کوئی دخل نہیں رکھتی۔ آخری حصے میں بھولی کی ماں ایک عجیب و غریب کردار کے ساتھ ابھرتی ہے۔ بھولی کا کردار ایک معنی خیز منفی صفات کا حامل ہے۔ وہ عبدالسلام کے استحصال کے لئے اپنے آپ کو تج دیتی ہے۔ لیکن اس کے اس عمل میں نہ لذتیت کا شائبہ ہے اور نہ عیش کوشی کا۔ وہ خود شناس بھی نہیں اور نہ ہی اپنی پاکدامنی کے خلاف حملے کی مثبت انداز میں مقاومت کرتی ہے۔ صرف احتیاج اور مجسم احتیاج اس کے کردار کا خلاصہ ہے اور اس میں بھی اس کا رویہ منفی ہی رہتا ہے۔ صرف

ایک موقع پر وہ عبدالسلام سے اس کی شادی کے وعدہ کو یاد دلانے کے لئے، ماں کی چوری سے، چناروں کے جھنڈ میں کچھ طے کر جاتی ہے۔ اس موقع پر بھی اسکا انداز عمل نتیجہ خیز نہیں۔ رحمن جس کو قسمت نے اس کے گھر میں لاڈلا انھا، اسے چاہنے لگتا ہے اور دل و جان سے چاہنے لگتا ہے۔ اور صرف اس کی خوشنودی کے لئے اپنی محنت اور کمائی سے اس کے اجڑے گھر کو بسا دیتا ہے، بھولی بھی غالباً اس کے ایثار سے متاثر ہوتی ہے، لیکن یہاں بھی وہ اپنے ردّ عمل کا کہیں اور کبھی اظہار نہیں کر پاتی۔

بہر حال یہ بھولی کا کردار ہے، جو ناول کے بیانیہ کا محور اور قاری کی توجہ کا مرکز ہے۔ اس کے کردار میں ابہام پیدا کرنے میں شاید بھان کے فن اور ان کی تکنیک کا راز پوشیدہ ہے۔ سیلاب بھان سے بہت قربت رکھنے والا موضوع ہے، وہ فلڈ کنٹرول محکمے میں کارگزار ہیں۔ اور ناول کے آخری حصے میں جہاں بیانیہ اپنے عروج کو پہنچتا ہے، وہ سیلاب کے منظر کو ایمائی انداز میں خوبی سے پیش کرتے ہیں، اور اس محکمے کے افسروں کو اور شاید خود کو بھی اپنی ناکامیوں کو دکھاتے ہوئے دل کھول کر کوستے ہیں۔ اس طرح ناول ایک اچھا حقیقت پسندانہ بیانیہ اور کسی حد تک ایک نفسیاتی مطالعہ اور کشمیر کی فضا کے پس منظر میں ایک نیچے طبقے کی زندگی کے واقعات کے بیٹھ بیٹھاو کا دلچسپ اور معنی خیز نقشہ بن گیا ہے۔

کشمیر اور ہندوستان میں مصور کی حیثیت سے شہرت رکھنے والے نوجوانوں میں غلام رسول سنتوش بڑی زنگارنگی شخصیت کے مالک ہیں۔ انھوں نے اردو میں کہانیاں لکھی ہیں، ایک ناول تصنیف کیا ہے،

کشمیری میں شعر کہتے ہیں اور سب سے بڑھ کر وہ صاحب طرز مصور ہیں، جن کی تصاویر کی نمائش ہندوستان کے مختلف شہروں میں اور باہر کے ملکوں میں ہوتی رہتی ہے۔ وہ سرینگر کے ایک غریب گھرانے سے اٹھے ہیں، اور اپنی ذاتی سعی اور اپنی فطانت کی بدولت اپنے معاصر فنکاروں میں ایک جگہ پیدا کر لی ہے۔ ان کی صلاحیتوں کو ابھرتے دیکھ کر حکومت کشمیر نے وظیفہ دے کر انھیں مصوری کی تربیت کے لئے بروڈہ کے سکول آف آرٹس میں بھیجا تھا۔

سنتوش کی ادبی دلچسپیاں، ایک فنکار کی مصروفیتوں کے درمیان وقفوں کی ذہنی تفریحیں ہیں، جب وہ موقلم کی بجائے قلم استعمال کرنا چاہتا ہے۔ ان کے افسانے "شیرازہ" اور "ہمارا ادب" میں شائع ہوئے ہیں، جن میں "چار چناری" "ایک ماں تھی" — "خزاں کی خوشبو" "ٹھنڈی آگ کا دھواں" "ڈل کے آنسو" اور "یہ قربتیں" سب سے اچھے افسانے ہیں۔ سنتوش کے افسانے ہوں یا ناول، ان کی زندگی کے واقعات، مشاہدات اور تجربے پر مبنی ہیں۔ اور یہ اکثر ان کے فن کا ضمیمہ بن جاتے ہیں۔ مثلاً "یہ قربتیں یہ دوریاں" کا آغاز اس منظر سے ہوتا ہے:—

"میں کالج کے سٹوڈیو میں اکیلا بیٹھا ہوں، سامنے ایزل پر لگے ہوئے کورے کنواس پر میری نظریں جمی ہوئی ہیں:"

یہ مخصوص انداز یا دوسرے افسانے "ڈل کے آنسو" میں کشمیری زندگی کی جھلکیاں، سنتوش کے افسانوں کو اور ان کے ناول کو ایک انفرادیت بخش دیتی ہیں۔ وہ صاف دل اور خندہ پیشانی سے لکھنے والے ادیب ہیں،

اور اپنی زندگی کو اپنے فن سے چھپائے رکھنے کی کوشش نہیں کرتے ــــ
" ڈل کے آنسو" میں علامتیت ہے۔ اظہار کی حسن کاری کے کچھ اچھے نمونے
بھی ان کی تخلیقات میں ملتے ہیں۔ مثلاً مذکورہ بالا افسانے میں، کنتوس میں
سے جھانکتی دو آنکھوں کو روشناس کراتے ہیں :۔

" یہ آنکھیں نہیں، نیلگوں وسعتیں ہیں، جن میں دیکھتے ہوئے
انسان کھو جاتا ہے۔" یا کالج کے پاس ایک سڑک کے بارے میں
لکھتے ہیں :۔

" لان کے اس طرف وہ سڑک ہے، جو دن کی تیز دھوپ میں
سنسان رہتی ہے شام ہوتے ہی اس پر تنہائی اور خاموشی میں
پلنے والے لمحے جوان ہو جاتے ہیں۔"

سنتوش کا ناول " سمندر پیاسا ہے"، ان کی زندگی اور ان کے فن دونوں
کا عکس ہے۔ یہ فنکار کی اپنی ہی اصطلاحوں میں اپنی سرگذشت بھی ہے۔
اس میں شعوری رو کی سی جھلک بھی ملتی ہے، لیکن کہانی کا کنوس محدود
ہے۔ اس کی تصویریں پھیلتی نہیں اور خاکے بہتے نہیں۔ یہ سیدھا سادہ بیانیہ
ہے، جس میں جگہ جگہ مختلف احساس کے فنی لمحے، بیانیہ میں ادبیت پیدا
کر دیتے ہیں۔ سنتوش ڈل کے قریب محلہ درگجن میں پیدا ہوئے، اور ان کے
ذوق کی آبیاری ڈل کے جھلملاتے پانیوں نے کی، ان کے احساس کے عناصر
کی تشکیل ڈل میں پڑے جمائے ہوئے ہاؤس بوٹ، پہلو میں سلیمان پہاڑی
یا تخت سلیمان اور مقابل میں کوہ ماراں کی افسانوی فضا میں ہوئی، وہ
سیاح ناول نگاروں سے زیادہ وسیع پس منظر رکھتا ہے۔ اور محض پہلگام
اور گلمرگ کے حسین مناظر ہی کو نہیں دیکھتا۔ بلکہ گلمرگ کے سینی ٹوریم کی

زندگی بھی اس کے پیش نظر ہے، وہ نوہٹہ، راجوری کدل، کاوڈارہ جیسے تنگ و تاریک مقامات میں بھی رنگینی ہوئی، کراہتی ہوئی زندگی کے خط و خال دیکھ سکتا ہے اور انہیں مناظر سے وہ اپنے فلمی فن کو سجانے کی کوشش کرتا ہے۔ افلاس زدہ عوام کی مصیبتوں کی مصنف کو جانکاری ہے اور بٹوارہ کے بعد کے انسان کے اندر کے درندہ کو بھی نمودار کرنے کی کوشش کی ہے۔

ناول کا متکلم، اس کا ہیرو "میں"، کشمیر کے فنکاروں اور ادیبوں کے حلقے کا جانا پہچانا "میں" ہے۔ اس کے دوسرے کردار" شکنتلا، لپشپا، ستیش ویسے بھی انجانے نہیں لگتے، بیانیہ میں ایک مرئی ہاجرہ اور ایک غیر مرئی شکنتلا اول بدل ہوتے رہتے ہیں۔ ناول میں اپنی ابتدائی زندگی اور اپنے گھر کی نا قابل رشک حالت کے بیان میں وہ ذہنی تحفظات سے کام نہیں لیتے۔ اپنی ذاتی فکر پر بھی وہ جگہ جگہ زور دیتے ہیں۔ جیسے :-

"حسن عورت ہے، جوانی ہے جیسے شکنتلا اور شراب"

"عورت صرف عورت ہے، جیسے وہسکی، صرف وہسکی، وقتی نشہ، وقتی بند حسن ...."

یہ درست ہے کہ مصوری، شاعری، افسانہ اور ناول سب تخلیق کے کرشمے ہیں، تاہم ان میں سے ہر ایک کی تکنیک اور ہر ایک کا مسالہ جدا ہے، کہیں خطوط خمدار ہیں اور کہیں رنگوں کی نمائش ہے، کہیں صوت و چنگ کہیں محض صرف حرف اور حرف ان میں سب کا اکٹھا ہونا آسان نہیں، لیکن کسی فنکار میں جتنے بھی اور جس مقدار میں اکٹھے ہو جائیں غنیمت ہے۔

کشمیری لال ذاکر، مشہور اہل قلم ہیں، ان کی ملازمت کا تعلق محکمہ تعلیم سے ہے، اس وقت وہ لورمی لول میں خدمت کر رہے ہیں۔ افسانہ نگار

کی حیثیت سے وہ مقبول ہیں ۔ ایک ناولٹ "سیندور کی راکھ" بھی ان کی تصنیف ہے ۔ "وادی کا گیت" ان کا ایک دلچسپ افسانہ ہے ، جو مکتوب کی شکل میں لکھا گیا ہے ۔ یہ مکتوب محبوبہ کے خط کا جواب ہے ، جس میں محبوبہ کے سنائے ہوئے کشمیری گیتوں ، اور اس کے ساتھ بیتے ہوئے حسین لمحوں کو خوبی کے ساتھ یاد دلانے کی کوشش کی ہے ۔

بھوشن لعل بھوشن ، بنہ گنڈ کشمیر کے متوطن ناول لکھنے کا ذوق رکھتے ہیں ۔ ایک ناول "صرف پانچ ہزار" کے عنوان سے تصنیف کیا ہے ، جس میں امیری اور غریبی کے تفاوت سے پیدا ہونے والی برائیوں کو ایک غریب مزدور رام داس اور اس کے لڑکے جیون اور نوعمر لڑکی گلابی کی زندگی کے بیانیہ کے ذریعے نمایاں کرنے کی کوشش کی ہے ۔ خاکہ بڑی ذہانت سے تعمیر کیا ہے ، لیکن فنی اعتبار سے وہ بہت اونچا نہ اٹھ سکا ۔ امیر اور غریب کی کش مکش کے نئے موضوع کو ابھارتے ہوئے ، اتفاق ، حادثہ کے لیے کسی کارنامہ میں جگہ نہیں ہوتی ، اور ان کو شامل کر کے مصنف نے اسے صحافتی انداز کا ناول بنا دیا ہے ۔

وجے سوری ، جموں کے نوجوان ادیبوں کے حلقے کی ایک نمایاں شخصیت ہیں ۔ افسانہ اور ناول دونوں اصناف میں ان کے کارنامے موجود ہیں ۔ ان کا خاندان اصل میں میرپور کا متوطن تھا ۔ تقسیم ملک کے بعد یہ خاندان جموں میں بس گیا ہے ۔ وجے سوری ۱۹۴۲ء میں پیدا ہوئے ، تعلیم جموں میں پائی ، اس کے بعد سانگ اینڈ ڈراما کے شعبے میں نوکری بھی کی ، لیکن اب روزنامہ "اجالا" کی ادارت کے فرائض انجام دے رہے ہیں ۔ سوری کے بہت سے افسانے لکھے ہیں ۔

اور نوعمری سے لکھ رہے ہیں۔ ان کے افسانے "تخلیق" "چرا" "پرواز" "پرتاپ" وغیرہ میں شائع ہوتے رہے۔ اب افسانوں کا مجموعہ "آخری سودا" کے عنوان سے مرتب کر کے ۱۹۶۳ء میں شائع کیا ہے۔

وجے سوری، اپنے ہمعصر افسانہ نگاروں کی طرح اپنی شخصیت کو تعمیر اور ترتیب کے تنفر فریب طریقوں سے نمایاں کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اپنے افسانوں کے مجموعے کو پیش کرتے ہوئے، انھیں اس کا خدشہ تھا، کہ وہ پہلی دفعہ ادبی دنیا میں قدم رکھ رہے ہیں، وہ کسی کہنہ مشق ادیب سے پیش لفظ لکھوا کر احسان مند ہونا نہیں چاہتے تھے۔ وہ اس رسم کہن کی شکایت کرتے ہیں اور انھیں اہل وطن سے بھی شکایت ہے کہ آپ پر کھنے کی بجائے، دیباچہ نگار کی شہرت کی آنکھ سے پرکھنا چاہتے ہیں۔ اس احساس ناانصافی کے ساتھ ان کا نوجوان ذہن بغاوت پر کمر بستہ ہو جاتا ہے اور یہ اعلان کر دیتے ہیں —— "اگر دیباچہ نگار کا کام تعریف ہے تو پھر میں اپنا قلم کسی غیر کو دوں۔ اپنے افسانوں کے لئے سوری نے شدید جنسی موضوع منتخب کئے ہیں۔ کہانیاں سب ایک معیار کی نہیں ہیں۔ "ایک کہانی" اس مجموعے کی غالباً سب سے اچھی کہانی ہے۔ اس مجموعے کو یش سروج کے نام سے منسوب کیا ہے اور فنکار او، پی، شرما نے اس کے لئے خاکے بنائے ہیں۔

سوری کا ناول "ایک ناو کاغذ کی" کالج کے ایک نوجوان طالب علم پال اور اس کی ہم جماعت طالبہ جوالا کی محبت کا رومان ہے۔ اس ضابطہ کو سوری نے بھی دھرایا ہے۔ پال مفلس ادیب، جوالا ایک دولت مند کی بیٹی۔ ظاہر ہے شادی نہیں ہو سکتی تھی۔ دونوں بھاگ کر کلکتہ جانے اور

شادی رچاتے ہیں۔ لیکن جوالا کا باپ انھیں کلکتہ سے پکڑ لاتا ہے، اور

پال کو اغوا کے الزام میں سزا ہوئی اور جوالا کی شادی پال کے ایک دھوکا باز دوست درشن سے طے پاتی ہے۔ لیکن جوالا خودکشی کر کے داستان کو ختم کر دیتی ہے۔ ناول میں حالات منظرہ پیدا کرنے پر سوری نے زیادہ دھیان دیا ہے، لیکن اتفاقات سے واقعات کے سلسلے کو آگے بڑھانے میں بڑی مدد لی ہے۔

وحشی سعید ساحل، نو عمر افسانہ نگار ہیں، اور ناول بھی لکھا ہے۔ صحافت سے بھی دلچسپی ہے، چنانچہ دو تین سال سے ماہنامہ "نگینہ" نکال رہے ہیں۔ وحشی سرینگر کے ایک متمول خاندان ترمبو سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کے والد تجارت کرتے ہیں۔ وحشی کا اصلی نام محمد سعید ہے، اس وقت کشمیر یونیورسٹی میں شعبہ اردو میں ایم، اے کی تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ وحشی کے افسانوں کا ایک مجموعہ "غریبوں کا دیس" شائع ہو چکا ہے۔ تین ناول "خون اور محبت" "منزل اور تلاش" اور "قحط" بھی شائع ہو چکے ہیں۔ افسانوں کے مجموعے کو شائع کرتے ہوئے، وحشی کو بھی اپنے تازہ وارد ہونے کا احساس تھا، لیکن انھوں نے محض یہ لکھنے پر اکتفا کیا ہے کہ "اگرچہ ادب کے میدان میں حال میں اترا ہوں اور اس کے پیچ و خم سے ناآشنا ہوں ... لیکن اس کم عمری میں جو نظر نے دیکھا ہے، آپ کے سامنے رکھنا فرض سمجھا" اس فرض کو نبھانے کی کوشش وحشی نے بساط بھر کی ہے۔ وہ نئے عہد کے رجحانات سے بخوبی واقف ہیں، اور نئی تکنیک پر اپنے کارناموں کو ڈھالنے کی کوششوں میں لگے ہوئے ہیں۔

پدم ناتھ شرما نے ایک ناول لکھنا شروع کیا تھا، لیکن وہ تکمیل نہ پا سکا۔ یہ رشی کیش کی ایک گپھا میں رہنے والے سادھو کی کہانی ہے، اس کے بیانیہ کا

انداز دلچسپ ہے۔ تاہم زبان اور اسلوب بیان میں بہت سے سقم ملتے ہیں۔ اومیش خرما بھی ایک ناول کے مصنف ہیں، "پھول کا درد" کے نام سے موسوم ہے۔ یہ ناول چھپ چکا ہے۔

ڈراما

اس زمانے کے چند ڈرامانگاروں کا تذکرہ پچھلے اوراق میں گذر چکا ہے۔ ڈراما کی طرف ادیبوں کی توجہ کہیں منعطف نہیں رہی تاہم ریڈیو سے مختصر ڈراموں کو نشر کرنے کی ضرورت کے پیش نظر کئی ریڈیو ڈرامے اس زمانے میں وجود میں آئے، لیکن ظاہر ہے کہ یہ ڈراما کی حقیقی ضرورت کو پورا نہیں کر سکتے۔ کلچرل فرنٹ کے ایک کارکرد ادارہ ہونے کے زمانے میں نشریاتی اغراض کے لئے کچھ ڈرامے لکھے گئے اور کئی ڈرامے اسٹیج کی ضرورتوں کو مدنظر رکھ کر بھی لکھے گئے۔ اس سلسلے میں علی محمد لون کے تین ڈراموں کا ذکر کیا جا سکتا ہے، جن کی تفصیل گذر چکی ہے۔

وجے سمن سوسن، جموں کے ادیب، شاعر اور ماہر صحافت نے کئی اچھے ڈرامے بھی لکھے ہیں۔ آج کل وہ "قومی آواز"، جموں کے حلقہ ادارت میں کارگذار ہیں۔ ان کی دلچسپیاں بھی متنوع ہیں۔ انھوں نے افسانے بھی لکھے ہیں۔ ہندی افسانوں کا مجموعہ "اُرمیا" شائع ہو چکا ہے۔ اردو میں ان کے افسانوں کا مجموعہ "چھالے"، ۱۹۴۷ء سے پہلے شائع ہوا تھا۔ تین سال قبل یعنی ۱۹۶۷ء میں انھوں نے ایک ڈراما "انگمان" شائع کیا تھا، جو دراصل چینی حملے کی مذمت میں لکھا گیا تھا۔ لیکن اس میں نشریہ کا شائبہ کم ہے اور اچھا خاصا مطالعہ بن گیا ہے۔ اس ڈراما کی صرف ہیروئن ہے۔ یہ خاندان جو ماں، باپ، ایک بیٹی انگمان اور دو بیٹوں پر مشتمل ہے، اس علاقے پر چینیوں نے تسلط جما لیا تھا۔ دونوں بیٹے لڑتے ہوئے مارے گئے تھے۔ انگمان پر

؎ سمن کا کئی سال قبل انتقال ہو چکا ہے

چینی فوجی، جانور کی طرح چل پڑتا ہے، اور اپنی ہوس پوری کرتا ہے۔ اس کے بعد اس سے شادی کا خواہاں بھی ہوتا ہے۔ لیکن انگمان کو اس سے ایسی نفرت تھی کہ جو لڑکا اس کی بدکاری کی نشانی کے طور پر پیدا ہوتا ہے۔ اسے ڈبو کر مار دیتی ہے۔

اس میں حب وطن کے جذبات قابل قدر ہیں۔ اس میں چونکا دینے والے ڈرامائی موقف نہیں آتے لیکن مکالموں کی برجستگی، اس کی خوبی کا ایک عنصر بن جاتی ہے۔ انگمان کے باپ اور چینی فوج کا گفتگو کا یہ پارہ، وجے سوسن کی مکالمہ نگاری کی نمائندگی کرتا ہے۔ پلجور چینی فوجی ہے۔

پلجور: "کون لوگ ہو تم ؟"

فنسخ: خدا کے بندے

پلجور: وہ تو میں بھی دیکھ رہا ہوں، میرا مطلب ہے ہماری طرح ہو۔

فنسخ: نہیں، ہم جھوٹ نہیں بولا کرتے

پلجور: تو پھر یہاں کیوں ٹھہرے ہوئے ہو ؟

فنسخ: یہاں ٹھہرے ہوئے نہیں ہیں۔ یہ تو ہمارا گھر ہے۔

اس ڈراما کا پیش لفظ، وجے سمن سوسن کی بیوی سین مالا نے لکھا ہے۔ سین مالا پنڈت امرناتھ شہید کی صاحبزادی ہیں، جو ریاست میں گورنر اور لداخ کے وزیر وزارت بھی رہ چکے تھے۔ شہید ادیب بھی تھے اور ایک ناول "کملا" بھی تصنیف کیا تھا۔ اور بچوں کے لئے ایک کتاب "چراغِ ہدایت" کے نام سے لکھی تھی، شعر بھی کہتے تھے۔ سین مالا پنجابی میں شعر کہتی ہیں، اردو میں بھی لکھتی ہیں۔ "انگمان" کے پیش لفظ کا آغاز وجے سمن سوسن کے ایک شعر سے کرتی ہیں۔ شعر یہ ہے :-

"ضبط کی تلقین کی یاد دے گئی دادِ وفا　　کہہ گئی خاموش ہو کر شمع پروانے سے کیا"

پھر لکھتی ہیں :-

"میں نہیں جانتی کہ وجے سمن جی نے یہ شعر آج سے کئی سال پہلے کن احساسات کے تحت لکھا تھا، مگر اتنا سمجھتی ہوں کہ اب یہ شعر ان کی پوری زندگی پر حاوی ہو کر رہ گیا ہے یا یوں سمجھ لیجیئے کہ ان کی زندگی اس شعر کی تفسیر بن چکی ہے۔

وجے سمن شاعری میں سوسن تخلص کرتے ہیں۔ چنانچہ ان کے کچھ شعر پچھلے باب میں نقل کئے جا چکے ہیں۔ "انگماں" کے پیش لفظ میں بھی سین مالا نے ان کے کئی اچھے شعر نقل کئے ہیں۔

وید راہی[1] لالہ ملک راج صراف کے صاحبزادے صحافت کے علاوہ افسانہ نگاری اور ڈراما اور شعر و سخن سے بھی لگاؤ رکھتے ہیں۔ ان کے افسانے اخبارات اور رسایل میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ اپنے اطراف صحافتی اور ادبی سرگرمیوں کے ہوتے ہوئے انھیں لکھنے کے محرکات کی کمی نہیں تھی۔ لالہ ملک راج صراف کے رسالے "رتن" میں وہ نو عمری ہی سے لکھنے لگے۔ چنانچہ اب تک کئی افسانے اور ڈرامے لکھ چکے ہیں۔ فلم میں قسمت آزمائی کے لیے وہ بمبئی بھی گئے تھے، لیکن وہاں انھیں زیادہ کامیابی نہیں ہوئی۔ اس لیئے پھر جموں چلے آئے اور افسانے لکھتے رہے۔ ان کے افسانے "منجر کا میلہ" اور "کالے ہاتھ"، "شگوفہ"، "اسلم، میرا دوست" اچھے افسانے ہیں۔ "منجر کا میلہ" مقبول افسانہ مانا گیا ہے۔ لیکن "کالے ہاتھ" وید راہی کے افسانوں میں فنی اعتبار سے زیادہ بلند پایہ ہے۔ یہ ایک لیڈی ڈاکٹر منسی کی کہانی ہے۔ اس کے کالے ہاتھوں نے ایک دفعہ

---

[1] وید راہی آج کل بمبئی میں مقیم ہیں

سہیلی کے گڈے کے ساتھ اس کی گڑیا کی شادی منسوخ کروادی تھی اور اسکی بجائے اُس کی بہن کی گڑیا، منڈپ میں لاکر بٹھادی گئی تھی۔ پھر یہی واقعہ خود اس کی شادی میں پیش آیا، اور اس کی بہن اس کی جگہ دلہن بنا کر بٹھادی گئی۔ اسی دولہے کا کامیاب آپریشن کرنے کے بعد وہ اپنے کمرے میں آکر سسکنے لگتی ہے۔

وید راہی پر پریم چند کا کافی اثر ہے، اور انھوں نے پریم چند کے انداز کے کچھ اصلاحی افسانے بھی لکھے ہیں، جن میں "یہ پربت میرے ہیں" اچھا افسانہ ہے۔ اس میں کم عمر لڑکیوں کو معمر آدمی کے ساتھ بیاہنے کی بُری رسم کو اُبھارا ہے۔ "اسلم، میرا دوست"، تقسیم ملک کے بعد کے فسادات کی کہانی ہے۔ وید راہی حکومت ہند کے محکمہ انفارمیشن کے ترجمان "یوجنا" کی ادارت پر بھی مامور رہے تھے۔ ریڈیو کشمیر جموں سے بھی وہ کافی عرصہ وابستہ رہے۔ اسی تعلق سے انھیں ڈراما لکھنے کی تحریک ملی، اور ریڈیو کے لیے انھوں نے کئی ڈرامے لکھے ہیں، جو نشر ہو چکے ہیں۔ ان کے بعض ڈراموں کو مقبولیت بھی حاصل ہوئی۔

وید کو شعر و سخن سے بھی گہری مناسبت رہی، بلکہ وہ ابتدا میں شعر بھی زیادہ کہتے تھے اور شعر میں اچھا معیار انہیں حاصل ہے۔ ان کا بہت سا کلام رسالوں میں شائع ہو چکا ہے۔ ان کی ایک نظم کے چند شعر ہیں:۔

ہمدمو جو بھی گذرنی تھی وہ گذری مجھ پر — دل میں ٹوٹے ہیں جو نشتر، نہ ابھارو جاؤ

عہد رفتہ کے جواں سال ارادو پھر سے — مجھ کو دے دے کے یہ ٹھوکے، نہ پکارو جاؤ

رات باقی ہے ابھی دور سحر ہے غم کی — میری پلکوں پہ لرزتے ہوئے تارو جاؤ

اعتماد اب نہ کوئی غیر پہ نہ غم پہ رہی — زیست کا رزم ہے پھر طور گذارو، جاؤ

راہی کے افسانوں کا ایک مجموعہ چھپ چکا ہے، جس پر پروفیسر نند لال طالب نے تعارف لکھا ہے۔

پران کشور، جو ریڈیو کشمیر سرینگر سے منسلک اہل فن نوجوانوں میں شامل ہیں، اپنی متنوع صلاحیتوں کی بدولت امتیاز رکھتے ہیں۔ وہ بہت وسیع دلچسپیوں کے مالک ہیں، لیکن ڈراما سے انھیں خاص دلچسپی رہی ہے اور ڈراما میں ان کی تخلیقات مقبول بھی ہیں۔ ان کی ولادت سرینگر میں ۱۹۲۵ء میں ہوئی۔ بی۔ اے کامیاب کرنے کے بعد ہی وہ ریڈیو کشمیر سے منسلک ہو گئے اور اس وقت پروڈیوسر کی خدمت انجام دے رہے ہیں۔ ریڈیو ڈراما، اس کی ترتیب، تنظیم اور پیش کشی کے سارے فنی لوازم پر انھیں اچھا عبور حاصل ہو چکا ہے۔ اور اب تک کئی اچھے ڈرامے وہ لکھ چکے ہیں اور پیش بھی کر چکے ہیں۔ ڈراما کی ہدایت کاری کا بھی انھیں تجربہ ہے۔ اور بارہ پندرہ ڈراموں کی ہدایت کاری کے فرائض وہ خوش اسلوبی سے انجام دے چکے ہیں۔

پران کشور بھی ان نوجوان فنکاروں میں سے ہیں، جنھوں نے کلچرل فرنٹ اور کلچرل کانگریس کی دعوت پر لبیک کہا اور ریاست کی ثقافتی اور فنی جد و جہد میں نمایاں حصہ لیا۔ انڈین پیوپلز تھیٹر کی شاخ کشمیر کے وہ بانی ارکان میں سے ہیں، جس کی بنیاد ۱۹۴۴ء میں رکھی گئی تھی۔ کلچرل فرنٹ کے شعبہ ڈراما کے وہ سربراہ رہے ہیں اور کشمیر میں تھیٹر کی نئی تحریک کے وہ بانی ہیں۔ اردو اور کشمیری دونوں زبانوں میں انھوں نے ڈرامے لکھے ہیں اور ہدایت کاری کی ہے۔ مشہور کشمیری فلم "ماتشرات" کے ہدایت کاروں میں وہ شامل ہیں۔ مشہور کشمیری شاعر مہجور کی زندگی کے بارے میں جو رنگین فلم تیار ہوئی ہے، اس کی ہدایت کاری میں بھی پران کشور کا حصہ ہے۔

ان مختلف النوع دلچسپیوں کے ساتھ ساتھ مُصّوری سے بھی ان کو گہرا لگاؤ رہا ہے۔ چنانچہ غیر پیشہ ور (امیچور) مصوروں کے فن کی نمائش کے دو مقابلوں میں انھیں دو انعامات مل چکے ہیں۔ ان میں سے ایک کلچرل اکادمی کی سالانہ نمائش ہے اور دوسری کل ہند نمائش، جس کا انعقاد سرینگر میں ہوا تھا۔ مُصّوری کی قومی نمائش میں بھی ان کی بنائی ہوئی تصویروں کی نمائش ہوتی رہتی ہے اور اہل نظر ان کے فن کا اعتراف کرتے ہیں۔

دیانند کپور، جنکا ذکر اہل صحافت کے سلسلے میں کیا جا چکا ہے، افسانے ڈرامے بھی لکھتے ہیں۔ ان کے افسانے اور ڈرامے رسایل اور جموں کے منتخب ادیبوں کے مجموعے میں شائع ہوئے ہیں۔ نند گوپال یاوا کے مجموعے "آدم کے بیٹے" میں کپور کا ایک ڈراما "تاج" شائع ہوا ہے۔ "پربھات" ان کا اخبار پونچھ سے نکلتا تھا، کچھ عرصہ تک وہ بند بھی رہا۔ اب پھر وہ اسے نکال رہے ہیں اور ساتھ ساتھ ریڈیو کشمیر، جموں میں ملازمت بھی کرلی ہے۔

کپور کے فرزند موتی لال کپور، جنہیں بچپن میں چراغ حسن حسرت کی صحبتوں میں بیٹھنے کا اتفاق ہوا ہے ، اچھے ادبی ذوق کے حامل ہیں۔ وہ اچھے مضمون نگار اور افسانہ نگار ہیں، اور کچھ ڈرامے بھی انھوں نے لکھے ہیں۔ مذکورہ بالا مجموعے میں ان کا ایک اچھا افسانہ "برج باسی" اور ایک ناٹک "حرف آخر" بھی شائع ہوا ہے۔

سی پروانہ اور ریش شرما، دو اور نوجوان ادیب ہیں، اور اردو اور ہندی دونوں زبانوں میں لکھتے ہیں۔ سی پروانہ جموں کے ایک متوسط خاندان میں سنہ ۱۹۳۴ء میں پیدا ہوئے، انٹر تک تعلیم پائی۔ اسی زمانے میں وہ لکھنے لگے اور اردو ہندی کے علاوہ پنجابی میں بھی ڈرامے لکھتے ہیں۔ ان کا

ڈراما "نیم حکیم" بہت مقبول ہوا اور یہ اچھے ڈراموں میں سے ہے۔ ڈوگری سے بھی انھیں گہرا لگاؤ ہے۔ یش نے بی، اے تک تعلیم حاصل کی ہے۔ یہ ڈوگری، اردو اور ہندی میں لکھتے ہیں۔ شعر بھی کہتے ہیں اور زیادہ کلام ڈوگری میں ہے۔ اردو میں کچھ ڈرامے لکھے ہیں۔

زیڈ سیمی، جموں کے ایک اور نوجوان ادیب اور شاعر ہیں، جنھوں نے کئی ڈرامے، مزاحیہ خاکے اور ریڈیو ڈرامے لکھے ہیں۔ کوئی سترہ اٹھارہ برس سے وہ میدان میں ہیں۔ ان کی ایک تصنیف "فلمی سیڑھیاں" چھپ چکی ہے۔ دو مزاحیہ خاکے "شاعری کا مارا" اور "فلمی قینلے" بھی منظرعام پر آچکے ہیں۔ وہ غزل اچھی کہتے ہیں اور غزلوں کا ایک مجموعہ "طلوع" بھی شائع کر چکے ہیں۔ ان کے ریڈیو ڈراموں کا مجموعہ "جھنکار" اور موہن یاور کے بارے میں ایک سوانحی تبصرہ "موہن یاور کا فن اور شخصیت" بھی مرتب کر چکے ہیں۔

زیڈ سیمی کا ایک دلچسپ ڈرامہ "جہانگیر کی موت" سنہ ۱۹۶۲ء میں نیا کشمیر پریس، جموں سے شائع ہوا ہے۔ کشمیر سے جہانگیر کو جو لگاؤ تھا، وہ ہم سب جانتے ہیں۔ اس عاشق کشمیر کو کشمیر سے جدائی گوارا نہیں تھی۔ چنانچہ اس کا انتقال بھی کشمیر سے جاتے ہوئے، کشمیر ہی کے علاقہ چنگس میں ہوا۔ مغلوں کے عہد میں یہ مقام لاہور کے راستے میں پڑتا تھا۔ اس کے قریب ہی نوری آبشار مشہور ہے جو نور جہاں کے نام سے موسوم ہے۔ یہ مقام نور جہاں کو بہت پسند تھا۔

اس ڈراما میں ڈراما کے اندر ڈراما کی تکنیک برتی گئی ہے۔ شاہد اور ناہید تاریخی مقامات کی سیر کو نکلتے ہیں۔ جب وہ نوری آبشار پہنچتے ہیں، تو ڈراما نگار، جہانگیر اور نور جہاں کے اس مقام کی سیر کا منظر پیش کرتا ہے۔

ہاتھی نالہ کے مقام پر جہانگیر کے لئے ایک محل سرا بنائی گئی تھی۔ جہانگیر یہاں شکار کے لئے آیا کرتا تھا۔ ڈراما میں ان واقعات کو پیش کیا گیا ہے۔ ڈراما کا خاکہ چست اور مکالمے دلچسپ ہیں۔ نوری آبشار پر نور جہاں اور جہانگیر محوِ تکلّم ہیں :۔

"نور جہاں ۔ شہنشاہ جہانگیر جب بھی اس مقام پر آتے ہیں تو شہنشاہ کم اور شاعر زیادہ ہو جاتے ہیں۔"

جہانگیر :۔ ملکہ، تم ٹھیک کہتی ہو، کاش ہم صرف شاعر ہوتے، اور دنیا و مافیہا سے بے خبر تمہارے اور قدرتی حسن میں کھو کر، ایک ایسا شاہکار تخلیق کرتے جو بے مثال اور لاجواب ہوتا۔ کاش ہم مُصَوّر ہوتے تو اس خوبصورت منظر کو کاغذ پر منقش کر دیتے!"

ڈراما کے ساتھ موہن یاور کا تعارف "میرا یہ ہم عصر" بھی شامل ہے، جس میں زیڈ سیمی کے فن پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

رام کمار ابرول بھی جموں کے معاصر ادیبوں میں سے ہیں۔ وہ اردو اور ڈوگری دونوں زبانوں میں لکھتے ہیں۔ انسان دوستی اور خاص طور پر نیچے طبقے کے لوگوں کی نامراد زندگی اور کسانوں کے نامساعد حالات ان کے لئے محرک کا کام دیتے ہیں۔ اردو میں انھوں نے چند افسانے لکھے ہیں، لیکن ان کی قلمی صلاحیتیں، افسانوں سے ڈراما میں بروئے کار آئی ہیں۔ ان کا پہلا ڈراما "انسان جیت گیا"، ۱۹۵۹ء میں شائع ہوا، اور یہ اسٹیج پر بھی پیش کیا گیا، اور بہت پسند کیا گیا۔

ابرول نے جموں میں تعلیم پائی۔ ادب تک پہنچے اس کے ساتھ

ساتھ وہ لکھتے بھی رہے۔ کچھ عرصہ آل انڈیا ریڈیو جموں میں ملازمت کی، پھر انھیں فلم کے لئے لکھنے کا شوق ہوا، اور وہ بمبئی چلے گئے۔ لیکن بمبئی میں انھیں حسب دل خواہ کامیابی نہیں ہوئی، وہ لوٹ آئے اور محکمہ انفارمیشن میں ملازمت کر لی۔ فلم سے دلچسپی کے باعث انھوں نے ڈوگری میں ایک فلم تیار کیا۔ جو افسانے ابرول نے لکھے ہیں، ان میں زندگی کی سہی عکاسی کی گئی ہے۔ ان کے موضوع اور کردار سب موجودہ سماجی زندگی سے چُنے گئے ہیں۔ ان کی ڈراما سے دلچسپی کے آثار ان کے افسانوں سے بھی نمایاں ہیں۔

ابرول کے تین ڈرامے شایع ہو چکے ہیں، جن میں سب سے زیادہ مقبول "انسان جیت گیا" مانا گیا ہے۔ دوسرے دو ڈرامے "دھرتی اور ہم" اور "چکی کے پاٹ" بھی شایع ہو چکے ہیں۔ ان کے علاوہ ان کے ریڈیو ڈراموں کا ایک مجموعہ "زندگی اور عورت" بھی منظر عام پر آچکا ہے۔ ان کی ایک اور تصنیف ان کا ناول ہے جو "سحر ہونے تک" کے نام سے موسوم ہے۔ ڈراما "انسان جیت گیا" جس کی ہدایت کاری کے فرائض خود انھوں نے انجام دئے تھے، اپنے عہد کی بیداری کے شعور کو پیش کرتا ہے۔ اس میں رجعت پسند قوتوں کا ترقی پسند قوتوں سے تصادم دکھایا گیا ہے۔ اور ترقی پسند قوتوں کی فتحمندی نمایاں کی ہے۔

اجتماعی کاشت کاری اس ڈرامے کا مرکزی موضوع ہے۔ اس کے مکالموں میں مزاح کی چاشنی بھی ملتی ہے۔ مالتی، ایک نوجوان لڑکی اسکی ہیروئین ہے۔ اپنے بھائی رتن سے اس کی گفتگو کا اقتباس ذیل میں پیش کیا جاتا ہے:۔

"مالتی۔ آتا کیوں نہیں، تو نے مجھے ایکدم گنوار سمجھ رکھا ہے کیا؟"

"رتن ۔ نہیں جی، رتن سے سمجھ دار آدمی کی دیدی گنتوار ہو سکتی ہے بھلا؟"

"مالتی ۔ اچھا تو تو آدمی ہے؟"

"رتن ۔ تو کیا ہوں، پھر؟"

"مالتی ۔ میرا چھوٹا سا بھیا..."

بنسی نردوش، پنڈت شیام لال ولی تیرتھ کاشمیری کے صاحبزادے، والد کے ادبی ذوق سے بہرہ یاب ہیں، لیکن وہ جدید عہد کے لکھنے والوں میں ہیں، اور ان کے عہد کے مسایل اور فنی رحجانات کا اثر ان کی تحریروں میں بھی نمایاں ہے۔ سرینگر میں ان کی ولادت ۱۹۲۹ء میں ہوئی، یہیں تعلیم حاصل کی۔ اس دوران وہ سماجی اصلاح کا کام بھی کرتے رہے۔ ترقی پسند تحریک سے بھی بنسی نردوش کا تعلق رہا۔ کچھ عرصہ بعد وہ جالندھر کے کمیونسٹ اخبار "نیا زمانہ" کے سب اڈیٹر رہے۔ کوئی دو سال تک اس خدمت کو انجام دینے کے بعد، وہ کشمیر لوٹ آئے۔ اور غلام محمد میر راجپوری کے اخبار "جہان نو" کی ادارت سنبھالی لی۔ اس اخبار سے تعلق منقطع ہو جانے کے بعد وہ "خدمت" کے حلقۂ ادارت میں کام کرتے رہے۔ کچھ نیم سیاسی، نیم تہذیبی اداروں جیسے یونائیٹڈ ڈیموکریٹک فرنٹ سے بھی بنسی نردوش کا تعلق رہا۔ آخر میں وہ ریڈیو کشمیر سرینگر سے وابستہ ہو گئے۔ لیکن انجمن آرائی کا جو چسکا انھیں نوعمری سے تھا، یہاں بھی انھیں متحرک کرتا رہا۔ اس وقت وہ ریڈیو کشمیر کے ملازمین کی یونین کے صدر اور کوشر مرکز کی مجلس انتظامی کے وہ رکن ہیں۔

بنسی نردوش نے افسانے، کچھ ڈرامے اور تنقیدی مضامین لکھے ہیں۔ ان کے افسانوں کا مجموعہ "تار سوت" شائع ہو چکا ہے۔ افسانوں

ہیں وہ کشمیر کے بیچ کے طبقے اور متوسط خاندانوں کی زندگی کے بارے میں بڑی جانکاری رکھتے ہیں، اور ایسے مواقف کو وہ بڑی خوبی سے پیش کرتے ہیں۔ "ریڈ لیمپ اور انسان" ان کے ابتدائی دور کے افسانوں میں سے ہے، اور اس میں بھی ان کے مخصوص سماجی رجحانات کھل کر سامنے آئے ہیں۔

"سناٹا" ان کا ایک اور افسانہ ہے، جس میں ایک متوسط طبقے کے قمرمحی الدین کو اس کی نفسیاتی الجھنوں میں اس طرح پیش کیا ہے کہ اس کے دوست اس کے بارے میں شک ہی میں رہے۔ اپنی بیوی ہاجرہ سے وہ اپنی محبت کا ڈھنڈورا پیٹتا، لیکن ہاجرہ اس کے برتاو سے بدگمان ہی رہی۔ آخر اس حتربیہ کا انجام دونوں کی موت کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔ کشمیر کے ایک متوسط خاندان کی زندگی کے بڑے اچھے ایمائی اشارے بھی بنسی نردوش کے دوسرے افسانوں کی طرح اس افسانے میں بھی ملتے ہیں۔

بنسی نردوش کے کئی ڈرامے شائع ہو چکے ہیں۔ ۱۹۶۵ء کی چینی آویزش کے زمانے میں انھوں نے ایک اچھا افسانہ "رات کا مہمان" کے عنوان سے لکھا تھا، جس میں کمیونسٹ چین کے حاکموں کا فسطائی پہلو موثر انداز میں پیش کیا ہے۔ ایک چینی شاعر کو سمجھ کی بات کہنے کی پاداش میں قید میں بھیج دیا جاتا ہے۔ کمیونسٹ آمریت پر یہ طنز بڑا گہرا ہے۔ ڈراما اور اس کے واقعات مختصر ہیں، اور سیدھے سادھے مگر پُرمعنی مکالموں میں واقعات پیش کئے گئے ہیں۔ چینی شاعر کے تاثرات کی ترجمانی کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں :-

"اب دیس میں جو آدمی انسانی آزادی کے راگ الاپتا ہے، وہ رجعت پسند سمجھا جاتا ہے"

"ہم سب جیل میں ہیں، اس بڑے جیل خانہ سے کوئی بھاگنا بھی

چاہے تو کہاں جا سکتا ہے۔"

ادبی تخلیقات پر بھی جیسی کچھ پابندیاں عاید ہیں، ان کا تذکرہ ایک

کردار کی زبانی اس طرح کرتے ہیں:-

"اب شاعر، شاعر نہیں رہے، کارپینٹر بن گئے ہیں ..... یہاں

تو ہر چیز ایک فارمولے کے تحت لکھی اور سوچی جاتی ہے۔ اپنی

اپچ کوئی معنی نہیں رکھتی۔"

سماجی نظام کی شکست کو اس سادہ مگر طنزیہ جملے میں ایک مسافر اپنی بیوی

کے بارے میں کہتا ہے:-

"ایک کامریڈ اسے اپنی زوجیت میں لے گیا۔"

یہ تصویر، وجے سمن سوسن کے "انگمان" کی پیش کی ہوئی تصویر کا ایک

اور رُخ ہے۔

بنسی نردوش کے تنقیدی مضامین، سوانحی جائزے اور انشائیے

بھی رسالوں میں شائع ہوئے ہیں۔ مشہور سرود نواز آچاریہ وتو بھاؤ

پر ان کا ایک مضمون "سچا سنت" کے عنوان سے "تعمیر" (سرینگر۔ جولائی

۱۹۵۹ء) میں شائع ہوا تھا۔ اس کا آغاز کرتے ہوئے وہ کشمیر سے تصوف،

گیان اور بھگتی کے فطری لگاؤ پر بجا طور پر زور دیتے ہوئے لکھتے ہیں:-

"نہ جانے، وہ کونسا جادو ہے، جو صوفیوں اور سنتوں کو ہمیشہ کھینچ کر

کشمیر بلاتا رہا ہے۔ وتستا کی بے قرار لہریں ہی بتا سکتی ہیں کہ انھوں

نے کتنے ایسے بزرگوں کے پاؤں دھو کر پیئے ہیں۔"

میر غلام رسول نازکی پر ان کا ایک مضمون شائع ہوا ہے جس میں کہنہ مشق

شاعر کے ادبی مقام کا جائزہ لیا گیا ہے۔ بنسی نردوش نے ان کی فکر اور فن کی

اوزیابی کی ہے کہ :-

"بہ حیثیت ایک ادیب، قومی آزادی کے تحفظ کے "کاز" میں

آپ کی تحریروں نے نمایاں حصہ ادا کیا ہے۔ بہ حیثیت شاعر کے

آپ کی حقیقت بین نگاہوں نے متنوع پہلوؤں کی عکاسی اور

ترجمانی کی ہے۔ آپ کی شاعری میں کہیں کہیں نشتریت کا احساس

ہوتا ہے، جو صحت مند تنقید کا حق بھی ادا کئے جا رہا ہے۔"

خواجہ غلام محمد صادق، چیف منسٹر ریاست کے حالات پر ایک کتابچہ

"صبح صادق" کے عنوان سے شائع کیا ہے، صادق صاحب کا گہرا تعلق ریاست

کی ثقافتی اور ادبی تعمیر نو سے رہا ہے۔ بنسی نردوش نے اس کتابچہ میں صادق

صاحب کی زندگی کے حالات اور ان کے کارناموں کے ساتھ ساتھ اس عہد کے

بہت سے اہم تاریخی اور سیاسی حقائق بھی قلمبند کئے ہیں۔ ۱۹۶۴ء میں

صادق صاحب کے وزیر اعلیٰ کے منصب سنبھالنے کا حال لکھ کر کتاب کو

اس طرح ختم کرتے ہیں:-

"۲۸ فروری ۱۹۶۴ء کو ایک دور ختم ہو گیا اور نیا دور شروع

ہو گیا۔ ماضی کی غلطیاں، کوتاہیاں، خرابیاں اور اس کے ساتھ

جو تعصبات تھے، وہ اُسی دن دفنا دئے گئے اور ایک نئے

سیاسی باب کی ابتدا کر دی گئی۔ اس نئے باب پر جلی سُرخی میں

لکھا ہے: "صبح صادق" جس کی روشنی اپنی تمازت اور تابانی

کے ساتھ بے سوز دلوں کو گرمانے اور بے نور چہروں کو جگمگانے

کے لئے ریاست کے کونے کھدروں میں پہنچے گی۔"

دینو بھائی پنت، جموں کے ادبی حلقوں کی سربرآوردہ شخصیت ہیں۔ اس وقت وہ ڈوگری سنستھا جموں کے صدر ہیں۔ ڈوگری کے اہم شاعروں میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ (ان کے مجموعے "سرپنچ" پر ۱۹۶۲ء میں کلچرل اکادمی کا انعام بھی عطا ہوا)۔ دینو بھائی کا تعلق محکمہ دیہات سدھار سے ہے۔ وہ کسانوں اور نیچے طبقے کے عوام کی سماجی حالت کو سنوارنے کی مساعی میں ڈرامے لکھ کر اسٹیج پر پیش بھی کرتے رہے۔ ان کے مخاطب عام طور پر ڈوگری عوام ہیں۔ ان کی ڈوگری شاعری کے موضوع بھی کسان اور محنت کش عوام ہیں۔ ان کی نظم "بول کساناں ہلّہ بول" ایک معرکتہ الآرا نظم ثابت ہوئی۔

دینو بھائی ۱۹۱۷ء میں پیدا ہوئے۔ جموں میں تعلیم حاصل کی اور کچھ عرصہ ان کا تعلق صحافت سے بھی رہا۔ وہ ایک رسالہ نکالتے تھے۔ اس کے بعد ریاست کے محکمہ پنچایت میں وہ ملازم ہو گئے اور اس وقت بلاک افسر کی خدمت انجام دے رہے ہیں۔ وہ ہندی بھی لکھتے ہیں۔ اردو میں بھی کچھ نظمیں ابتدائی دور میں لکھی تھیں۔ لیکن جب سے علاقائی زبانوں میں لکھنے کی تحریک اٹھی، وہ ڈوگری میں لکھنے لگے۔ ان کی ہندی دراصل آسان اردو یا ہندوستانی ہوتی ہے۔ مثلاً ایک نظم جو انھوں نے ناگری حروف میں لکھی تھی، اس کا ایک مصرع ہے:-

"ڈوگروں کی ہڈیوں پر یہ بنے ہیں تخت و تاج"۔ اردو میں ان کا اہم کارنامہ ان کا ڈراما یا ناٹک ہے، جو سورگ کی کھوج

کے عنوان سے لکھا گیا ہے۔ اس میں پرانوں کے روایتی ستی سر سے کشمیر کی سرزمین کو برآمد کرنے کی ایک انسانی اور عقلیت پسند توجیہہ کی ہے اور پرانوں سے اشارے اکٹھے کر کے، انہیں ایک یقین آفرین کہانی کے روپ میں ڈھالا ہے۔ اس کے ساتھ سنسکرت اور قدیم فارسی یا ایرانی کے اپنے متحدہ ماخذ سے انحراف کے کچھ دلچسپ مگر خیالی روپ بھی دیئے ہیں۔ جیسے خدا سے خودآ، جو وجود مطلق ہے۔

کہانی کا تانا بانا ستی سر کی روایت اور کشیپ رشی کی شخصیت سے بنایا گیا ہے۔ اس کے دوسرے کردار، رودرا، اندرا اور شاریکا بھی پرانوں پر مبنی ہیں۔ ستی سر کے وہی پرانے روایتی منظر ہنی سر جھیل کے اطراف کی پہاڑیوں پر آبادی سے اس کا آغاز ہوتا ہے۔ کشیپ اس آبادی کے سردار ہیں۔ آبادی جب بڑھ گئی اور انسانوں کے لئے جگہ اور مویشیوں کے لئے چارہ میسر نہیں آنے لگا تو نوجوان رودر نے وہاں سے منتقل ہو جانے کی تجویز بتائی اور چند اور باغی طبیعت نوجوان اس کے ہم خیال ہو گئے۔ کشیپ رشی کو جب اس کی خبر پہنچی ہے تو وہ نوجوانوں کو مادر وطن ترک کر جانے سے روکتے ہیں اور یہ تجویز پیش کرتے ہیں کہ بارہمولہ کے پاس پہاڑیوں کو کاٹ دیں گے تو ستی سر کا پانی بہہ جائے گا اور زمین زراعت کے لئے اور رہنے کے لئے نکل آئے گی۔ جب یہ پہاڑیاں کاٹی جا رہی تھیں۔ ایک نئے انداز کا اجنبی شخص وہاں کا شر پہاڑیوں میں چھپا ہوا ملتا ہے۔ یہ ہندوستان کے آریوں کا ایرانی بھائی تھا، جو وہاں کی ایک خوں ریز جنگ کے بعد، ادھر کو بھاگ آیا تھا، اس کے زخموں سے خون جاری تھا۔ وہ کشیپ رشی کے سامنے

لایا جاتا ہے۔ کشیپ اس سے پوچھتا ہے تو کہتا ہے: "آفت زدہ ہستم"
کشیپ اور بنیڈتوں کی طرح سمجھتے ہیں کہ یہ غلط سنسکرت بول رہا ہے،
اس کی تصحیح کرتے ہیں "آپد گرستم" پھر اجنبی کہتا ہے:

"آہور ہرنا کھ آتش زد بہشت مارا"

کشیپ - اسُر ہرناکھیہ نے تمہارے بہشت کو جلا ڈالا۔

کشیپ اس پردیسی کو اس کے زخموں کی دیکھ بھال کے لئے ایرنا کے
سپرد کرتے ہیں۔ ان دونوں کی گفتگو بھی دلچسپ ہے، جس میں دینو بھائی نے
فارسی اور سنسکرت ہم ماخذ لفظوں کو برتنے کی کوشش کی ہے۔

ایرنا - پردیسی یہ کیا ہوا؟

پردیسی - زخم، خون۔

ایرنا - خون نہیں، شون کہو شون۔

ایرنا - (پردیسی کا ہاتھ چھوکر) یہ کیا ہے؟

پردیسی - این دستِ من۔

ایرنا - دست نہیں، ہست کہو، ہاتھ۔

پردیسی - (ایرنا کے بازو کی طرف اشارہ کر کے) این چیست؟

ایرنا - باہو ہے باہو۔

پردیسی: کمال مشابہت ... خون، شون، دست، ست، بازو،
باہو۔

یہ پردیسی آندر تھا، جس کے ساتھ تانبے کی دھات تھی۔ اس کی مدد سے
رودر اور اندر کی نگرانی میں بہت لوگ پہاڑ کاٹنے لگتے ہیں۔ جب آخری
چٹان کٹ چکی تھی، رودر وہاں سے بھاگ نہ پایا، چٹان اس پر گری اور

اور وہ دب کر مر گیا۔ چٹان گرتے ہی سنتی سر کا پانی بہہ گیا اور ننہ کی زمین مسکرانی نمودار ہوئی۔

ڈراما عہد کی قدامت، موضوع کی دلکشی اور پیش کشی کے انداز کی وجہ سے ایک نیم کلاسیکی فضا پیدا کر دیتا ہے۔ یہ ڈراما کئی دفعہ اسٹیج پر بھی پیش کیا گیا۔ اور سنہ ۱۹۶۳ء میں ڈوگری سنستھا کی جانب سے شائع ہوا ہے۔

جتیندر شرما کلچرل اکادمی کے ڈپٹی سکریٹری، پہلے ریڈیو کشمیر، جموں کے شعبہ ڈراما میں مددگار پروڈیوسر کی خدمت انجام دیتے رہے، کئی ریڈیو ڈراموں کے مصنف ہیں۔ شرما جموں کے ایک خوش حال گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کے والد ریاست کی فوج میں لفٹننٹ کرنل کے عہدہ پر مامور تھے، شرما ابھی کم عمر تھے کہ، والد کا سایہ سر سے اُٹھ گیا۔ ان کی تعلیم، جموں ہی میں ہوئی اور بی، اے پاس کر کے ملازم ہو گئے۔ ڈراما کے علاوہ اداکاری سے بھی انہیں دلچسپی ہے۔ چنانچہ ڈوگری فلم "گلاں ہوال بیتیاں" میں انہوں نے ہیرو کا کام انجام دیا ہے۔ شرما کا ایک اور کام "پنڈت نہرو کے مضامین کا ڈوگری ترجمہ ہے۔

ریڈیو کشمیر جموں سے متعلق پنڈت گوپی ناتھ کوشک نے بھی کئی ریڈیو ڈرامے لکھے ہیں۔ انہوں نے کچھ کہانیاں بھی لکھی ہیں۔ جموں ریڈیو کے پروگرام یہ مرتب کرتے ہیں۔ انکی ولادت کشمیر میں سنہ ۱۹۱۶ء میں ہوئی۔ کشمیر میں تعلیم حاصل کی اور ریڈیو میں ملازم ہو گئے۔ یہ اردو کے علاوہ ہندی اور پنجابی میں لکھتے ہیں۔

شری رام شرما ماتری بھگت 'سہلن تواسی' ادب دوست نوجوان ہیں، جن کو ڈراما سے دلچسپی ہے۔ انھوں نے ایک رشوت خوار ناظم تعلیم کی زندگی کا ایک رخ اپنے ایک ڈرامے میں پیش کیا تھا، جسکا نام انھوں نے "امر جیونی" رکھا ہے۔ ناظم کے پاس ملازمت یا مدرسین کے تبادلے ہر چیز کی قیمت مقرر تھی۔ ملازمت خواہوں سے اس کا اعتذار یہ تھا کہ ملازمت نہ ملے تو ایک سال یوں بھی گذر جاتا ہے، ایک سال کی تنخواہ ملازمت کے لئے کچھ گراں معاوضہ نہیں تھا۔ نئے سکول قائم کرنے، سکولوں میں اوپر کی جماعتیں کھولنے، غرض ہر کام کے لئے نقد یا جنس کی صورت میں رشوت کی مقدار مقرر تھی۔ جیون مل کے پاس اپنے لڑکے کی نوکری کے لئے روپیہ دینے کے لئے نہیں ہے، ایسے موقع پر ایک اور ایماندار افسر اس کی مدد کو پہنچ جاتا ہے۔ یہ انکم ٹیکس افسر ہے، جو اسے یہ سمجھاتا ہے کہ اپنی آمدنی کو گھٹا کر لکھا دے، اس سے لڑکے کی نوکری کی بھی صورت نکل آئے گی۔ اور خود اس افسر کا بھی فائدہ ہو جائے گا۔

سماج کے اخلاق کی یہ حوصلہ فرسا تصویر جو بڑی ذہانت سے کھینچی گئی ہے، حالات پر مبنی سہی، ڈرامے کے فن کے لحاظ سے ترچھی سی بیٹھی ہے۔ آخری حصہ معیاری نہیں۔

منوہری رائے زادہ جموں کے ایک اور نوخیز ڈراما نگار ہیں۔ ان کے ڈراموں کا مجموعہ "اردو ڈرامے" کے عنوان سے ۱۹۶۴ء میں شائع ہوا ہے، جس میں پانچ ڈرامے "ایک پتھر ایک محل"

"شمع جلاو شمع بجھاؤ" "ہار گی پر چھائیں" "ناشں کا گھر" اور "پنجرا" شامل ہیں۔ "ایک پتھر ایک محل" کا موضوع ایک سنگتراش سے 'نارائن گڑھ' کی راجکماری کی محبت کی کہانی ہے۔ راجکماری سے شیو پوری کے راجکمار کو عشق ہے اور وہ اپنی محبت کا تحفہ، سنگتراش سے راجکماری کا ایک بے مثل مجسمہ بنوا کر، اسے پیش کرنا چاہتا ہے۔ سنگتراش جب مجسمہ بناتا ہے، تو وہ فن کا ایسا شاہکار ہوتا ہے کہ راجکماری سنگتراش پر لٹو ہو جاتی ہے۔ اور محل چھوڑ کر سنگتراش کے پاس چلی جاتی ہے۔ یہ کسی قدر غیر معتمد موضوع ہے، لیکن رائے زادہ نے اپنی حد تک اسے کامیاب بنانے کی کوشش کی ہے۔ "شمع جلاو شمع بجھاؤ" ہند پر سکندر اعظم کے حملے کا ایک رخ پیش کرتا ہے، جس میں اپنے وطن کے ساتھ ڈرامانگار کے جذبات قابل تحسین ہیں۔ "ہار کی پر چھائیں" بھی قبل تاریخ زمانے سے تعلق رکھتا ہے۔ آریہ نسل کے لوگوں کا ہندوستان میں داخلہ اور سنتھال قوم کی شکست کے چوکھٹے میں آریہ راجکماری روہنی کی سنتھال افسر، شیلا چ سے محبت کا واقعہ اس کا موضوع ہے۔ شیلا چ، روہنی کی محبت کے مرتبہ تک اپنے آپ کو بلند نہیں کر سکتا۔ آخر روہنی اسے ٹھکرا دیتی ہے۔ "ناشں کا گھر" اور "پنجرا" ہمارے عہد کی سماجی زندگی کے نقوش پیش کرتے ہیں۔

رائے زادہ نے اپنے مجموعے کے لئے پیش لفظ خود ہی لکھا ہے، جس میں ڈراموں کے موضوع اور ان کی بعض خصوصیات پر روشنی ڈالی۔

باہر کے

ظفر پیامی، جن کا اصلی نام بریندر ناتھ بیدی ہے۔ پنجاب کے متوطن ہیں۔ یہ کشمیر میں کچھ عرصہ رہے، امر سنگھ کالج میں تعلیم کے زمانے میں، وہ کافی لکھتے رہے اور اچھے لکھنے والوں میں شمار ہونے لگے۔ کالج کے رسالے "لالہ رُخ" کے وہ ایڈیٹر بھی رہے۔ وہ اچھے سخن سنج اور ڈراما نگار ہیں۔ ان کی ایک تصنیف متحدہ عرب جمہوریہ کے صدر، جمال عبدالناصر کے بارے میں بہت مقبول ہوئی۔ ظفر پیامی طالب علمی کے زمانہ کے ختم کے بعد کشمیر سے چلے گئے اور کافی گھومتے پھرتے رہے، مشرق وسطی کا بھی دورہ انھوں نے کیا تھا، اور اسی موقعے پر صدر ناصر کے بارے میں اپنی کتاب کے لئے تحریک حاصل کی تھی۔ اس وقت وہ آل انڈیا ریڈیو دہلی میں ملازمت میں ہیں۔

مضمون اور انشائیے

ادارے اور صحافت

مضمون اور انشائیہ نگار

ان اصناف کی مقبولیت۔ غلام قادر۔ عزیز کاشمیری۔ ملک زادہ غلام نبی۔ بخشی غلام نبی۔ جگناتھ خیبری۔ گوردھن سنگھ۔ ہنس راج پنڈونزا۔ وشوناتھ کھجوریہ۔ رام ناتھ شاستری۔ نریندر کھجوریہ۔ سورج صراف۔ نور محمد بٹ۔ محبوب اللہ مجیب۔ سمسار چند کول۔ بنسی لال رینہ۔ بلدیو پرشاد شاستری۔ ڈاکٹر شری رام۔ پنڈت جانکی ناتھ گنہار۔ دھرم چند پرشانت۔ بلجی ناتھ پنڈت۔ محمد ابراہیم۔ غلام محمد مشتاق۔ ارجن ناتھ رینہ۔ آر۔ ایل مہتہ۔ گنیش داس شرما۔ غلام نبی فراق۔ نیلامبر دیو شرما۔ شریمتی سرجیت مہندر سنگھ۔ شریمتی راج دلاری۔ بنسی لال گپتا۔ کماری چوچی کول۔ عبدالقادر دیوان۔ سعیدہ خانم۔ نذیرہ غازی۔ عبدالاحد رفیق۔ گوری شنکر۔ محمد امین رفیقی۔ پشکر بھان۔ تارا سمیل پوری۔ بال کرشن شرما فدا محمد حسین۔ ماسٹر سمسار چند بڈھو۔ اننت رام شاستری۔ گنگا دت شاستری۔ گنگا دھر شاستری ونود۔ قاضی غلام محی الدین۔ دوارکا ناتھ جلالی۔ پران ناتھ در۔ سیف الدین قاری۔ غلام مصطفےٰ انصاری۔ رشید نازکی۔ اوتار کرشن رہبر۔ مظفر عازم۔ موتی لال کیمو۔ کنول بالی۔ رادھے کشن برارو۔ عبدالسلام۔ اندرجیت لال۔ ثریا جبین ناہید۔ کاشی ناتھ در۔ ساگر چند مہاجن۔ موتی لال ساقی۔ تارا چند بسمل۔

باھر کے ترلوکی ناتھ کندن۔

وطن سے باھر قدرت اللہ شہاب۔ اللہ رکھا ساغر

تصنیف و تالیف محی الدین حاجنی۔ اکبر حیدری۔ سیوا سنگھ۔ شمس الدین احمد۔ محمد امین پنڈت بیگم قریشی۔ مس محمودہ۔ احمد علی شاہ۔ محمد یوسف ٹینگ۔ رشید تاثیر۔ غلام نبی خیال۔ سید تصدق حسین۔ عرش صہبائی مدن موہن شرما۔ وید راہی۔ رفعت جبین۔ جے جیونتی۔

باھر کے | شکیل الرحمان۔

ادارے۔ صحافت۔ رسایل۔ عام رسایل۔ علمی اور ادبی اداروں کے رسایل۔ تعلیمی رسایل۔ کالجوں کے رسایل۔

یونیورسٹی کے رسایل۔ سرکاری رسالے۔ مذہبی رسالے۔

اخبارات۔ روزنامے۔ ہفت روزہ۔ سہ روزہ۔ پندرہ روزہ۔

وطن سے باہر | میر انور محمد۔ عالم سرتاج۔ حفیظ اللہ جالب کاشمیری۔ رفیق خاور۔ شیبو رش کاشمیری۔
آغا خلش کاشمیری۔

جموں و کشمیر گورنمنٹ گزٹ۔ ایک تعلیمی ادارے کا مراسلہ۔ ایک اشتہار عام۔ دو شادی کے رقعے۔
ایک نکاح نامہ۔

مضمون اور انشائیہ اظہار خیال کے ذریعے کی حیثیت، جیسی کارآمد صنف ہے، اس کے اعتبار سے، یہ صنف اہل قلم میں بڑی مقبول رہی۔ مضمون میں تجویز، ترتیب اور تکمیل کے صوری لوازم میں سے کوئی لازمہ ضروری نہ ہونے کی وجہ سے، اس صنف کو مبتلای اور ماہر سب سہولت کے ساتھ برت سکتے ہیں پھر اس صنف کو ہر موضوع اور ہر شعبہ فکر کے لئے یکساں سہولت کے ساتھ استعمال کیا جا سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جموں اور کشمیر کے اہل قلم بھی دوسری ریاستوں کے لکھنے والوں کی طرح اس سے بہت کام لیتے رہے۔ ہر صاحب قلم خواہ وہ افسانہ نگار ہو، کہ ڈرامہ یا ناول نگار یا مصنف اس کے لئے ایسے موقع آجاتے ہیں کہ وہ مضمون یا انشائیہ لکھنے پر مائل یا مجبور ہو جاتا ہے۔ چنانچہ پچھلے ابواب میں جتنے شعرا، افسانہ یا نگاروں اور مصنفین و مولفین کا تذکرہ کیا گیا، ان میں سے اکثروں نے مضامین یا انشائیے لکھے ہیں۔ اسی طرح اس دور کے مضمون نگاروں میں بھی کئی ایسے ہیں جن کی دلچسپی محض اسی صنف تک محدود ہیں۔

اس دور میں اور اس سے پہلے کے دور میں بھی مضمون نگاری اور انشائیہ نگاری کی تحریک کا بڑا سبب اخباروں میں۔ ریاست میں اخبار جن جماعت جاری ہوتے رہے اس کے مد نظر یہ حیرت کی بات ہیں کہ یہاں

ان گنت مضمون نگار پیدا ہوئے، گو ان سب کے معیار یکساں نہیں ہیں۔ کئی روزنامے ادبی شمارے بڑے اہتمام سے شایع کرتے ہیں۔ ان کے علاوہ ہفت روزہ اخباروں ادبی حصہ شامل ہوتا ہے اور ان ادبی حصوں کی بدولت بہت سے لکھنے والے منظر عام پر ابھرے۔ ریاست میں اخباروں کے اجرا کی تحریک کے سلسلے میں اس کی وضاحت کی جا چکی ہے کہ ریاست کے لکھنے والوں کے لئے کوئی محرک اور کوئی میدان نہیں تھا تو وہ باہر کے اخباروں اور رسالوں کے لیے لکھا کرتے تھے۔ لیکن یہ دور کی چیز تھی اور باہر کے اخباروں یا رسالوں سے ریاست کے لکھنے والوں کے بہت زیادہ نشو میں یا تحریک نہیں مل سکتی تھی۔ ہم یہ بھی بتا چکے ہیں کہ ریاست میں اخباروں کے اجرا کی اجازت سے پہلے، کشمیری اہل قلم ریاست میں اخبار مرتب کر کے، باہر کے شہروں جیسے لاہور، امرتسر، جالندھر یا سیالکوٹ سے چھپواتے اور شایع کرتے تھے۔

اس دور کے مضمون نگاروں کی تخلیقات میں، موضوعات کے لحاظ سے بہت وسعت ہے۔ تاریخ تہذیب و ثقافت، سیاست، ادب، فن تعلیم اور صنعت گری، غرض ہر موضوع پر مضامین لکھے گئے ہیں۔ اور جو مضامین لکھے گئے وہ بحیثیت مجموعی، پچھلے دور کے مقابلے میں۔ اس مخصوص صنف کے زیادہ رچے ہوئے شعور کے حامل ہیں۔ انشائیے اس زمانے میں بہت کم یا بالکل نہیں لکھے گئے۔ یہ ذوق پنجاب کے لکھنے والوں کے ساتھ ساتھ ریاست کے لکھنے والوں میں ختم ہو گیا۔

غلام قادر بیدار ٹین کے متوطن "گلریز" کے لکھنے والوں میں سے ہیں۔ اپنے ہی وطن کے ایک کشمیری شاعر قادر پٹنوی کے بارے میں انہوں نے ایک تعارفی مضمون شمارہ جون ۱۹۵۳ء میں شایع ہوا تھا۔ غلام قادر کا تعلق سیاست سے بھی رہا اور وہ مجلس قانون ساز کے رکن بھی رہے۔

عزیز کاشمیری، جو "روشنی" ہفتہ وار سری نگر کو مرتب کیا کرتے تھے۔ مضامین بھی لکھتے ہیں۔ ان کا ایک معلومات آفریں مضمون "صحائف اور ادب العالیہ کے کشمیری تراجم" رسالہ تعمیر، شمارہ نومبر، دسمبر ۱۹۶۱ء میں شایع ہوا۔ مضمون میں بڑی وقت نظر سے ان سارے کشمیری ترجموں کی تفصیل جمع کی ہے، جو عربی، فارسی اور اردو سے ہوئے ہیں۔ اردو سے کئے گئے ترجموں میں "آرائش محفل" اور "باغ و بہار" کے ترجمے خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

غلام رسول کوچک، صدر الدین مجاہد اور ملک زادہ غلام نبی مشہور سیاسی کارکن اور قائد ہیں۔ وقتاً فوقتاً

ان میں سے ہر ایک کا تعلق صحافت سے بھی رہا۔ اس کے علاوہ زیادہ تر سیاسی موضوعات ان کے مضامین بھی شائع ہوئے۔ کوچک اننت ناگ کے متوطن ہیں اور شیخ محمد عبداللہ اور مرزا محمد افضل بیگ کے ساتھ کام کرتے رہے۔

مجاہد کا تعلق صحافت اور سیاست دونوں سے گہرا رہا ہے اس تعلق سے وہ لکھتے رہے ہیں۔ ان کے مضامین میں ایک اچھا مضمون میرپور کے مشہور آزادی کے لئے لڑنے والے قاید راجہ محمد اکبر خان کے بارے میں "محاذ" (۲۵ جولائی ۱۹۶۲ء) میں شائع ہوا ہے۔ راجہ صاحب کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں۔

"راجہ محمد اکبر خان صاحب نے جو قربانیاں اپنی زندگی میں حصول حق خود ارادیت کے لئے دی ہیں۔ ان کی افادیت کے سامنے ہماری گردنیں جھک جاتی ہیں۔ وہ چوٹی کے رہنماؤں میں تصور کئے جاتے تھے۔"

ملک زادہ کی دلچسپی سیاست ہے اور وہ بھی سیاسی موضوعات پر لکھتے رہے۔

بخشی غلام علی محکمہ انفارمیشن میں اسسٹنٹ ڈائریکٹر ہیں۔ وہ بھی کبھی مضمون لکھتے رہیں۔ ایک مضمون "کشمیر میں اون کی صنعت کے بارے میں انہوں نے تعمیر میں شائع کیا تھا جو اس صنعت کے بارے میں معلومات فراہم کرتا ہے۔

جگناتھ خیبری نشتر کاشمیری سرینگر کے متوطن ہیں اور ریاست کے ایک سکول میں مدرس۔ وہ ریاست کے پرانے لکھنے والوں میں سے ہیں۔ وہ عموماً مزاحیہ انداز کے انشائیے اور خاکے لکھتے ہیں۔ کئی تنقیدی مضامین بھی لکھے ہیں۔ صحافت سے بھی انہیں لگاؤ رہا چنانچہ کشمیری اخبار "چمن" ہفتہ وار کے حلقۂ ادارت میں انہوں نے کچھ عرصہ کام کیا اور جموں کے "چاند" کے ادارہ تحریر میں بھی کام کرتے رہے۔

نشتر کا ایک اچھا مضمون "کھانا" کے عنوان سے چھپا تھا اس سادہ عنوان سے انہوں نے ایک سماجی اور سیاسی مفہوم پیدا کرنے کی کوشش کی ہے، لکھتے ہیں؛

"لوگ آج کل کمیونزم کا خیر مقدم کرتے ہیں کیوں؟ تاکہ "کھائیں" اور "کھاتا" کی بیل منڈھے چڑھے زردار کیوں غریبوں کو پاؤں تلے روندنے کی سعی لاحاصل کرنے میں لگے ہوئے ہیں؟ تاکہ خود ہی "کھانا" کھائیں۔ روس ان دنوں کیوں دندناتا رہا ہے؟ تاکہ "کھاتا" مساوی طور پر اس دھرتی کے آدمیوں کو ملے ... جو کیا ہے؟ ... غریب جنہوں کو ... وقت کا کھانا میسر ہو۔

نشتر کا ایک "خیالی پلاؤ" "وکیل" (سرینگر دسمبر ۱۹۵۹ء) میں شایع ہوا تھا۔ یہ مقبول انداز کا مذاق ہے اور اس میں کہیں کہیں مزاح کی جھلکیاں بھی مل جاتی ہیں۔ اس کا آغاز اس طرح ہوتا ہے:

"ہندوستان کے مفکر اعظم حضرت شیخ چلی علیہ الرحمۃ کو خدا جنت بخشے کہ جن کی برکت سے اب ہم بھی خیالی پلاؤ کا لطف اٹھاتے ہیں، اور جب بھی جی چاہتا ہے پیٹ بھر کر اور شکم سیر ہو کر خیالی پلاؤ پکاتے ہیں۔ جب انسان کو پلاؤ نہ ملے تو یہ خیالی پلاؤ ہی پکانے بکتا ہے۔"

کچھ رپورتاژ بھی ان کے قلم کی یادگار ہیں۔ ریاست کے اساتذہ کی دوسری سالانہ کانفرنس منعقدہ اکتوبر و نومبر ۱۹۵۶ء کی رپورتاژ "اساتذہ کے ادارہ کے ترجمان" "استاد" (سرینگر) میں شایع ہوئی۔ اس کا انداز دلچسپ اور ادبی ہے۔ لکھتے ہیں:-

"دور ہمالیہ کی بلندیوں کی طرف نظریں دوڑاتے ہوئے کاروان آگے بڑھا۔ ہمالیہ کا سا عزم، چناروں جیسی ٹھنڈک، اور کشمیر کے جھرنوں ایسی تیز رفتاری لے کر کارواں آگے بڑھا۔ پستیوں کو خاطر میں نہ لاتا ہوا، زمانے کے اتار چڑھاؤ پر ایک نظر ڈال کر کارواں آگے ہی بڑھتا گیا۔ خاردار راستوں نے اس کے دامن کو تار تار کر دیا لیکن خاردار راستوں کے بعد گلہائے بوقلموں نے اس کے قدموں کو چوما اور وہ منزل مقصود پر پہنچ ہی گیا۔"

گوردھن سنگھ کا تذکرہ بہ حیثیت شاعر کے گذر چکا ہے، وہ ریاست کے ایک کالج میں لکچرر رہیں۔ انہوں نے کشمیر کی تاریخ کے بارے میں کچھ اچھے مضامین بھی لکھے ہیں۔ رنجیت دیو کی کشمیر میں بدنام حکومت کو وہ سراہتے ہوئے لکھتے ہیں:

"ایک وسیع اور مالا مال ریاست قایم کر کے رنجیت دیو نے انصاف، انسانیت اور رواداری کی بنیادوں پر حکومت کی بنیادیں استوار کرنے کی طرف توجہ دی۔ اس نے عام انتظامیہ سے متعلق افسروں کے رویے پر کڑی نگرانی شروع کی اور چھوٹی چھوٹی جزئیات بھی اس کی نگاہ سے پوشیدہ نہیں رہتی تھیں۔"

ہنس راج پنڈتو تاریخی موضوعات پر لکھتے ہیں۔ ان کا ایک معلومات افزا مضمون علاقہ ڈوگر کے قدیم

باشندے" رسالہ "شیرازہ (مئی ۱۹۶۳ء) میں شایع ہوا تھا۔ اس میں جموں اور اطراف واکناف ڈگر علاقوں کے قدیم دور پر مفید روشنی ڈالی ہے۔

وشوناتھ کھجوریہ، رام ناتھ شاستری اور نریندر کھجوریہ تینوں بھائی علم و ادب کا پاکیزہ ذوق رکھتے ہیں۔ وشوناتھ سب سے بڑے بھائی ایک سکول کے مدرس ہیں، وہ ڈوگری کے بھی اچھے انشاپرداز ہیں اور اس زبان میں ایک کتاب کے بھی مصنف ہیں جس پر کلچرل اکادمی نے انہیں انعام عطا کیا۔ ڈوگری ادب اور مصنفین کو روشناس کرانے کے لئے وہ اردو میں لکھتے رہتے ہیں۔ ان کا اسی موضوع پر ایک مضمون "ڈوگری ادب کا نیا دور" کے عنوان سے "شیرازہ" (سرینگر) میں شایع ہوا تھا، اس کا اقتباس ذیل میں درج ہے۔

"ڈوگری ادب کا پہلا دور آنجہانی مہاراجہ رنبیر سنگھ کی وفات (۱۸۸۲ء) کے ساتھ ہی ختم ہو گیا۔ اس دور میں ڈوگری زبان کی ترویج اور اشاعت کو بہت عروج ہوا۔ فارسی اور سنسکرت کی متعدد کتب کا ڈوگری میں ترجمہ ہوا۔ علم طب، جیوتش، حسابوں کی کتب اور ابتدائی درجہ تک کی درسی کتب ڈوگری میں لکھی گئیں جن کا رسم الخط دیوناگری تھا۔"

اس اقتباس سے مہاراجہ رنبیر کے دارالترجمہ کے کام اور ڈوگری کو ذریعہ تعلیم بنانے کے لئے جو کوشش کی گئی اس پر اچھی روشنی پڑتی ہے۔ وشوناتھ کا ایک اور دلچسپ مضمون پہاڑی لوک گیت "چن" کے بارے میں "شیرازہ" کے ایک شمارے میں شایع ہوا تھا، جس میں "چن" گیتوں کا تعارف کراتے ہوئے وہ لکھتے ہیں۔ "بنفشہ کا تازہ جنگلی پھول جن لوگوں نے دیکھا ہے وہ جانتے ہیں کہ ظاہرا طور پر وہ کتنا چھوٹا اور بے قدر دکھائی دیتا ہے۔ لیکن اس کی سادگی، اس کی نزاکت اور اس کا شرمیلاپن، قدر دان کے دل کو چھو لیتا ہے۔ یہی بات ہمارے پہاڑی لوک گیتوں پر بھی پوری اترتی ہے۔"

وشوناتھ کھجوریہ کے دوسرے بھائی پروفیسر رام ناتھ شاستری[1] مولانا ابوالکلام آزاد میموریل کالج میں سنسکرت کے پروفیسر ہیں۔ ان کا شمار ڈوگری کے نئے شاعروں اور ادیبوں میں ہوتا ہے۔ اردو سے بھی انہیں گہرا لگاؤ رہا ہے چنانچہ وہ "شیرازہ" (اردو) کی مجلس مشاورت کے رکن رہے اور کئی علمی اور معلومات آفریں مضامین انہوں نے "شیرازہ" کے لئے لکھے۔ ان میں "ڈوگری لوک گیت" کے موضوع پر ان کا ایک جائزہ خاص طور پر قابل ذکر ہے

[1] وہ اب کلچرل اکادمی کی ڈوگری ڈکشنری کے مدیر اعلیٰ ہیں۔

اس مضمون میں لوک گیتوں کی تہذیبی، سماجی اور ادبی اہمیت پر روشنی ڈالنے کے بعد لوک گیتوں کو منظر عام پر لانے کے سلسلے میں جموں اور ہندوستان کے دوسری ریاستوں میں جو کام ہوا ہے۔ اس کی بھی مختصر تفصیل دی ہے۔ ڈوگری لوک گیتوں کے بارے میں وہ رقمطراز ہیں:

"لوک گیت ایک دلچسپ انسانی تخلیق ہیں۔ اس لئے ان گیتوں کے جنم اور ان کے جنم داتاؤں کے بارے میں کھوج کرنا کم دلچسپ نہیں ہے۔ کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ ڈوگروں کی قومی زندگی میں، ان کی شجاعت، اور بہادری کے گنتوں کی بہت تعریف ہے، لیکن ڈوگر کے لوک گیتوں میں شجاعت اور بہادری کی توصیف وثنا کرنے والے چھوٹے گیتوں کی تعداد انگلیوں پر گنی جا سکتی ہے۔ وجہ صاف ہے۔ بہادر اپنی تعریف سے دور بھاگتا ہے، اور اس کی جانباز بیوی اور اس کی بہادری اور شجاعت کی تعریف کیسے کرے جس کی وجہ سے اس کی تمنا بھری جوانی کو ہجر کی آنچ میں جلنا پڑتا ہے!"

ڈھال، تلوار تیری کیلیاں چھورے گھرے مچھورے تیری بانکی نار
او میرے سپاہیا نام کٹاری کری گھر آئی جاں

پروفیسر شاستری کو ڈوگری زبان اور ادب کی ترقی کی بڑی لوہ ہے۔ وہ ڈوگری سنستھا کے بانیوں میں سے ہیں اور انہیں کی کوششوں سے جموں وکشمیر یونیورسٹی میں ڈوگری کے امتحانات قائم ہو سکے۔

ان ادب دوست بھائیوں میں سے سب سے چھوٹے نریندر کھجوریہ ہیں[1]۔ ان کی ملازمت کا آغاز سکول کی مدرسی ہوا لیکن ان کی ادبی صلاحیتوں کے مدنظر کلچرل اکادمی نے انہیں "ہندی شیرازہ" کی ادارت کیلئے منتخب کیا۔ اب وہ اسے مرتب کر رہے ہیں۔ اس کے علاوہ ڈوگری کے بھی اچھے ادیب ہیں۔ چنانچہ ان کی تصانیف پر کلچرل اکادمی کی سے انعامات عطا ہوئے ہیں۔ ڈوگری اور ہندی میں وہ ناول اور کہانیاں لکھتے ہیں۔ اردو میں انہوں نے کچھ مزاحیہ اور کچھ سنجیدہ موضوعات پر ڈرامے اور کچھ مضامین بھی لکھے ہیں۔

سورج صراف، لالہ ملک راج صراف کے فرزند کی ذہنی تربیت صحافت اور ادب کے ماحول میں ہوئی۔ اس لئے کوئی تعجب نہیں کہ وہ انشا پردازی سے دلچسپی رکھتے ہیں۔ سورج صراف نے بھی مضامین لکھے ہیں۔ ان کا ایک

---

[1] نریندر کھجوریہ کا بہت پہلے انتقال ہو چکا ہے

دلچسپ مضمون "بھدرواہ" (ہمالیہ کی ایک حسین وادی) کے بارے میں "تعمیر" (ستمبر ۱۹۶۱ء) میں شایع ہوا ہے، جس میں انہوں نے مشہور یورپی سیاح وین کے تاثرات نقل کرتے ہوئے بتایا ہے کہ کوہ ہمالیہ کے دامن میں کشمیر کے بعد یہ سب سے زیادہ خوبصورت جگہ ہے۔ ان کا ایک سفرنامہ "جموں سے سرومیں سر" بڑا دلچسپ ہے اور افسانے کے انداز میں لکھا گیا ہے۔

نور محمد بٹ، کشمیری ادب کے دلدادگان میں سے ہیں، اور اس موضوع پر اردو میں مضامین لکھتے رہے ہیں۔ "شیرازہ" کے شمارہ جولائی ۱۹۶۳ء میں ان کا ایک اچھا مطالعہ "کشمیری شاعری میں موضوعاتی تبدیلیاں" کے عنوان پر شایع ہوا تھا۔ جس میں کشمیری شاعری کے متنوع موضوعات کا جائزہ لیتے ہوئے لکھا ہے۔

"موضوعات کے لحاظ سے کشمیری شاعری تین مقامات سے گذری ہے، حسن و عشق، تصوف اور سیاست۔ جب ہمارے شعرا کا منتہائے مقصود محض حسن و عشق ہی تھا تو وہ شاعری کو ایک خوبصورت پرندہ سمجھ کر اس کے خدوخال، اس کی ترنم آمیز چہچہاہٹ اور اس کی اچھل کود پر فریفتہ ہے۔ حبہ خاتون وہ پہلی شاعرہ ہے، جس نے اپنے اشعار میں تصور حسن و عشق کو انہیں معنوں میں استعمال کیا ہے ...."

آگے دوسرے موضوعات پر بھی روشنی ڈالی ہے۔

محبوب اللہ مجیب نے بھی مضامین لکھے ہیں۔ پرانے زمانے کے فرانسیسی سیاح برنیر نے جب کشمیر کی سیاحت کی تھی تو اس کے حسن اور خوبصورتی کے بارے میں جو تاثرات قلمبند کئے تھے، ان پر مبنی ایک مضمون انہوں نے "کشمیر ـــ برنیر کی نظر میں" کے عنوان سے لکھا تھا جس میں ستی سر اور کیشپ رشی کی روایت کے بارے میں برنیر کے ایک خط کا ترجمہ بھی دیا ہے۔

سمسار چند کول کا تذکرہ انگریزی کے مُصنّف کی حیثیت سے گزر چکا ہے اور ان کی تصانیف کی تفصیل بھی دی جا چکی ہے۔ کول، سرینگر کے مشن سکول میں مدرس رہے، اور اب اپنی خدمت سے سبکدوش ہو کر علمی مشاغل میں لگے ہوئے ہیں۔ اردو میں بھی وہ اپنی دلچسپی کے موضوعات، کشمیر کی تاریخی، دلچسپی کے مقامات اور خاص طور پر پرندوں کے بارے میں لکھتے ہیں۔ ان کا ایک قابل مطالعہ مضمون "کشمیر کا عالم طیور" ہے، جو

"شیرازہ" (شمارہ ستمبر ۱۹۶۲ء) میں شایع ہوا ہے۔ مضمون میں کشمیر کے عام پرندوں جیسے مینا، بلبل کے علاوہ موسم بہار میں آنے والے پرندوں اور موسم سرما میں یہاں منتقل ہونے والے پرندوں اور کئی بلوں کی تفصیل لکھی ہے۔ مضمون پرندوں سے دلچسپی رکھنے والوں کے علاوہ عام قارئین کے لئے بھی بہت دلچسپ ہے۔ موسم گرما میں کشمیر آنے والے مہمان پرندوں میں کستور کا حال لکھتے ہوئے وہ بتاتے ہیں۔

"کستور، چترال سے لے کر مشرقی نیپال تک پایا جاتا ہے اور جاڑے میں دکن کو نقل مقام کر جاتا ہے، اور اسی موسم میں سکم، کچھار اور منی پور میں بھی پایا جاتا ہے۔ باغوں میں اکثر یہ کیڑے مکوڑے کھانے کی دھن میں زمین پر پھدکتا نظر آتا ہے۔ اپریل سے جولائی تک دن کے وقت چہچہاتا رہتا ہے۔ لیکن عام طور پر صبح و شام کو اور خاص طور پر بادل کے اوقات میں لگاتار گاتا رہتا ہے۔"

ینسی لال رینہ، بانڈی پور کے متوطن ہیں۔ انہیں خاص طور پر بچوں کی دلچسپی کے مضامین اور لطیفے لکھنے کا شوق ہے، اور یہ مضامین یا لطیفے اخباروں میں شایع ہوئے ہیں۔

بلدیو پرشاد شرما، ریاست کے مشہور صحافی ہیں۔ وہ عرصہ تک انگریزی اخبار "کشمیر ٹائمز" کی ادارت کرتے رہے۔ ان کی صحافتی صلاحیتوں کے مدنظر حکومت نے انہیں انفارمیشن کے محکمے میں مددگار ناظم کے عہدہ پر مامور کیا۔ اب وہ اس محکمے کے ناظم ہیں[1]۔ اردو میں بھی وہ مضامین لکھتے ہیں۔ ریاست کی فوجوں کے بارے میں ان کا ایک حوصلہ دلانے والا مضمون "ہمارے بہادر سپاہی" "امر" کے کرن نمبر میں شایع ہوا تھا۔ یہ بہت سیر حاصل جائزہ ہے، جس میں ریاست کی فوجوں نے ریاست میں اور ریاست سے باہر جو یادگار خدمات انجام دی ہیں ان کی تفصیل درج کی ہے۔ انگریزی حکومت کی جانب سے ان افواج کو جو اعزازات ملے تھے، ان کا تذکرہ بھی مضمون میں کیا ہے۔

"امر" کے قلمی معاونین میں ایک اور لکھنے والے ڈاکٹر شری رام بھی تھے، جو اظہار پر اچھا قابو رکھتے ہیں۔ ان کا ایک قابل ذکر مضمون "بہتر دنیا کی تعمیر" کے عنوان سے ۱۹۴۲ء میں لکھا گیا تھا۔ مضمون کا آغاز اس طرح کرتے ہیں۔

"یہ دنیا اچھی ہے، جہاں تک اس کے باشندے اچھے ہیں۔ یہ دنیا بہتر بنائی جا سکتی ہے۔ بشرطیکہ آپ

---

[1] شرما صاحب اب وظیفہ حسن خدمت پر ہیں۔

اور ہیں اپنی اپنی جگہ رہتے ہوئے' اپنی اپنی ذمہ داریاں پہچانتے ہوئے اپنے اپنے فرایض کو بہت ہوشیاری' خوبی اور نیکی سے انجام دیں......"

پنڈت جانکی ناتھ گنہار' اس زمانے کے لکھنے والوں میں نمایاں رہے۔ وہ معلومات عامہ اشاعت کے محکمے میں مددگار ہیں۔ یوراج کرن سنگھ' سابق صدر ریاست جموں و کشمیر کی زندگی کے بارے میں انہوں نے بچپن کا ایک واقعہ بیان کیا ہے' جس سے کرن سنگھ کی بچپن سے تقریر کی عادت اور اس میں ریاضت پر روشنی پڑتی ہے۔ یہ مضمون "امر" کے "کرن نمبر" میں شایع ہوا ہے۔ جو یوراج کی سالگرہ کے موقع پر مرتب کیا گیا تھا۔

دھرم چند پرشانت ڈوگری کے ادیب اور جموں کے علمی' ادبی اور صحافتی حلقوں کی نمایاں شخصیت ہیں۔ وہ پریس ٹرسٹ آف انڈیا کے جموں میں نمایندے ہیں۔ ڈوگری سنستھا کی صدارت بھی ان کے تفویض رہی۔ اردو میں ان کی افسانہ نگاری کا تذکرہ کیا جا چکا ہے' پرشانت مضامین لکھتے رہے ہیں۔ ان کا ایک مضمون "جموں و کشمیر میں ہندی کی ترویج" کے عنوان سے "شیرازہ" (مئی ۱۹۶۲ء) میں شایع ہوا تھا جس میں کشمیر کی وادی سے سنسکرت کے تعلق پر بحث کرنے کے بعد ریاست میں ہندی کی ترویج میں جو سب سے بڑی رکاوٹ ہے اس کا شکوہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"ہندی جریدوں کی ادارتی پالیسی کا شاید سب سے برا اثر کشمیر کے ہندی ادیبوں پر پڑا ہے۔ کشمیر کے ہندی ادیب ان اڈیٹروں سے کوئی رعایت نہیں چاہتے' وہ کسی خاص عنایت سے طلبگار نہیں ہیں۔ ہندی بولنے والے صوبوں کے آچاریوں سے تو وہ اتنا چاہتے ہیں کہ ان کی تخلیقات کے ساتھ ناانصافی نہ ہو......"

اور یہ شکوہ اردو لکھنے والوں کی طرف سے بھی ہے۔

پروفیسر بلجی ناتھ پنڈت' پنڈتوں کے ایک عالم خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ وہ سنسکرت کے عالم ہیں' اور اس وقت سرکاری کالج اسلام آباد میں سنسکرت کے پروفیسر ہیں[1]۔ سنسکرت کے عالم ہونے کے ناتے انہیں شیو تعلیمات اور فلسفہ سے بھی گہرا لگاؤ ہے۔ وہ ان موضوعات پر اردو میں لکھتے ہیں۔ چنانچہ ان کا ایک مضمون "کشمیر

ع۱۔ بلجی ناتھ پنڈت اب سرکاری ملازمت کی پنڈتوں سے آزاد ہیں

میں فلسفہ شیوؔ کے عنوان سے "تعمیر" (شمارہ جنوری، فروری ۱۹۶۱ء) میں شایع ہوا ہے، مضمون میں شیو فلسفہ کی قدامت اور کشمیر میں اس مسلک کی اشاعت اور اس میں جو صاحبان فکر گزرے ہیں، ان کے خیالات پر روشنی ڈالی ہے۔

پروفیسر محمد ابراہیم، جو اردو، فارسی اور عربی کے عالم ہیں۔ ان تینوں زبانوں میں ایم۔ اے کامیاب کیا ہے۔ عرصہ تک وہ ریاست کے کالجوں، خاص طور پر سری پرتاپ کالج میں، ان زبانوں کے ادب کا درس دیتے رہے، اب کی ہر جہتی صلاحیتوں کے مد نظر، حکومت نے انہیں ریسرچ اینڈ پبلی کیشن کے محکمے میں مددگار کی حیثیت سے متعین کیا ہے۔ وہ اس وقت ریسرچ لائبریری میں محفوظ مخطوطات کی وضاحتی فہرست مرتب کر رہے ہیں۔ پروفیسر ابراہیم، اردو میں علمی اور تحقیقی موضوعات پر لکھتے ہیں۔ سری پرتاپ کالج میں کام کرنے کے زمانے میں طلباء کی ادبی اور تحریری صلاحیتوں کو ابھارنے میں انہوں نے بڑا نمایاں حصہ لیا اور شاید ڈاکٹر محمد دین تاثیر کے عہد کے بعد، کالج میں اردو کے ادبی ذوق و شوق کو ابھارنے میں سب سے زیادہ ہاتھ انہیں کا رہا۔ وہ "پرتاپ" کے نگران بھی رہے، اور اس میں مسلسل لکھتے رہے، اور بعض شمارے تو صرف انہیں کی تخلیقات سے مزین ہو کر "ابراہیم نمبر" کی شکل اختیار کر گئے ہیں۔

پروفیسر ابراہیم نے بہت سے مضامین بہت سے موضوعوں پر لکھے ہیں۔ ان کے تین مضمون خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ایک "پنڈت دیارام کاچرو خوشدل"، پر دوسرا کشمیر کے ریختہ گو شعرا کے بارے میں اور تیسرا پنڈت چندر بھان برہمن سے متعلق۔ یہ بڑے اچھے تحقیقی مقالے ہیں جن میں سے پہلا "گلریز" (شمارہ جون ۱۹۵۳ء) میں شایع ہوا۔ دوسرا جموں و کشمیر یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے ترجمان "ادبیات" میں اور تیسرا غالباً اشاعت پذیر ہے۔ خوشدل پر ان کا مضمون عمدہ تحقیقی اور تنقیدی جائزہ ہے۔ خوشدل کا تذکرہ اس کتاب کے چوتھے باب میں کیا جا چکا ہے۔

پروفیسر محمد ابراہیم کے دوسرے عالمانہ انداز کے مضامین میں "کشمیر کے علماء" اور "مرزا مہدی مجرم کاشمیری بھی تحقیقی نوعیت کے ہیں۔ ان کا ایک اور اہم مضمون "ذکر سعادت" کے عنوان سے، مورخ کشمیر مفتی محمد شاہ سعادت اور ان کے کارناموں پر قلمبند کیا گیا ہے۔ "علمائے کشمیر" میں انہوں نے عہد شہمیری کے سربرآوردہ عالموں، ملا احسن، علامہ میر سید احمد سامانی، ملا کمال اور ملا احمد کشمیری کے حالات قلمبند کئے ہیں۔ مرزا مہدی مجرم کشمیر کے

فارسی گو شعرا میں اونچا مقام رکھتے ہیں۔ ان کے بارے میں بھی تذکروں اور تاریخوں سے مواد اخذ کر کے اکٹھا کیا ہے اور ان کی شاعری پر تبصرہ کیا ہے۔ سلطان زین العابدین بڈشاہ کے عہد میں عوامی رفاہی کاموں پر بھی پروفیسر ابراہیم ایک مضمون بھی قابل ذکر ہے، جو "گریز" کے شمارہ فروری ۱۹۵۱ء میں شایع ہوا ہے۔

پروفیسر ابراہیم خاص ادبی مضامین میں "موازنہ اور اس کے اصول"، جو "ہمارا ادب" ۱۹۶۵ء میں شایع ہوا ہے ادب اور خصوصاً شاعری کے موازنے اور اس کے اصول، ضرورت اور لوازم پر وقت نظر سے روشنی ڈالی ہے اور ان اصولوں کی رہنمائی چند تنقیدی رجحانوں کو بھی جانچنے کی کوشش کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

"موازنہ کرنے والے کو قدیم اور جدید کے چکر سے بالاتر رہنا چاہیئے، اس کے برعکس جہاں بھی اسے شعری حسن نظر آئے۔ اس کا قدر دان ہو.........."

اس مضمون میں انہوں نے ایک نیا لفظ "موازن" یعنی موازنہ کرنے والا کے مضمون میں اردو کو دینے کی کوشش کی ہے۔ وہ اردو کو خانوں میں بانٹ کر محاکمہ کرنے کے قدیم مذموم رجحان کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"ایک اچھا موازن خود کو لکھنوی یا دہلوی خانوں میں نہیں بانٹتا۔ وہ شعر کا بہ حیثیت شعر مطالعہ کرتا ہے.............."

پروفیسر ابراہیم نے تاریخ حسن کی تلخیص کر کے اسکا اردو ترجمہ بھی کیا ہے۔ جو سرینگر کے مشہور پبلشر غلام محمد نور محمد تاجران کتب نے شایع کیا ہے۔ غلام محمد مشتاق نے جو "خدمت" کے حلقۂ ادارت میں کام کرتے رہے ہیں اردو میں چند انشائیے بھی لکھے ہیں۔ ان کا ایک انشائیہ "تو بھی فلک بدل کر زمانہ بدل گیا" ۱۹۴۹ء میں شایع ہوا تھا۔ اس زمانے میں ہند سے کشمیر کا الحاق ذہنوں میں لیا ہوا تھا۔ مشتاق مختلف لوگوں کے خیالات پر تبصرہ کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

"ہمارے ملک کی ناو بھنور میں پھنسی ہوئی ہے۔ موجوں کے تھپیڑے کھاری ہے اور باد و باراں سمندر کی متلاطم خیز بیچینیا کو مزید گرما کر شکستہ ناو کو دائمی الجھن اور اضطراب میں رکھے ہوئے ہیں۔ لوگ کشتی کے حال اور اپنے انجام سے بے خبر ہیں۔"

مشتاق سیاسی مسایل کے بارے میں اپنی رائے رکھنے کے علاوہ ادبی مذاق سے بھی بہرہ رکھتے ہیں۔ تنہائی کے

عنوان سے انہوں نے ایک انشائیہ لکھا تھا جس کا اقتباس یہ ہے۔

"میں سوچتا ہوں اور سوچنے میں حق بجانب ہوں کہ تنہائی ایک بڑی نعمت ہے۔ تصورات کی دنیا میں کھو کر لطف اندوز ہوتا ہوں۔ میں اپنے کو اکیلا اور بے بس نہیں پاتا۔ جن سے ملنے کی کبھی امید نہ تھی وہ بالکل میرے قریب بیٹھے ہیں اور بے تکلفی کے ساتھ معشوقانہ انداز میں میرے ہر سوال کا حوصلہ افزا جواب دے رہے ہیں۔"

پروفیسر ارجن ناتھ ریبنہ، جغرافیہ کے استاد ہیں۔ انہوں نے مختلف کالجوں میں کام کیا۔ اردو علم و ادب کا بھی وہ ذوق رکھتے ہیں۔ جس زمانے میں سری پرتاپ کالج میں کام کرتے تھے۔ وہ کالج کے رسالے "پرتاپ" میں لکھا کرتے تھے۔ ان کے ایک مضمون کا حوالہ وشونا تھ درماہ کے سلسلے میں دیا جا چکا ہے۔ یہ مضمون ماہ کے بارے میں انہوں نے ۱۹۵۰ء کے ایک شمارہ میں شائع کیا تھا۔ ماہ کے بارے میں یہی ایک تحریری مواد ہے۔ مضمون کے آغاز میں ریبنہ دور غلامی کی کس مپرسیوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"غلامی کی اس بڑی رسی کے نیچے کتنے دبے ہوئے تھے، فرسودہ نظام کی تاریکیوں میں کتنے کھو گئے تھے! یہ سب کچھ آج ہم کو پتہ لگ رہا ہے۔ آج ہم ایک ایسے ہی شاعر کو لا کھڑا کریں گے جسے بہت کم لوگ جانتے ہیں۔"

ڈاکٹر آر۔ ایل۔ مہتہ، تاریخی دلچسپی کے موضوعات پر مضامین لکھتے ہیں۔ "تعمیر" کے شماروں میں ان کے کئی مضامین شائع ہوئے ہیں۔ "جموں و کشمیر کے مندر" کا موضوع مذہبی نوعیت کا نہیں، بلکہ یہ تاریخی اور آثار قدیمہ کی نوعیت کا مضمون ہے۔ ان کا ایک اور اچھا مضمون "تلاش کشمیر" کے عنوان سے اسی رسالے کے شمارہ مارچ و اپریل ۱۹۶۱ء میں شائع ہوا ہے۔ جس میں مہتہ نے اس سرزمین کی تاریخی قدامت پر روشنی ڈالی ہے۔

گنیش داس شرما جو عام طور پر جی۔ ڈی۔ شرما کے نام سے بہتر متعارف ہیں، جموں سے تعلق رکھتے ہیں۔ تعلیم ختم کرنے کے بعد انہوں نے سکول میں ملازمت کر لی تھی، پھر ناظم محکمہ اطلاعات و معلومات عامہ کے ناظم کے عہدہ تک ترقی کی۔ علمی اور صنعتی موضوعات سے انہیں دلچسپی ہے اور کچھ مضامین ان موضوعات پر لکھے ہیں۔ ایک مضمون "صنعت ابریشم" بھی لکھا تھا۔ جس میں ریاست میں ریشم کیڑوں کی پرورش اور افزائش اور ریشم کی پیداوار

میں جو نئے نئے تجربے کئے جا رہے ہیں ان کی تفصیل بتائی ہے۔ شرما کا یہ مضمون بھی "تعبیر" ہی کے شمارہ نومبر و دسمبر سنہ ۱۹۶۱ء میں شایع ہوا ہے۔

غلام محمد میر راجپوری ریاست میں کئی حیثیتوں سے کام کرتے رہے۔ وہ وزیر بھی رہے اور کچھ عرصہ قانون ساز اسمبلی کے سپیکر کی خدمات بھی انجام دیں۔ ترقی پسند تحریک سے وہ متاثر ہیں ریاست کی سیاست میں نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ جس زمانے میں وہ وزیر صحت و سیاحت تھے۔ انہوں نے اپنے محکمہ کے تعلق سے ایک مضمون "بیماریوں اور ان سے محفوظ رہنے کے وسایل" پر مضمون لکھا تھا۔ اس کے علاوہ وہ وقتاً فوقتاً سیاسی یا عام دلچسپی کے موضوعات پر لکھتے رہے ہیں۔ "سیاحت کے نئے امکانات" پر بھی ان کا ایک مضمون سنہ ۱۹۵۹ء میں لکھا تھا جس میں جوانوں میں مہم پسندی کے جذبات کو ابھارنے کی کوشش کی ہے۔ لکھتے ہیں۔

"نوجوانوں کے ارمانوں سے بھرے ہوئے دل ہمیشہ سے اپنے آس پاس کی دنیا سے متعلق زیادہ سے زیادہ واقفیت حاصل کرنے کے عزائم سے بھرپور رہتے آئے ہیں۔ اپنے شوق تمنا کی سیرابی کے لئے وہ کٹھن سے کٹھن راہوں کا سفر طے کرنے کے لئے کمربستہ ہیں تاکہ اسرار فطرت کے عمیق ترین گوشوں تک ان کی رسائی ہو جائے اور کونین کے پوشیدہ راز ان کی تشنہ نگاہوں پر آشکار ہو جائیں۔"

سری پرتاپ کالج کے انگریزی کے پروفیسر اور کشمیری کے شاعر غلام نبی فراق، انہیں لکھنے والوں میں سے ہیں، جن کی ابتدائی تربیت اردو کی روایات میں ہوئی۔ ابتدائی دور میں شاید وہ اردو میں شعر بھی کہتے تھے۔ اب بھی جب وہ زیادہ تر کشمیری میں لکھتے ہیں۔ اپنی دلچسپی کے موضوعات، ادب شاعری، تنقید وغیرہ پر وہ لکھتے ہیں۔ انگریزی ادب کے پس منظر کی وجہ سے انہیں اردو کے لکھنے والوں کی پرکھ میں بڑی مدد ملتی ہے۔ فراق کا ایک اچھا مضمون، اپنے ہم تخلص اردو کے سربلند شاعر اور انگریزی کے استاد فراق گورکھپوری پر ان کی "روح کائینات" کے جاننے کے سلسلے میں "فراق روح کائینات میں" کے عنوان سے کالج کے رسالے "پرتاپ" (شمارہ سنہ ۱۹۵۰ء) میں شایع ہوا تھا۔ جس میں فراق کی شاعری کا مطالعہ وہ اس انداز سے کرتے ہیں:

"آپ کے کلام میں وجدانی تمنا کو یقینی نسب کا عکس ملتا ہے۔ حقیقت کا منظر غالب

ہے۔ آپ کی شاعری پر مغربی ادب کا بھی گہرا اثر ہے یہی وجہ ہے کہ آپ کی شاعری میں دوسرے شاعروں کے بہ نسبت اچھوتاپن زیادہ پایا جاتا ہے۔

کلچرل اکادمی کے موجودہ سیکرٹری نیلامبر دیو شرما بھی انگریزی ادب کے استاد رہے۔ وہ جموں کے ایک ممتاز ڈوگرہ خاندان سے ہیں۔ ولادت ۱۹۳۱ء میں ہوئی اور جموں ہی میں تعلیم پائی۔ ایم۔ اے کی تعلیم کے لئے وہ دہلی گئے اور دہلی یونیورسٹی سے انگریزی میں ایم۔ اے کامیاب کیا اس کے بعد وہ انگریزی ادب کی مزید تربیت کے لئے لیڈز گئے، جہاں ۱۹۵۴ء سے ۱۹۵۶ء تک قیام کیا اور انگریزی ادب میں بی۔ اے آنرز کر کے جموں لوٹے۔ جموں آتے ہی انہیں قدیم پرنس آف ویلز کالج اور حال سائنس کالج میں انگریزی کے استاد کی خدمت مل گئی اور ۱۹۶۱ء تک وہ یہ خدمت انجام دیتے رہے۔ ۱۹۶۱ء میں پہلے وہ کلچرل اکادمی کے اسسٹنٹ سیکرٹری مقرر ہوئے۔ اس کے دو سال بعد ڈپٹی سیکرٹری ہوئے اور ۱۹۶۶ء میں پروفیسر جیالال کول کے اکادمی کی مقتدری کی خدمت سے سبکدوش ہونے کے بعد شرما سیکرٹری مقرر ہو گئے۔

ڈوگری زبان، ادب اور ڈوگرہ آرٹ سے شرما کو خاص دلچسپی ہے چنانچہ انگریزی میں انہوں نے ڈوگری لوک ادب اور پہاڑی آرٹ پر کتاب تصنیف کی ہے۔ اس کے علاوہ وہ مدھوکر جی کے تعاون سے ڈوگری لوک گیت بھی تین جلدوں میں مرتب کئے ہیں۔ یہ تینوں جلدیں چھپ چکی ہیں۔ ۶۴-۱۹۶۳ء میں اکادمی کا جو وفد اتر پردیش اور بہار گیا تھا، اس کا ایک رپورتاژ انہوں نے قلمبند کیا ہے۔ شرما کا ایک اہم کارنامہ "جدید ڈوگری ادب کا ارتقا" ہے۔ اصل کتاب انگریزی میں لکھی گئی تھی اور اس کا ترجمہ ٹھاکر پونچھی نے کیا ہے۔ یہ کتاب ریاستی کلچرل اکادمی نے ۱۹۶۷ء میں شایع کیا ہے۔

شریمتی سرجیت مہندر سنگھ، سردار مہندر سنگھ کی اہلیہ، جموں کے زنانہ کالج میں پنجابی کی استاد ہیں۔ وہ پنجابی میں لکھتی ہیں۔ اردو میں بھی انہوں نے کچھ مضمون لکھے ہیں۔ ایک نہایت موضوع "ریاست میں پنجابی کا ارتقا" پران کا مطالعہ "شیرازہ" (شمارہ مارچ ۱۹۶۲ء) میں شایع ہوا تھا۔ اس مضمون میں انہوں

۱۔ پروفیسر شرما اب ملازمت کی زنجیریں توڑ چکے ہیں۔

نے پنجابی اور ہندی کے باہمی تعلق، اور پنجابی اور ڈوگری اور پنجابی اور پوٹھوہاری کے رشتوں پر روشنی ڈالی ہے۔ یہ مضمون اس لئے اہم ہے کہ اس پر سیر حاصل تحقیق ابھی تک نہیں ہو پائی ہے۔ پروفیسر سیوا سنگھ جن کا تذکرہ آگے آرہا ہے، اب اس موضوع پر کام کر رہے ہیں۔ شریمتی سرجیت پنجابی اور پوٹھوہاری کے باہمی رابطہ پر بحث کرتی ہوئی لکھتی ہیں:

> "پوٹھوہاری، راولپنڈی، جہلم اور ریاست جموں وکشمیر کے اضلاع میرپور اور پونچھ کے علاقوں کی بولی ہے۔ اس علاقے کا سمبندھ شمال کی جانب سے کشمیری کے ساتھ مشرق کی جانب سے ڈوگری کے ساتھ اور پچھم کی جانب لہندی بھاشا سے ہے۔ پوٹھوہاری اور لہندی دونوں پنجابی ہی کا روپ ہیں۔ ان کو علیحدہ علیحدہ سمجھنا ٹھیک نہیں۔"

شریمتی راج دلاری، سرینگر کے ایک پنڈت خاندان سے ہیں اور خاص طور پر پنڈت سماج کی اصلاح سے انہیں دلچسپی ہے۔ وہ سماجی کارکن اور ویمنز کانفرنس سرینگر صدر بھی ہیں۔ ان کے کچھ مضامین اور بیانات "پیام انقلاب" (۵۸-۱۹۵۷ء) میں شائع ہوئے ہیں۔ ایک مضمون جو اس اخبار کے شمارہ ۱۵ اگست ۱۹۵۷ء کے لئے لکھا ہے اس میں خواتین سے اپیل کی ہے کہ وہ ایسے مُبے رسومات ترک کردیں جن سے نقصان ہوتا ہے۔ لکھتی ہیں۔

> "ہمارے رسومات بد میں آئے دن اضافہ ہوتا جارہا ہے۔ رسومات بد سے مجموعی طور پر قوم کی اقتصادی حالت پر بُرا اثر پڑتا ہے اور قومی بجائے ترقی کے منزل کی طرف جارہی ہے۔"

بنسی لال گپتا ڈوگری ادب کے اچھے طالب علم ہیں اور ان کا مطالعہ وسیع اور عمیق ہے۔ اس موضوع پر مضامین لکھے ہیں۔ ایک مضمون "ڈوگری ادب۔ دور جدید میں" کے عنوان سے "شیرازہ" (شمارہ مئی ۱۹۶۳ء) میں شائع کیا ہے اور اس پر زور دیا ہے کہ ڈوگری کا تقریباً سارے کا سارا ادب موجودہ دور کی پیداوار ہے۔ تاہم ڈوگر علاقے میں ادبی ذوق کے قدیم آثار کی بھی نشاندہی کی ہے۔

کماری چونی کول، سرینگر کے ایک پنڈت خاندان کی چشم وچراغ ہیں۔ ان کے مضمون اور ترجمے اردو میں شائع ہوئے ہیں۔ جان اسٹیوارٹ مل کی مشہور کتاب "دی سبجیکشن آف ویمنز" کے ایک حصے کا بہت صاف ستھرا ترجمہ "تشکیل" (مارچ ۱۹۴۹ء) کے حصہ خواتین کے لئے کیا تھا جس کا اقتباس ذیل میں درج ہے۔

"جو عورتیں اپنی ازدواجی

کہ وہ اپنے محدود دائرے سے باہر نکل کر کچھ نہ کرنے پائیں۔ انسان کی راحت بہت کچھ اس میں مضمر ہے کہ اس کے مذاق کے مطابق مشغلہ اختیار کرنے کا موقع حاصل ہو۔ یہی سبب ہے کہ دنیا کے بہت سے لوگ جو اپنی مرضی کا مشغلہ اختیار کرنے نہیں پاتے، وہ ہمیشہ پریشان اور تباہ حال رہتے ہیں۔"

عبدالقادر دیوان، شوپیان کے بڑے ہونہار نوجوانوں میں سے تھے جن کا ذوق ادب اور تحریر بھی شائستہ تھا۔ کوئی تین سال پہلے، وہ بجلی گرنے سے فوت ہو گئے۔ شمیم احمد شمیم اور "آئینہ" کے ساتھ انہیں گہرا تعلق تھا اور وہ اس ہفتہ وار کے لئے لکھتے بھی تھے۔ ان کا ایک اچھا جائزہ "آئینہ کا ایک سال" اس اخبار کے سالنامے ۱۹۶۵ء میں شائع ہوا ہے۔ اس جائزہ میں مرحوم نے بڑی وقت نظری کے ساتھ مختلف اشاعتوں کے حوالے سے اخبار کے مقصد، اس کی پالیسی اور اس کی سیاسی اور سماجی خدمات کی تفصیل مدون کی ہے۔ نیشنل کانفرنس کے احیاء کی کوشش اور اس سلسلے میں "آئینہ" کے ردعمل کا ذکر کرتے ہوئے وہ نیشنل کانفرنس کے بارے میں لکھتے ہیں

"نیشنل کانفرنس، جس کے پرچم تلے عوام نے آزادی حاصل کی تھی، لیکن جس کے نام پر بعد میں حکمرانوں نے ان سے ایک ایک قطرۂ خون کا حساب لیا تھا۔ ۱۹۶۴ء وسط میں جب اس کانفرنس کی گلی سڑی لاش کو پھر عوام پر سوار کرنے کی کوشش کی جا رہی تھی،

"آئینہ" نے لکھا تھا............"

سعیدہ خانم، وادی کی خواتین اہل قلم میں، اس صدی کے پانچویں دہے میں نمایاں تھیں۔ وہ "وکیل" کے حصہ خواتین کے لئے لکھتی تھیں۔ سعیدہ خانم اردو اور فارسی میں اچھی دستگاہ رکھتی ہیں۔ ادیب فاضل اور منشی فاضل کے امتحانات انہوں نے کامیاب کئے ہیں اور ان کے سوچنے کے انداز کی سنجیدگی سے ان کی ذہنی تربیت پر روشنی پڑتی ہے۔ انہوں نے اپنی بہنوں کو نئے حالات کے مطابق ڈھالنے کی اپیل اپنے ایک مضمون میں کی ہے جو "خواتین کشمیر سے" کے عنوان سے شائع ہوا ہے۔ لکھتی ہیں۔

"دنیا روز بروز ترقی کی طرف گامزن ہو رہی ہے۔ فطرت کے رازہائے سربستہ روز بروز آشکارا ہو رہے ہیں۔ پرانے خیالات کی جگہ نئے خیالات لے رہے ہیں اور نئے خیالات میں بھی

ترمیم و تنسیخ ہوتی رہتی ہے۔ لیکن واحسرتا کہ میرے مادرِ وطن کشمیر کی خواتین ان حالات سے بالکل متاثر نہیں ہوتیں۔"

نذیرہ غازی ایک اور خاتون اہل قلم اچھی صلاحیتوں کی مالک ہیں۔ وہ بارہمولہ کے لڑکیوں کے پرائمری سکول میں معلمہ ہیں اور محکمہ تعلیمات اور اساتذہ کے ہفتہ وار "ہمارا استاد" میں کبھی کبھی لکھتی رہیں۔ ان کا ایک مضمون "عورت اور تمدن" کے عنوان سے ۱۵ جون ۱۹۶۷ء کے شمارہ میں شایع ہوا تھا جس میں دنیا کی تہذیب اور سماجی ترقی میں عورت کا جو حصہ رہا۔ اس پر روشنی ڈالی ہے۔ اس میں دنیا کی کچھ مشہور خواتین کا تذکرہ بھی کیا ہے۔ اس کے بعد وہ رقمطراز ہوتی ہیں۔

"عورت جب اپنے حقیقی نسائی جوہروں سے آراستہ ہو کر میدان میں آتی ہے اور اسے موقع ملا تو اس نے وہ کچھ کیا ہے جس پر تہذیب و انسانیت قرنہا قرن تک فخر و ناز کرتی رہے گی۔"

عبدالاحد رفیق اس وقت اسلام آباد کے سرکاری کالج میں اردو کے لیکچرار ہیں۔ اس سے پہلے وہ مختلف کالجوں میں اردو یا فارسی کے لیکچرار رہے۔ رفیق نے کشمیر یونیورسٹی سے اردو اور فارسی دونوں میں ایم۔ اے کا امتحان پاس کیا ہے۔ اردو میں وہ لکھتے بھی رہے ہیں۔ کچھ نصابی کتابیں ترتیب دی ہیں۔ مضمون نگاری سے بھی انہیں دلچسپی ہے۔ ان کے موضوعات فارسی ادب اور تاریخ کشمیر ہیں۔ ان کا ایک تعارفی مضمون مرزا داراب جویا کے بارے میں اکادمی کے ترجمان "شیرازہ" (ستمبر ۱۹۶۲ء) میں شایع ہوا تھا۔

گوری شنکر جموں کے رہنے والے ہیں۔ ڈوگر دیس اور ڈوگری ادب سے انہیں دلچسپی ہے اور کچھ مضامین ان موضوعات پر لکھتے رہے ہیں۔ "دت کوی" پر ان کا ایک تفصیلی مضمون "شیرازہ" (مارچ ۱۹۶۲ء) میں شایع ہوا ہے۔ "دت کوی" رنجیت سنگھ کے ولی عہد برج راج دیو سے متوسل تھا۔ یہ زمانہ اٹھارویں صدی کے ربع آخر کا ہے۔ برج دیو کی فرمایش پر دت کوی نے "دردن پرو" کا ترجمہ ہندی میں کیا تھا۔ (۱۷۶۶ء)۔ دت کوی کی شاعرانہ مہارت پر روشنی ڈالتے ہوئے گوری شنکر لکھتے ہیں:

"میدانِ جنگ کی منظر کشی شاعر نے کچھ ایسے ڈھنگ سے کی ہے کہ ایسا محسوس ہوتا ہے

کہ جیسے شاعر خود اس وقت میدان جنگ میں ہو۔ ہو سکتا ہے کہ شاعر دت چارن کویوں کی طرح برج راج دیو کے ساتھ میدان جنگ میں جایا کرتا ہو۔ "برج پنچاسیکا" کی مثال اور بھی واضح ہے۔

گوری شنکر اپنی اردو عبارتوں میں ہندی کے شبد بیں الفاظ بڑی خوبی سے بٹھاتے ہیں۔

ریسرچ لائبریری کے محمد امین رفیقی تاریخ کے اچھے متعلم ہیں۔ ان کے مطالعے کے نتائج خاص طور پر تاریخ کشمیر کے بارے میں رسالوں میں شایع ہوئے ہیں۔ ملا اشرف بلبل، سیف الدین تارہ بلی، یعقوب شاہ چک، سید مبارک خاں بیہقی اور ایسے کئی موضوعات پر ان کے مضامین کشمیر کی سیاسی اور ادبی تاریخ کے بارے میں مفید اور تحقیقی معلومات کے حامل ہیں۔ ملا اشرف کشمیر کے مشہور عالم اور شاعر ہوئے ہیں، سیف الدین تارہ بلی کشمیری کے ابتدائی دور کے شعرا میں ہوئے ہیں۔ سید مبارک خاں بیہقی سر برآوردہ عالم تھے، بیہقی خاندان حضرت سید علی ہمدانی کے ساتھ کشمیر آیا تھا اور خاص طور پر سید مبارک خان بیہقی نے کشمیر علم و فضل کی بڑی خدمات انجام دی تھیں۔ رفیقی نے اس مختصر سے مضمون میں بیہقی کے حالات اور ان کے علمی کارناموں کا جایزہ لیا ہے۔

محمد الدین فوق نے کشمیر کی تاریخ کو اردو میں منضبط کرنے کی جو وسیع اور بلیغ کوششیں کی تھیں۔ ان کی تفصیل گذر چکی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اہل کشمیر میں نئی بیداری پھیلانے میں بھی ان کی مساعی یادگار رہیں گی۔ فوق کے بارے میں ایک بسیط اور سیر حاصل مضمون علی محمد خان نے "شیرازہ" کے شمارہ نومبر ۱۹۶۲ء میں شایع کیا ہے۔ مضمون میں فوق کی زندگی اور ان کے کارناموں پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔

پشکر بھان کا ذکر کسی اور سلسلے میں گذر چکا ہے۔ یہاں صرف ان کے ایک قابل ذکر مضمون کا تذکرہ ضروری ہے، جو انہوں نے کشمیری شاعری میں طنز و مزاح کے بارے میں لکھا تھا۔ اس مضمون سے کشمیری کے ایک خاص پہلو پر بڑی مفید روشنی پڑتی ہے۔

ڈوگری ادب کو اردو کے ذریعے وسیع تر حلقوں میں روشناس کرانے کی جو مساعی جموں کے اہل قلم کر رہے ہیں ان میں نار اسمیل پوری اور پروفیسر بال کرشن شرما بھی شامل ہیں۔ شرما کا ایک مضمون "ڈوگری لوک شاعری" کے بارے میں شایع ہوا ہے، اور نار اسمیل پوری نے "ڈوگری کہاوتیں" کے عنوان سے ایک مضمون "شیرازہ" کے شمارہ جنوری ۱۹۶۳ء میں شایع کیا تھا۔ مضمون میں انہوں نے کہاوتوں کی اہمیت اور وضاحت

پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ کہاوتوں کی اہمیت ان صداقتوں پر مبنی ہوتی ہے۔ جو کائیناتی ہوتی ہیں اور جب یہ ایجاز کے ساتھ الفاظ میں بندھ جاتی ہیں تو پھر وہ امر بن جاتی ہیں۔ تارا سمپل پوری کہاوتوں کی اس اہمیت کو واضح کرتے ہوئے یہ بات بھی واضح کی ہے کہ ہر زبان کا مزاج مخصوص ہوتا ہے اور ڈوگری کے مخصوص مزاج نے کہاوتوں میں ایک انفرادیت پیدا کردی ہے۔

تارا سمپل پوری ڈوگری کے مصنف بھی ہیں۔ ان کی کئی کتابیں شایع ہو چکی ہیں۔ ان کا اہم کارنامہ ان کی تصنیف "محاورہ کوش" ہے۔ جس میں انہوں نے بڑی تلاش اور جستجو سے ڈوگری کے کوئی سات ہزار محاورے اکٹھا کئے ہیں۔ ان کی یہ لغت یا کوش ریاست کی کلچرل اکادمی کی جانب سے شایع ہو گئی ہے۔

کہاوتوں اور محاوروں کو روشناس کرانے کی مساعی میں سوم ناتھ سادھو کا مضمون "کشمیری کہاوتیں اور محاورے" بھی قابل ذکر ہے جو رسالہ "تعمیر" کے شمارہ نومبر دسمبر ۱۹۷۱ء میں شایع ہوا ہے۔

فدا محمد حسنین محکمہ ریسرچ اور اشاعت اور آرکائیوز کے نائب ناظم تاریخ کے متعلم ہیں اور آرکائیوز کی تربیت بھی حاصل کی ہے۔ جس زمانے میں وہ سری پرتاپ کالج کے استاد تھے، علم و ادب کے میدان آتے تھے۔ وہ افسانے لکھتے اور شعر بھی کہتے تھے۔ چنانچہ ان کا ایک افسانہ "پندرہ روپئے" کے عنوان سے کالج کے رسالے "پرتاپ" میں شایع ہوا تھا۔ انکی لکھی ہوئی ایک نظم بھی ۱۹۵۰ء کے "پرتاپ" میں چھپی تھی جس کا عنوان تھا "سب تو مجھے ہی سہنا ہے"۔ اس نظم کے دو شعر ہیں۔

دنیا کے ستم بھی رنج و محن بھی سب تو مجھی کو سہنا ہے   یارب یہ جفائے چرخ کہن بھی سب تو مجھی کو سہنا ہے
موت کے سائے خون کے بادل زنجیریں اور شمشیریں   عشق کی راہ میں ناوک چشم بھی سب تو مجھی کو سہنا ہے

افسانے سے ان کی طبیعت میں پوشیدہ مزاح کے عنصر کی بھی نشاندہی ہوتی ہے۔ مثلاً اس اقتباس سے:

"جیب میں پیسے نہ ہوں تو بقول شخصے انسان کو گدھے کا بھی سالا بننا پڑتا ہے۔ ارے صاحب یہ تو معمولی بات ہے گدھے کو باپ بھی کہنا پڑتا ہے پیسے کیلئے انسان کیا کچھ نہیں کرتا۔

آپ سمجھ دار ہیں میں کیا بتاؤں ......"

ان کا یہ شوق اب بھی کبھی کبھی ابھرتا ہے۔ چنانچہ ۱۹۶۷ء میں جب جموں اور کشمیر یونیورسٹی کی سرپرستی اور پوسٹ گریجویٹ شعبہ اردو کے اہتمام کل ہند اساتذہ اردو جامعات ہند کی سالانہ کانفرنس کا اجلاس سرینگر میں منعقد ہوا تھا اس کی کارروائیوں کے بارے میں ایک رپورتاژ لکھ کر فدا محمد حسنین نے اخباروں میں شایع کیا تھا۔

لیکن ۱۹۵۳ء کے لگ بھگ آرکائیوز لینے محفوظات سے ان وابستگی اور دلبستگی کے بعد سے ادبی میدان میں ان کے واضح کم ہو گئے ہیں اور وہ زیادہ تر تاریخی اور محفوظات کے موضوعات پر رسالوں کے لئے مضمون لکھنے پر اکتفا کرتے ہیں۔ جنوری ۱۹۵۳ء کے شمارہ "گلریز" میں انہوں نے محفوظات کے بارے میں ایک حاوی مضمون لکھ کر شایع کیا تھا، جس میں اس کے مختلف شعبوں کی تفصیل اور ان کے کام کی نوعیت اور اہمیت واضح کی ہے۔

مصوری اور خاص طور پر ڈوگرہ مصوری کے بارے میں ماسٹر سمسار چند بڈھو کے مضامین جو مختلف رسالوں میں شایع ہوتے رہے ہیں اس دور کے مضامین کے سرمایہ میں ایک انفرادیت رکھتے ہیں۔ بڈھو خود مصور ہیں۔ اور اس فن کی تعلیم و تربیت بھی دیتے ہیں۔ "ڈوگرہ پہاڑی مصوری" کے موضوع پر ان کا جو مضمون "شیرازہ" کے شمارہ مارچ ۱۹۶۲ء میں شایع ہوا تھا اس میں بڈھو نے ڈوگری پہاڑی مصوری کے آغاز اور اس کی خصوصیات پر روشنی ڈالی ہے۔ ڈوگرہ پہاڑی مصوری کا جایزہ لیتے ہوئے جو ابتدا میں شوالک سلسلہ کوہ کے تعلق "شوالک مصوری" کے نام سے موسوم کی جاتی تھی بڈھو لکھتے ہیں۔

"پہاڑی ڈوگرہ کلاکاروں کو رنگ پر پورا عبور حاصل تھا۔ رنگ کے تناسب اور گوناگوں آمیزش تصویروں کو روشن بناتی ہیں۔ ایسا جان پڑتا ہے کہ رنگ کی ایک دوسرے کے ساتھ قربت اور ان کے باہمی تاثرات ان پر عیاں تھے۔ گلیر قلم کے رنگ روشن ہونے کے علاوہ کانگڑہ کے قلم سے زیادہ ملائم ہیں۔ اس سکول نے رنگ کے اندر جاذبیت کو خوب سمجھا تھا۔ کہیں اطمینان بخش آرام دہ فضا ہے اور کہیں وہ کھل کھلا کر ہنس رہے ہیں......؟"

جدید رنگ کاری اور مصوری کے ادب کا بہت زیادہ سرمایہ اردو میں نہیں ہے۔ تاہم ایک صاحب فن

اصطلاحوں اور اظہار کی دقتوں پر جس طرح قابو پا سکتا ہے اور اپنے خیالات کو واضح کرنے میں کامیاب ہو سکتا

ہے۔ اس کی اچھی مثال بڈھو کا یہ مضمون اور ان کے دوسرے مضامین ہیں جو اسی طرح کے فنی اور اصطلاحی موضوعات پر لکھے گئے ہیں۔

فنی نادرات اور ان کے تحفظ پر بھی ان کا ایک اہم مضمون "شیرازہ" کے شمارہ جنوری ۱۹۷۵ء میں شایع ہوا تھا۔ بڈھو کی دلچسپی ظاہر ہے کہ ڈوگرہ دیس اور اس کے فن کے بارے میں زیادہ گہری اور حاوی ہے۔ اس مضمون میں انہوں نے ڈوگرہ فن کے جو باقیات الصالحات ہیں، ان کی حفاظت کا مناسب انتظام کرنے کی طرف حکومت اور اہل فن کی توجہ منعطف کرائی ہے۔

سنسکرت زبان، ادب اور کلاسیکی موضوعات پر لکھنے والوں میں اننت رام شاستری گنگا دت شاستری اور ولنو دُنے ریاست میں سنسکرت سے متعلق مضامین لکھے ہیں۔ اننت رام شاستری جموں کے سنسکرت علما میں نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ ریاست میں سنسکرت ادب کا ارتقا، ان کا عالمانہ اور محققانہ مضمون، "شیرازہ" کے شمارہ مارچ ۱۹۶۲ء میں شایع ہوا۔ اس مضمون میں مہاراجہ رنبیر سنگھ کے عہد میں سنسکرت علوم اور ان کی ریاست کی زبانوں، اردو اور ڈوگری میں اشاعت کے لیے جو کوششیں ہوتی تھیں۔ ان کی تفصیل لکھی ہے۔ ذخیروں کو اکٹھا کرنے کی کوششوں کا ذکر کرتے ہوئے شاستری لکھتے ہیں:

"شاردا رسم خط میں لکھا ہوا کشمیری ادب بھی کافی تعداد میں خرید کر یہاں رکھا گیا لیکن کشمیر سے باہر کے اکثر عالم اس رسم خط سے ناواقف تھے۔ اس لیے مسودے اکٹھا کرنے میں دیوناگری رسم خط ہی کو ترجیح دی گئی۔ کتب خانوں کو زیادہ سے زیادہ بڑھانے کی غرض سے شاردا رسم خط میں لکھے ہوئے گرنتھ بھی جمع کیے گئے۔"

گنگا دت شاستری کا ایک مضمون "ابھینو گپت اور ان کا ادب" اس سلسلہ مضامین میں خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ اسی مضمون میں کشمیر میں سنسکرت ادب کے عروج کی تفصیل بھی درج کی ہے۔ سنسکرت ادب میں کشمیری علما کے کام کی تفصیل بیان کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

"سنسکرت ادب کو بنانے اور سنوارنے میں کشمیر نے سب سے زیادہ حصہ ادا کیا۔ یہاں کے ایک ایک عالم کا لوہا آج تک ساری دنیا مان رہی ہے۔ ایسے ہی یہاں آچاریہ مٹ سرسوتی کے

اوتار مانے جاتے ہیں اور کھشیمندر برہسپتی کے اوتار، ملہن، بدھ، کلہن، شنکر آچاریہ اور ابھینو گپت ششش ناگ کے اوتار مانے جاتے ہیں۔"

دلنو د کے مضامین میں کشمیر کے ایک اور سنسکرت کے عالم آچاریہ اودھ بھٹ کے حالات اور کارنامے اور قدیم سنسکرت کا کشمیری شاعر ۔بلہن" بڑی اچھی کوششیں ہیں۔

ایک مختلف نوعیت کے مضامین لکھنے والے ترلوک کول ہیں۔ یہ صاحب فن ہیں اور ایک موقع پر انہیں اپنے فن کے تعارف کی ضرورت پیش آتی ہے۔ اس سلسلے میں وہ لکھتے ہیں:

"اپنی شخصیت اور فن کے بارے میں کچھ کہتے ہوئے مجھے ایک عجیب و غریب الجھن کا شکار ہونا پڑ رہا ہے۔ اپنے شعور اور غور و فکر، خارجی حالات، اور داخلی جذبات اور احساسات کے بارے میں اپنے نقطہ نظر کو واضح کرنے کی خاطر۔ مجھے بار بار صفائی پیش کرتے ہوئے بڑی کش مکش سے گذرنا پڑتا ہے۔"

نظری اور عملی سیاست سے متعلق، قاضی غلام محی الدین، دوار کا ناتھ جلالی، پنڈت پران ناتھ در اور سیف الدین قاری کے کچھ مضامین بھی ذکر کے قابل ہیں، جن سے سیاست کے بارے میں ریاست کے مختلف طبقوں کے تصورات پر تھوڑی بہت روشنی پڑتی ہے۔ جلالی نے ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے ایک شہید منگل پانڈے کے بارے میں ایک اچھا مضمون لکھ کر ۱۹۵۷ء کے "پیام انقلاب" میں جنگ آزادی کی سو سالہ یاد تازہ کی ہے۔ میرٹھ کے اس جانباز سپاہی نے اپنے افسر کو قتل کرنے کی کوشش کی تھی جس میں وہ ناکام رہا تھا، اس پاداش میں اسے پھانسی کی سزا دی گئی تھی۔ جلالی نے دہلی کے ہفتہ وار "تھاٹ" کے ایک مضمون کا ترجمہ "کشمیر میں نئے ہتھکنڈوں کا استعمال" کے عنوان سے اسی اخبار میں شایع کیا تھا۔ قاضی غلام محی الدین نے سوشلسٹ تحریک کے بارے میں اور ایک مضمون بہادر شاہ ظفر کے بارے میں لکھا گیا ہے۔ سوشلسٹ تحریک کے بارے میں انہوں نے لکھا ہے کہ اس کے باوجود "یوں تو یہ بڑھتی ہوئی انسانی تہذیب ہی سے شروع ہوتی ہے، خاص طور پر یہ تحریک صنعتی دور سے شروع ہوتی ہے جب کہ اس دور میں بہت سے اقتصادی مسایل پیدا ہوئے۔" پران ناتھ در کے مضمون "آزادی کی جنگ اور کمیونسٹ" میں آزادی کی جد و جہد میں کمیونسٹوں کے نامساعد رویے کی تفصیل بیان ہوئی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"کمیونسٹ کانگریس سے الگ ہو گئے۔ کمیونسٹ زیادہ تر روسی مفاد کے قایل تھے۔اس لئے قومی مفاد کو ٹھکرانا ان کا کام بن گیا۔"

سیف الدین فاری عملی سیاست میں ہیں، اور سیاسی مسایل کے لئے وہ فلسفیانہ بنیادیں تلاش کرتے ہوئے اپنے ایک مضمون "نظام زندگی جس کی بیسویں صدی کو تلاش ہے" میں زندگی کے مختلف نظام جیسے سوشلزم، کمیونزم، سیکولرزم سب کا جایزہ لیتے ہوئے اس نتیجے پر پہنچتے ہیں:

"صرف ایک محمد عربی ہے، جس مقدس ہستی کے ساتھ ایک۔ الیسا نظریہ ہے، جو دنیا کے امن و مسرت کا باعث ہو سکتا ہے۔ اس نظریے کی حقانیت اور فطری صلاحیت کے پیش نظر مفکر، جارج برنارڈ شا ایک اور دفعہ کہہ اٹھتا ہے کہ ایک صدی کے اندر ساری دنیا کا مذہب اسلام ہو گا۔"

غلام مصطفے انصاری، تنہا انصاری کے چھوٹے بھائی، نشاط تخلص کرتے ہیں، کشمیری اور کبھی کبھی اردو میں شعر بھی کہتے ہیں۔ ایک سکول میں استاد ہیں۔ ان کے مضامین بھی شایع ہوئے ہیں۔ ان میں "دورِ سلاطین کشمیر اور موسیقی" اور "رحیم سوپوری" قابل ذکر ہیں۔

تنہا انصاری کے بارے میں رشید نازکی کا ایک مضمون شایع ہوا تھا۔ جس میں تنہا کی زندگی اور ان کی شاعری کا تفصیلی جائزہ لیا ہے۔ رشید نازکی، مشہور شاعر غلام رسول نازکی کے چچیرے بھائی ہیں، یہ ایک سکول میں مدرس ہیں اور کشمیری ادب سے دلچسپی رکھتے ہیں۔ نازکی خاندان کا اصلی وطن بانڈی پورہ ہے۔ رشید نازکی اچھی تنقیدی صلاحیتوں کے مالک ہیں۔ تنہا کے ادبی مقام کے بارے میں لکھتے ہیں:[1]

"تنہا وادی کشمیر کے ان سخن سنجانِ چمن سے ہیں، جن کی بزرگی، عظمت، دلآویزی اور ادبی روایات یہاں کے ادبی حلقوں کے لئے سند کا اعتبار رکھتے ہیں۔ وہ ایک طرف مہجور اور آزاد کی نغمہ بار فضاؤں میں بھی زمزمہ سنج تھے اور دوسری طرف شہزور، میر غلام رسول نازکی، بلبل کاشمیری، طاؤس پانپوری اور دوسرے بزرگان حلقہ ادب کے یاران میکدہ سے بھی بے تکلف طور پر ربط ہیں۔ ان کی شاعری ابتداءً ۱۹۳۰ء سے ہوئی، جب وہ شعور کے بجائے جذبہ سے مجبور ہو کر سخن سنج ہوا کرتے تھے۔"

[1] پروفیسر رشید نازکی اب کشمیر یونیورسٹی شعبہ کشمیری میں لیکچرر ہیں۔

آگے تنہا کی شاعری کے عہد بہ عہد ارتقا پر روشنی ڈالی ہے۔

کشمیری ادب اور شاعری سے بڑا لگاؤ رکھنے والوں میں اوتار کشن نام رہبر اور مظفر عازم اردو میں مضامین لکھ کر بھی کشمیری ادب کی خدمت انجام دے رہے ہیں۔ رہبر (ولادت ۱۹۳۳ء) اردو کے بھی اچھے طالب علم ہیں۔ انہوں نے جموں و کشمیر کے یونیورسٹی سے اردو ایم۔ اے کا امتحان کامیاب کیا ہے اور کچھ عرصہ وہ برن ہال ہائر سیکنڈری سکول سرینگر میں اردو کے استاد بھی رہ چکے ہیں۔ کوئی تین چار پہلے وہ ریڈیو کشمیر سرینگر کی ملازمت میں منسلک ہوئے اور سکرپٹ نویس کی خدمت پر مامور ہیں۔ کشمیری ادب کی تاریخ پر وہ کشمیری زبان میں ایک کتاب کے مصنف بھی ہیں۔ اس کے علاوہ کشمیری نثر کے نمونوں پر بھی ایک کتاب لکھی ہے۔

رہبر کے کئی اچھے تعارفی مضامین اور جائزے رسالوں میں شایع ہو چکے ہیں۔ ان میں سے اہم "مہانئے پرکاش" "بڈشاہی عہد اور کشمیری ادب" ہیں۔ "مہانئے پرکاش" کشمیری کا قدیم ترین کارنامہ مانا گیا ہے۔ رہبر نے اس کتاب اور اس کے مصنف کے بارے میں کھوج کر کے دونوں کے بارے میں تفصیلات اکٹھی کی ہیں۔ مضمون کا ایک اقتباس ہے:

"شتی کنٹھ نے مہانئے پرکاش قدیم سنسکرت طرز پر لکھی ہے۔ کتاب کو آسانی کے ساتھ دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ (۱) منترا (نظم یا اصلی شعر کا حصہ) (۲) برہمنا (کمینٹری یا تشریح کا حصہ) کمینٹری کی زبان سنسکرت ہے لیکن یہ زبان جدید سنسکرت سے بہت مختلف ہے۔ شتی کنٹھ کی زبان نہایت ہی خشک اور بے مزہ ہے۔ بیان میں متروک شدہ الفاظ کی بہتات ہے تاہم منتروں کی زبان سمجھنے میں یہ کمینٹری کافی مدد دیتی ہے۔"

مظفر عازم نے کچھ مضامین لکھے ہیں اور یہ شایع بھی ہوئے ہیں۔ مثلاً "کشمیر کا تمدنی وفد" ایک طرح سے رپورتاژ ہے، جس دسمبر ۱۹۵۹ء میں کشمیر کے فنکاروں کا جو وفد عالمی زراعتی میلے میں حصہ لینے گیا تھا، اس کی سرگرمیوں کی تفصیل لکھی ہے۔ یہ مضمون "تعمیر" کے شمارہ جنوری فروری ۱۹۶۰ء میں شایع ہوا ہے۔

موتی لال کپور، پونچھ کی مردم خیز سرزمین کی دلچسپ شخصیتوں میں سے ہیں۔ بچپن میں انہیں پونچھ کی قدآور شخصیت اور خود موتی لعل کے نانا میر باغ و بہار شخصیات کی محبتوں سے مستفید ہونے کا موقع نصیب ہوا تھا، جوان

کے والد دیا نند کپور کے دوست تھے اور اکثر کپور کے گھر آتے تھے۔ موتی لعل نے ادیب فاضل اور بی۔ اے کے امتحانات کامیاب کئے ہیں۔ علم و ادب کا چسکا انہیں بچپن ہی سے اپنے گھر کی صحبتوں میں لگ چکا تھا۔ وہ مضامین، ڈراما، کہانی ہر موضوع پر یکساں سہولت سے طبع آزمائی کر سکتے ہیں۔ ۱۹۴۷ء میں انہوں نے اپنے والد کے اخبار "پربھات" کی ادارت سنبھالی کچھ عرصے کے بعد جب حکومت کے حکم سے اخبار بند ہو گیا تو موتی لعل نے ٹائمز آف انڈیا کی نامہ نگاری اختیار کی۔ آخر کار سرکاری ملازمت سے منسلک ہو گئے اور اس وقت پونچھ میں ضلع انفارمیشن افسر کی خدمت انجام دے رہے ہیں۔

موتی لعل کا گھرانا پونچھ میں اپنی ادبی روایات کے لئے شہرت رکھتا ہے۔ چراغ حسن حسرت کے دیا نند کپور سے مراسم کی بھی مشترک بنیاد تھی۔ موتی لعل نے لکھا ہے کہ حسرت ان کے والد کے نہ صرف دوست، بلکہ بھائی تھے۔ دونوں میں علمی اور ادبی صحبتیں رہا کرتیں اور ان صحبتوں میں ان کے "تم بزرگوار" بھی شریک رہتے تھے۔ موتی لعل حسرت سے اتنے متاثر ہیں کہ ان کے دل سے ان کی صحبتوں کی یاد کبھی نہیں جاتی۔ اسی یاد کو باقی رکھنے کے لئے وہ حسرت کی شاعری اور ان کی انشا پردازی پر کام کر رہے ہیں۔

موتی لال کپور کو گوجری زبان اور ادب سے بھی دلچسپی ہے، چنانچہ انہوں نے اپنے علاقے کے گوجروں کی آبادی کے طول و عرض میں گھوم گھوم کر لوک گیتوں کا کافی سرمایہ فراہم کر لیا ہے اور اسے شایع کرنا چاہتے ہیں۔ مکتوب نگاری کا بھی ان کا اپنا ایک خاص انداز ہے۔ چنانچہ خط میں لکھتے ہیں :

"آج کل گوجری لوک گیتوں پر ایک کتاب شایع کرنے کی سنک سنوار ہے۔ امید ہے کہ اس سود و زیاں کی دنیا میں کچھ کامیابی حاصل کر سکوں۔ ورنہ کبھی اپنی گمنامی کا گلہ رہا اور نہ شہرت کا شوق۔ مادی وسایل دے سکیں تو کتاب شایع کرالی ورنہ لکھ لکھ کر اپنے زعم میں اپنے ادبی خزینے کو قابل قفل بنانے کی سعی ہے تاکہ مرنے کے بعد کچھ تو اثاثہ لواحقین کے ہاتھ آئے۔"

چراغ حسن حسرت سے جو تاثرات انہیں ملے، ان کی طرف خط میں اس طرح اشارہ کیا ہے :

"آپ نے چراغ حسن حسرت کا تذکرہ کیا ہے اب آپ کو کیا بتاؤں کہ اس باغ و بہار شخصیت کے کتنے پہلو تھے۔ وہ جامع علم و فن تھے حالانکہ میری طرح گھسٹ گھسٹ کر ادیب فاضل اور

بی۔ اے کیا تھا۔

موتی لعل، مضمون نگار ہیں، کہانی لکھتے ہیں اور کچھ ڈرامے بھی تصنیف کئے ہیں۔

کنول بالی، مولانا آزاد میموریل کالج میں اردو کے پروفیسر ہیں۔ علی گڑھ یونیورسٹی سے اردو میں ایم، اے کیا ہے، اور اب ڈاکٹریٹ کے لئے مقالہ بھی لکھ رہے ہیں۔ بہ حیثیت لیکچرار کے بالی نے سری پرتاپ کالج اور کئی کالجوں میں بھی خدمت انجام دی ہے۔ جس زمانے میں وہ سری پرتاپ کالج میں لیکچرار تھے۔ "پرتاپ" میں مختلف موضوعات پر لکھتے تھے۔ دسمبر ۱۹۶۱ء کے شمارہ میں ان کا ایک اچھا مطالعہ آزاد نظم کے موضوع پر شایع ہوا تھا، جس میں نظم کی اس صنف کے محرکات کے بارے میں لکھتے ہیں:

"جب نئی نسل کے شاعر نئے موضوعات، مفہوم، معنی اور مقصد لے کر سامنے آتے ہیں، ایک نیا شاعرانہ شعور تکمیل پاتا ہے، شاعری کا ایک نیا ہیولیٰ تیار ہوتا ہے، نئے مواد کے بعض عناصر ذرایع اظہار میں اور زیادہ وسعت اور پہنائی چاہتے ہیں، ہیئت کی مروجہ شکلوں میں مزید تبدیلی اور اضافہ کا تقاضا کرتے ہیں۔ اب سانیٹ اور پابند نظم کی ہیرا پھیری بھی ناکافی ثابت ہوتی ہے۔ اسالیب بیان اور شاعرانہ تمثیلات کے پہلے سانچے بعض نئے موضوعات پر پورے نہیں اترتے، قافیہ اور ردیف کا التزام ہی نہیں، مساوی وزن کی روایت بھی بعض نئے مقاصد اور تقاضوں کا ساتھ نہیں دے پاتی۔۔۔۔"

اس موضوع سے تعلق رکھنے والے ایک موضوع "نظم معرّیٰ کی تحریک اردو میں" کے بارے میں اسی رسالے میں (۱۹۶۰ء) میں شائع ہوا ہے، جس میں بالی نے اس تحریک کے بانی، شرر، پھر محمد اسمٰعیل میرٹھی اور نظم طباطبائی کی کوششوں کا جائزہ بڑی جانکاری کے ساتھ لیا ہے۔

بالی شعر بھی کہتے ہیں۔ ان کی نظمیں اور گیت رسالوں میں شایع ہوئے ہیں۔ ایک طویل آزاد نظم "خلش" کے عنوان سے شایع ہوئی تھی، جس کا اقتباس ذیل میں درج ہے۔

روح بیتاب تھی

روح بیتاب ہے

کل نہ جانے ــــــ

مگر ــــــ آدمی کی نظر

علم اور گیان، وجدان کی برق رفتاریوں سے

اس زمین، آسمان، لامکان میں جہاں تک گئی

ایک عالم ــــــ مضطرب اور بے خواب ہے

مانو سیماب ہے

موجِ سیلاب ہے

پیچ وگرداب ہے۔

بالی نے ٹیگور کی نظموں کے ترجمے بھی کیے ہیں۔ ان کے ایک گیت کا اقتباس ہے:

رات کتنی جا چکی ہے

نیند آنکھوں میں نہیں

آس پل پل ٹوٹتی ہے

دل کی دھڑکن ڈوبتی ہے

یہ خموشی یہ اندھیرا

جانے کب ہوگا سویرا

رادھے کشن برارو سنگیت، ڈراما اور ناچ سے گہرا شغف رکھتے ہیں اور ان موضوعات پر ان کے کچھ مضامین بھی شائع ہوئے ہیں۔ برارو نے ان فنون کی تربیت دہلی کے سکول آف ڈراما میں تین برس رہ کر پائی ہے۔ ملازمت ریاست کے محکمہ انفارمیشن میں کچھ عرصہ مددگار کلچرل افسر کی حیثیت سے انجام دی، اب مرکزی حکومت ہند کی وزارت نشر واشاعت میں مددگار ڈائریکٹر کی خدمت پر در بھنگہ گئے ہیں۔ کشمیر کے لوک ناچ، جیسے رؤف، چھکری، ہکٹ، بچہ نغمہ وغیرہ کے بارے میں ان کا ایک معلومات سے پُر مضمون "تعمیر" کے شمارہ جنوری وفروری ۱۹۶۳ء میں شائع ہوا ہے۔

عبدالسلام ثریا جبین ناہید (گواشہ شیخو پورہ کشمیر) کے مضامین بھی رسالوں میں شایع ہوئے ہیں۔ عبدالسلام کا مضمون 'کشمیر کے مشہور صوفی شاعر اور پیر طریقت مرزا اکمل الدین بدخشی کے بارے میں'

کاشی ناتھ در ہندی کے عالم ہیں اور سری پرتاپ کالج میں ہندی کے لیکچرار کی خدمت انجام دے رہے ہیں۔ اپنی دلچسپی کے موضوعات پر وہ اردو میں بھی لکھتے ہیں۔ کالی داس کی ڈرامانگاری پر ان کا ایک اچھا مضمون ۱۹۵۸ء میں کالی داس جینتی کے موقع پر ریڈیو کشمیر، سرینگر سے نشر ہوا تھا، جو بعد میں ان کے کالج کے رسالے "پرتاپ" میں بھی شایع ہوا۔ مضمون میں سنسکرت فن تنقید کے شعبوں کی تفصیل پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"سنسکرت فن تنقید کے اعتبار سے ادب کو دو شعبوں میں تقسیم کیا گیا ہے، ایک وہ جو سنا جائے دوسرا وہ جو دیکھا جائے۔ سنسکرت ڈراما یا ناٹک دوسرے شعبے سے تعلق رکھتا ہے۔"

مضمون میں کالی داس کے تینوں شاہکاروں پر روشنی ڈالتے ہوئے ان کی انفرادی خصوصیات کا تجزیہ وہ اس طرح کرتے ہیں۔

"مالویکا (مالویکا گنی متزا) میں کالی داس کے بچپن کی شوخی اور چلبلا پن، وکرم اروشی میں جوانی کی چہک اور رنگینیاں اور شکنتلا میں بڑھاپے کے تجربے اور متانت کے درشن ہوتے ہیں۔"

ساگر چند مہاجن کی اردو نگارش کی خوبی کا اندازہ ان کے ایک مضمون سے ہوتا ہے، جو انہوں نے بڑے دلچسپ انداز میں شمیم احمد شمیم ایڈیٹر 'آئینہ' کے بارے میں لکھا ہے۔ یہ مدح فی الذّم کی دلچسپ مثال ہے۔ اس کی تمہید یہ ہے کہ شمیم اپنے سالنامے کے لئے ان سے مضمون چاہتے تھے، مہاجن نے مزاحاً کہا کہ مضمون لکھونگا اور اس میں تمہاری قلعی کھول کر رکھ دونگا۔ شمیم نے یہ شرط مان لی، لیکن ساتھ ہی یہ بھی فرمایش کی کہ جہاں مضمون میں میری برائیوں کا تذکرہ کرو، وہاں میری خوبیوں کا تذکرہ بھی نہ بھولنا۔ مہاجن نے اپنی اور ان کی دونوں کی بات رکھ لی۔ عنوان بھی دلچسپ ہے "بے حد شمیم کرونا" لکھتے ہیں، "میں نے قطعی فیصلہ دیتے ہوئے کہا۔ تم میں کوئی خوبی نظر نہیں آتی۔ شمیم حیران رہ گیا۔ کہنے لگا میری قسم کھاؤ کہ مجھ میں کوئی خوبی نہیں۔ میں نے کہا نہیں تم میں جہاں ہزار برائیاں ہیں، وہاں ایک خوبی بھی ہے۔ شمیم اچھل پڑا۔ کندھے پر زور سے ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ "کیا ہے وہ، میرے یار" میں نے دھیرے سے جواب دیا۔ تم میں صرف یہی ایک خوبی ہے کہ تم شمیم ہو اور بے حد شمیم ہو۔"

موتی لال ساقی کشمیری کے اچھے شعرا میں سے ہیں، ماہ نورہ بڈگام ان کا وطن ہے تعلیم کی تکمیل کے بعد ریڈیو کشمیر سرینگر کی ملازمت سے منسلک ہوگئے کشمیری میں ان کی ایک تالیف "کاشر وہنہ وُن" قدر کی نگاہوں سے دیکھی جاتی ہے۔ اس میں عروسی یا شادی بیاہ کے موقع پر گائے جانے والے گیتوں کو اکٹھا کر دیا ہے۔ اردو میں بھی انہوں نے بہت لکھا ہے اور بہت سے موضوعات پر مضامین تنقیدی جائزے اور تبصرے اور یہ زیادہ تر "خدمت" کی اتوارہ اشاعت میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ ان کے خاص خاص مضامین کے عنوان ہیں۔

"تارا چند بسمل" "صمد میر" "مصطفےٰ شاہ بخاری" "کشمیری زبان اور ادب" عبدالاحد آزاد، مہجور اور ان کی شاعری، کشمیری شاعری پر جاگیرداری کا اثر کشمیری ادب اور تنقید، کشمیری زبان کا رسم خط۔ ہماری کلاسیکی موسیقی اور اس کا مستقبل وغیرہ۔ ع۱

"خدمت" میں وہ باضابطہ نئی کتابوں خاص طور پر کشمیری تصانیف کا تعارف، لکھتے رہتے ہیں۔ چند کتابیں ہیں۔ شہل شبنم، شنکر اچاریہ (مترجمہ وشنو پربھاکر) جھلکاری (شنکر۔ گوداوری (دیوراج دنیش زولانہ (مظفر عازم) پشکر بھان، جن کا ذکر گذر چکا ہے۔ ساقی کے دوستوں میں سے ہیں۔ ان کے بارے میں ساقی نے "خدمت" (سنہ ۱۹۶۷ء) کے ایک شمارہ میں بڑا عمدہ تعارف لکھا تھا۔ اس کا عنوان ہے۔ "پشکر بھان۔ ایک مطالعہ" اس مضمون میں پشکر بھان کے حالات، ان کی شخصیت اور کشمیری ادب میں ان کی خدمات کا حاوی جائزہ لیا ہے۔ اس کے ابتدائی حصے کا اقتباس ہے۔

"پشکر بھان۔ نام نہیں نغمہ ہے
فرد نہیں انجمن ہے
فن شناس ہی نہیں فنکار ہے

"پشکر کے اور میرے درمیان جو تعلقات ہیں وہ بھی اتنے گہرے نہیں ہیں کہ انہیں دوستی کا نام دیا جائے۔ بلکہ یہ تعلقات ابھی تک شناسائی اور دوستی کی سرحد کے درمیان ایک موڑ پر کھڑے ہیں۔ میں نہیں جانتا کہ کیا کبھی یہ تعلقات دوستی کا روپ دھار بھی لیں گے۔ مگر

ع۱ ساقی اب کلچرل اکادمی میں ہیں اور ان کا ادبی تر اُردو کے علاوہ کشمیری میں بھی بہت بڑھ گیا ہے

باھر کے :۔

ترلوکی ناتھ کنڈن اصل میں پنجاب کے متوطن ہیں لیکن کشمیر میں زندگی کا بڑا حصہ بسر ہوا۔ یہیں سری پرتاپ کالج میں تعلیم پائی۔ یہ غلام علی بلبل اور طاؤس بانپوری کے معاصرین میں سے ہیں۔ طالب علمی کے زمانے ہی سے ادب سے دلچسپی رہی شعر بھی کہتے ہیں چنانچہ ان کا کلام "پرتاپ" میں چھپتا رہا ہے۔ کئی مضامین بھی لکھے ہیں۔ ان کا سب سے اچھا مضمون شاید وہ ہے جو انہوں نے ماسٹر زندہ کول ثابت کے بارے میں لکھا تھا مضمون میں ثابت کے حالات زندگی، ان کی ملازمت، ان کے سماجی کام شاعری اور دوسری علمی اور ادبی دلچسپیوں کی تفصیل بڑے عمدہ پیرایہ میں لکھی ہے۔ یہ مضمون "کونگ پوش" کے شمارہ جون ۱۹۵۹ء میں شایع ہوا ہے۔

اس اقتباس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ ساقی ایک اچھے ادبی اسلوب پر قدرت رکھتے ہیں۔ ان کا ایک عام ادبی دلچسپی کا مضمون "تخلیق اور تقلید" کے عنوان سے شایع ہوا ہے۔ جس میں اس مسئلے کی گہری نظر سے چھان بین کی ہے۔ ان کی رائے ہے کہ بعض وقت تخلیق اور تقلید کے درمیان حد فاصل کھینچنا مشکل ہو جاتا ہے۔ جو عناصر ادبی روایت کے طور پر کسی مصنف کے حصے میں آتے ہیں انہیں ساقی تقلید نہیں کہتے، لیکن دوسروں کے خیالات کو دہرانا یقیناً تقلید کی ذیل میں آجاتا ہے۔

ساقی چند اور تصانیف کے بھی مصنف ہیں۔

کشمیر میں سیکولرازم، جو نو کیشور بھلی کیشنز سرینگر سے شایع ہوا ہے۔

جدید تاریخ کشمیر، جدید شعرائے کشمیر اور کشمیری محاورات کے اردو متبادل زیر ترتیب ہیں۔

وطن سے باھر :۔

جموں و کشمیر کے تاجر، صناع، فنکار، ادیب اور شاعر وطن سے باہر جاتے رہے ہیں اور اکثر اپنی خداداد صلاحیتوں کی داد وطن سے زیادہ غریب الوطنی میں پاتے رہے ہیں لیکن اس کا اندازہ لگانا مشکل ہے کہ ۱۹۴۷ء کے سیلاب نے اس سمندر سے کتنے گوہر آب دار ساحل کے پرے پھینک دیئے۔ ان میں سے جن قدر دان ماحول مل گیا چمکے اور اب بھی ضوفشاں ہیں ... دونوں

جموں کے متوطن تھے، شہاب کا ایک سماجی مرتبہ بھی تھا اُن کے والد وزیر وزارت رہے تھے، جو موجودہ زمانے کی گورنری یا صوبہ داری کے مترادف تھا۔ اپنی تخلیقات کے لئے انہوں نے یہاں بھی عزت اور شہرت کمائی تھی، اب اور زیادہ شہرت پاکستان میں حاصل کر رہے ہیں۔

تصنیف و تالیف :۔

یہ دور ادبی افسانہ اور علمی تجویزوں کی حد تک ہر جگہ "مختصر نگاری" کا نمایندہ ہے۔ تخیلی تخلیقات کے لئے افسانہ سب سے زیادہ سہولت بخش ثابت ہوا ہے اور کسی حد تک ایکانکی ڈراما۔ علمی اور ادبی افکار کے لئے بہت سے اہل قلم مضمون اور انشائیے سے اپنی ضرورت پورا کر لیتے ہیں۔ پھر ہمارے عہد کے پڑھنے والوں کیلئے فالتو وقت نہیں۔ ایسے ماحول میں طویل اور بسیط علمی اور ادبی تجویزیں بنا کر مہینوں بلکہ برسوں، ایک ہی دھن میں لگے رہنے کے لئے بہت کم ہیں جو ہوش رکھتے ہیں۔ اس کے باوجود ہمارے عہد میں بھی ایسے ذی ہوش صاحبان فکر و نظر بالکل مفقود نہیں، جو مخصوص تجاویز کو لے کر تصنیف یا تالیف مشغول ہیں، اور اسی تجویز کی تکمیل میں زندگی کا دوام سمجھتے ہیں۔

ریاست جموں و کشمیر میں بھی ایسے اہل قلم بڑی تعداد میں نہیں ہیں، جن کو تصنیف و تالیف سے گہرا لگاؤ ہے، لیکن جتنے بھی مصنّف اور مؤلف موجود ہیں، ان میں سے اکثروں کی تخلیقات اپنے اپنے شعبے میں اہمیت رکھتی ہیں۔ اس اہم مقصد سے توجہ کے ہٹنے کا یہ سبب نہیں ہے کہ ہمارے لکھنے والوں میں اب اس کا زیادہ ذوق نہیں رہا۔ بلکہ اس کا فطری سبب علاقہ داری زبانوں میں لکھنے کی تحریک ہے جسے حکومت کی سرپرستی بھی حاصل ہے۔

تصنیف و تالیف کے میدان میں اس وقت جو علماء اور اہل قلم ہیں، ان میں پروفیسر محی الدین حاجنی بڑی متنوع دلچسپیوں کے حامل ہیں۔ وہ عربی کے پروفیسر ہیں۔ کشمیری تحریک کے علمبردار اور اردو اور کشمیری، دونوں میں یکساں سہولت کے ساتھ قلم سنبھال سکتے ہیں۔ صحافت سے بھی انہیں لگاؤ رہا ہے۔ کبھی درپردہ اور کبھی بے پردہ۔

پروفیسر حاجنی اردو، عربی، کشمیری اور انگریزی میں کئی کتابوں کے مصنف ہیں اور متنوع موضوعات

پر ان کے مقالے اور مضامین بھی شایع ہوتے رہتے ہیں۔ وہ اس وقت سری پرتاپ کالج سرینگر میں عربی کے پروفیسر ہیں، اور کئی علمی اور ادبی اداروں اور تحریکوں سے وابستہ رہے ہیں۔ ان کا وطن حاجن ہے جہاں کے ایک مشہور رزمیہ نگار کشمیری شاعر وہاب پرے کے بارے میں انہوں نے ایک کتاب مرتب کی ہے۔ حاجن میں ان کی ولادت ۱۹۱۷ئہ میں ہوئی تعلیم اور تربیت کے ابتدائی اور ثانوی مراحل سرینگر میں طے کئے عربی میں بی۔ اے آنرز اور ایم۔ اے کے امتحانات علی گڑھ یونیورسٹی سے امتیاز کے ساتھ کامیاب کئے اس کے علاوہ صحافت کا ڈپلوما بھی حاصل کیا۔

زمانہ طالب علمی سے وہ اپنی ذہانت کی وجہ سے ممتاز رہے اس کے ساتھ اپنی آزادہ روطبیعت کی وجہ سے وہ تحکم اور ناانصافی کے خلاف وہ ہمیشہ بغاوت پر کمربستہ رہے اور کئی دفعہ حراست میں بھی رکھے گئے۔

اردو میں پروفیسر حاجنی کی اہم تصنیف فردوسی کشمیر وہاب پرے پر ایک کتابچہ ہے جس میں اس عظیم کشمیری شاعر کے حالات زندگی اور منتخب کلام پیش کیا گیا ہے۔ یہ کتاب ریاستی کلچرل اکادمی کے سلسلہ منتخب کشمیری منظومات میں ۱۹۵۹ئہ میں شایع ہوا۔ کتاب دو حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلے حصے میں "تعارف" کے عنوان سے شاعر کے حالات زندگی نہایت تحقیق سے جمع کر کے قلمبند کئے ہیں دوسرا حصہ نمونہ کلام پر مشتمل ہے۔ حصہ "تعارف" میں وہاب کی فکر کے محرکات اور موثرات کا جائزہ لیتے ہوئے وہ رقمطراز ہیں:۔

"انیسویں صدی کے جابرانہ نظام حکومت اور کشمیریوں کی عام مفلوک الحالی نے اول تو ہر کشمیری شاعر کے ایک حسرت آفریں ماحول تیار کر رکھا تھا۔ دوئم وہاب نے اپنی زندگانی میں متعدد بار، قحط، وبا، طاعون اور سیلاب سے ہزاروں کشمیریوں کو لقمہ اجل بنتے دیکھا تھا۔ اس حوصلہ شکن اور روح فرسا مشاہدہ پر عجمی تصوف اور ایرانی ادبیات بالخصوص شاہنامہ کے مسلسل مطالعے نے وہاب کو کشاں کشاں حزن پسندی کا شیدائی بنا ڈالا۔ یہاں تک کہ ان کے ذہن پر قنوطیت، خاص کر موت کے تصور نے ایسا گہرا اثر ڈالا کہ ان کی شاعرانہ زندگی کے عین شباب پر ان کا منظر فطرت کو اپنی ذاتی واردات میں حزن و غم کی کرشمہ کاری

کے سوا اس وقت بھی کوئی ٹھوس مقصد نظر نہ آیا جب کہ خود وہاب کے لئے امیرانہ زندگی کے قریب قریب سب وسایل حاصل تھے۔"

رسالہ "پرتاپ" کے کشمیری حصے کو وہ ۱۹۴۹ء سے لے کر ۱۹۶۲ء تک مرتب کرتے رہے۔ اس کے علاوہ جیسا کہ رسایل کی تفصیلات میں بتایا گیا ہے "گلریز" کو بھی وہی مرتب کرتے تھے۔ ۱۹۵۷ء سے لے کر ۱۹۶۰ء تک کئی سیمنار مباحث میں وہ حصہ لیتے رہے۔ "کشمیری شاعری" کے نام سے کشمیری کے شعرا کا ایک مجموعہ بھی انہوں نے مرتب کیا ہے۔ وہاب پرے کے دیوان کی تدوین اور ترتیب کا کام بھی مکمل کر لیا ہے جو جلد شایع ہو رہا ہے۔

پروفیسر حاجنی کشمیری کے موجودہ سربرآوردہ علماء میں شمار ہوتے ہیں اور اس زبان میں بھی انہوں نے کئی کتابیں مرتب اور شایع کی ہیں۔ کشمیری نثر پر ان کی تصنیف "کاشِر نثرِچ کتاب" اس موضوع پر لکھی ہوئی مقتدر کتاب ہے جو ۱۹۶۱ء میں شایع ہوئی۔ "مقالات" ان کی ایک اور اہم تالیف ہے۔ ایک اور اہم کارنامہ "ٹمگرس" ۱۹۷۰ء میں مرتب ہوا۔ اس کے علاوہ کشمیری میں انہوں نے "الف لیلہ" کا ترجمہ بھی کیا ہے اور مسدس حالی کو بھی اس زبان میں منتقل کیا ہے۔ انگریزی میں بھی پروفیسر حاجنی نے کئی مضامین مختلف علمی اور ادبی موضوعات پر لکھے ہیں۔

پروفیسر حاجنی اچھے مضمون نگار اور انشائیہ نگار بھی ہیں۔ "کتاب الطواسین" پر ان کے مسلسل مقالات "گلریز" میں شایع ہوتے رہے۔ یہ اہم کارنامہ تصوف کے نازک مباحث پر مشتمل ہے۔ پروفیسر حاجنی جس انداز سے بعض مسایل پر روشنی ڈالتے ہیں اس سے ان کے تبحر کا اندازہ ہوسکتا ہے۔ ان کی یہ بحث خاص طور پر قابل مطالعہ ہے:

"غیر مادی نور جس کی وضاحت منصور حلاج کا مسلک رہا ہے شعوری کیفیات سے عبارت ہے۔ عام مفہوم میں اس کا ظہور اس وجدان سے شروع ہوتا ہے جہاں مادی نور کی بلند ترین خصوصیت یعنی اخبار اولین ما حصل ہے۔ یعنے ؎

وادیٔ عشق بسے دور و دراز است ولے — طے شود جادۂ صد سالہ بہ آہے گاہے

عربی زبان میں علی العموم کسی روشنی کو نور اور ذاتی روشنی کو ضیا کہا جاتا ہے لیکن نمود کرنے

پر معلوم ہوگا کہ چراغ کی روشنی میں نور اور ضیا دونوں کا امکان ہے۔"

پروفیسر حاجنی اردو میں بے شمار مقالات اور مضامین کے مصنف ہیں اور جیسا کہ اوپر اشارہ کیا گیا ہے وہ اچھے انشائیہ نگار اور کسی حد تک مزاح نگار بھی ہیں۔ ان کے مزاحیہ انشائیوں میں سے ایک "بیوقوفی" کے عنوان سے رسالہ "پرتاپ" کے شمارہ دسمبر ۱۹۵۳ء میں شایع ہوا تھا۔ اس مضمون میں "وقوف" کے لفظ کی وضاحت کرتے ہوئے منطقی یقین آفرینی کے ساتھ وہ عقل و دانائی کی باتیں نیم مزاحیہ انداز میں بڑی خوبی سے کہہ جاتے ہیں۔ لفظ "وقوف" کے اشتقاق کی وضاحت کرنے کے بعد ان کا استدلال ہوتا ہے:

"چنانچہ "وقوف" کو "سکون" کا مترادف مان کر لغوی معنوں کی رو سے ہم متحرک چیز کو بے وقوف کہہ سکتے ہیں۔ اس دلیل کے پیش نظر مادی موجودات میں سے سوائے جمادات کے کوئی چیز باوقوف نہیں بلکہ حالیہ جوہری تحقیقات کی بنا پر جمادات بھی داخلی حرکت سے بے نیاز نہ ہونے کے سبب "بے وقوف" ہی کہلائی جائیں گی۔"

ان کا ایک اور دلچسپ مضمون "غلط فہمی" کے عنوان سے اسی رسالہ کے شمارہ دسمبر ۱۹۵۵ء میں شایع ہوا تھا۔ اس مضمون میں بھی ان کا انداز بڑی سنجیدہ مزاح کا ہے۔ مثلاً وہ بحث کرتے ہیں:

"سطحی ملاحظہ پر یہ ظاہر ہے کہ "غلط فہمی" دو لفظوں سے مرکب ہے "غلط" اور "فہمی" لیکن آپ غلط کس واقعہ کو قرار دیں گے اور فہم کا کونسا مطلق اندازہ استعمال کر کے کہہ سکیں گے کہ سوچنے اور سمجھنے کا یہ معیار صحیح ہے اور باقی ذرایع نادرست اور بفرض محال آپ صحتِ معیار پر قادر ہوں گے بھی تو بھی یہ انفرادی فیصلہ ہوگا اجتماعی نہیں کیونکہ آپ کے وسایل شعور میں آپ کی شخصیت سب سے زیادہ کارفرما ہے جس کا ذاتی تقاضا یہ ہے کہ وہ باقی شخصیتوں سے ممتاز اور منفرد ہو۔۔۔۔"

پروفیسر حاجنی کئی علمی اور ادبی اداروں کے سرگرم رکن ہیں، یونیورسٹی اور کلچرل اکاڈمی اور ساہتیہ اکاڈمی کی اعلیٰ مجالس کی رکنیت سے بھی وہ سرفراز ہیں۔

ڈاکٹر اکبر حیدری امر سنگھ کالج میں اردو کے پروفیسر ہیں، ادب کے پچھلے آٹھ دس برسوں سے اردو زبان اور

ادب کی سنجیدہ خدمت انجام دے رہے ہیں۔ حیدری کی ولادت سرینگر ہی میں ۱۹۲۹ء میں ہوئی تعلیم بھی یہیں حاصل کی۔ اور اردو میں اور فارسی میں ایم۔ اے کے امتحانات کامیاب کئے ہیں۔ علوم مشرقیہ کے امتحانات ادیب فاضل، ادیب کامل اور منشی فاضل پاس ہیں۔ لکھنو سے شادی بیاہ کا رشتہ قایم کیا ہے اور وہیں کی یونیورسٹی سے "میر انیس بہ حیثیت رزمیہ شاعر" کے موضوع پر مقالہ پیش کر کے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی ہے۔ اس وقت بھی طالب علم اور تحقیق کا ذوق بدستور باقی ہے۔ چنانچہ لکھنو یونیورسٹی سے ڈی۔ لٹ ڈگری حاصل کرنے کے لئے میر انیس سے پہلے مرثیہ کے ارتقاء پر تحقیق میں لگے ہوئے ہیں۔

ڈاکٹر حیدری کا مقالہ چھپ چکا ہے۔ اس کے علاوہ وہ حسب ذیل کتابوں کے مصنف یا مولف ہیں۔

(۱) مطالعہ ڈاکٹر زور۔ جو ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور بانی ادارہ ادبیات اردو کی زندگی کے مختصر حالات اور ان کی تصانیف کی تفصیل پر مشتمل ہے۔ ڈاکٹر زور جامعہ عثمانیہ میں چادر گھاٹ کالج کی صدارت سے سبکدوش ہونے کے بعد جموں و کشمیر یونیورسٹی میں پوسٹ گرائویٹ شعبہ اردو کی صدارت کے تقریباً دو سال تک فرائض انجام دیتے رہے ہیں۔ اس زمانے میں ڈاکٹر اکبر حیدری سے وہ متعارف ہوئے تھے اور دونوں میں اچھے مراسم بھی تھے، ڈاکٹر حیدری ڈاکٹر زور سے بے حد متاثر ہیں، اور اسی تاثر کا نتیجہ یہ مختصر مگر مفید رسالہ ہے۔

(۲) تحقیق و انتقاد۔ ان کے دس مقالات کا مجموعہ ہے، جس کے عنوانات سے ڈاکٹر حیدری کی دلچسپوں کا پتہ چل سکتا ہے (۱) میر ضمیر کی دو مثنویاں (۲) اردو ادب میں طنز و مزاح (۳) سرشار اور اودھ پنچ (۴) میر انیس کے مرثیے (۵) اردو لغت نگاری اور فرہنگ اثر (۶) شعور اور تنقیدی شعور پر ایک نظر (۷) تنقیدی شعور ایک تبصرہ (۸) باغ و بہار اور فسانہ عجائب (۹) غالب کی ہمہ گیر شخصیت اور (۱۰) اثر صہبائی۔

(۳) تحقیقی جائزے۔ یہ بھی ان کے تحقیقی مقالات کا مجموعہ ہے۔

(۴) میر ضمیر۔ ایک تحقیقی مقالہ۔ یہ میر ضمیر کی زندگی اور ان کی تخلیقات کا جائزہ ہے۔ ڈاکٹر حیدری کو راجہ صاحب محمود آباد کے نادر کتب خانے تک رسائی کے مواقع حاصل ہوئے ہیں، اسی کے نتیجے کے طور پر انہوں نے وہاں کے ذخیرہ سے بعض نوادرات سے استفادہ کیا ہے۔ انہیں میں میر ضمیر کی دو مثنویاں بھی ہیں۔

ڈاکٹر حیدری ایک ناول "فطرت" کے بھی مصنف ہیں، جو بڑی حد تک خود ان کی آپ بیتی ہے۔ اس میں کشمیر اور کشمیر کی سماجی زندگی کے نقوش بھی مل جاتے ہیں۔ لیکن ان کا اہم کام دراصل ان کے وہ تحقیقی کارنامے ہیں جن سے اردو دنیا کی معلومات میں کچھ نہ کچھ اضافہ ہوتا ہے۔ اب انہوں نے وقت نظر بھی پیدا کر لی ہے اور صواب اور ناصواب، اور اہم سطحی کے درمیان وہ بخوبی امتیاز کرتے ہیں۔ اس کا اندازہ خاص طور پر ان کے تحقیقی مقالوں سے ہو سکتا ہے۔

پروفیسر سیوا سنگھ، سری پرتاپ کالج کے پنجابی کے پروفیسر کئی طرح کی دلچسپیوں کے حامل ہیں۔ پنجابی زبان اور ادب کے وہ بالغ نظر متعلم ہیں، موسیقی سے انہیں علمی اور عملی لگاؤ ہے، اور پنجابی اور اردو دونوں زبانوں میں اپنے تحقیقی کام مرتب کر رہے ہیں۔ بارہمولہ ان کا وطن ہے، لیکن ملازمت کے سلسلے میں عرصہ سے سرینگر میں مقیم ہیں، اور یہاں کی علمی اور ادبی دلچسپیوں میں برابر کے حصہ دار ہیں۔ پروفیسر سنگھ اس وقت پنجابی زبان اور ادب پر تحقیقی کام میں مصروف ہیں، اور اس کام کو ڈاکٹریٹ کے لئے مقالے کے طور پر پیش کرنا چاہتے ہیں۔

پروفیسر سنگھ کے حالات، پس منظر کے پنجابی حصے میں گزر چکے ہیں۔ ان کی دلچسپی کا خاص موضوع زبان ہے، اور وہ ریاست میں نشو ونما پاتی ہوئی پنجابی زبان اور اس کا ادب ہے۔ ریاست کے مختلف علاقوں کی پنجابی بولیوں اور کشمیر کی پہاڑی زبان بھی ان کی تحقیقی دائرہ میں شامل ہے۔ پہاڑی زبان کے محاورات اور کہاوتیں انہوں نے اکٹھی کی ہیں اور ریاست کی پہاڑی میں پنجابی لوک گیت کی کھوج لگا رہے ہیں۔ ان موضوعات پر ان کے کئی مضامین ریاست کے رسالوں میں شایع ہوئے۔ ان مضامین سے چند کو جمع کر کے پروفیسر سیوا سنگھ نے ایک مربوط مجموعے کی شکل میں اپنی لقب "ریاست کشمیر میں پنجابی زبان اور ادب" کے نام سے ۱۹۶۸ء میں شایع کی ہے۔ کتاب کے مشتملات ہیں۔ (۱) ریاست جموں وکشمیر میں پنجابی لوک گیت (۲) کشمیر میں پنجابی محاورات اور کہاوتیں (۳) پرمانند کی شاعری پر گوربانی اور پنجابی زبان کا اثر (۴) کشمیری زبان میں قصہ سوہنی مہینوال اور (۵) ریاست جموں وکشمیر میں پنجابی زبان۔ یہ سارے تحقیقی مضامین ہیں۔ گریرسن کی بعض آراء سے بحث کرتے ہوئے پروفیسر لکھتے ہیں:

"لفظ 'جانا' کا حوالہ دیکر فعل کی بناوٹ کو ہندی اور اردو میں ایک جیسا بنایا ہے۔ واضح ہو کہ 'گھنان'
لفظ ویدک سنسکرت کے لفظ 'گچھ' سے بنا ہے جس کے معنی ہیں جانا اور یہ لفظ ہو بہو شکل میں
ہندی پنجابی کی ایک شاخ پوٹھوہاری میں استعمال ہوتا ہے۔ یہ لفظ کشمیری میں "گھس" اور
"گھسُن" میں تبدیل ہو جاتا ہے۔"

ڈاکٹر شمس الدین احمد کشمیر یونیورسٹی کے پوسٹ گریجویٹ شعبۂ فارسی کے صدر رہیں'۔ اردو میں کچھ مضامین
ایک ڈراما اور ایک رسالہ کشمیری شاعر شمس فقیر کے حالات اور کلام کے انتخاب پر مشتمل شائع ہو چکا ہے۔
ڈاکٹر شمس الدین کا سلسلہ دارشکوہ کے پیر طریقت ملا شاہ بدخشی کے بھائی تک پہنچتا ہے۔ علی گڑھ یونیورسٹی
سے انہوں نے فارسی میں ایم۔ اے کیا اور ریاست کے ایک کالج میں فارسی کے لیکچرار مقرر ہو گئے'۔ اس کے
بعد سنہ ۱۹۶۲ء میں' جموں و کشمیر یونیورسٹی کے شعبہ فارسی کی لکچراری کے لئے ان کا انتخاب ہوا'۔ سنہ ۱۹۶۳ء میں وہ حکومت
ایران کے وظیفہ پر طہران گئے اور کشمیر کے ایک فارسی شاعر محمد رضا مشتاق کے حالات اور کلام پر مقالہ لکھ
کر ڈاکٹریٹ حاصل کی۔ کشمیر لوٹنے کے بعد انہیں ریڈر اور شعبہ کے عہدہ پر ترقی ملی۔ ڈاکٹر شمس الدین کے کچھ
مضامین اور رسالوں میں شائع ہوئے ہیں۔ جس زمانے میں وہ سری پرتاپ کالج میں لیکچرار تھے' ایک
ڈراما "غنی کاشمیری" کے عنوان سے لکھا تھا' جو ایک اچھی تخلیق ہے۔ اس ڈرامے کے تین کردار ہیں: رومی،
اقبال اور غنی۔ رومی اور اقبال مضامین محو پرواز ہیں۔ ایسے میں غنی کا یہ شعر متوالی رندانہ لے میں سنائی
دیتا ہے۔"

جمع کردم مشت خاشاکے کہ سوزم خویش را   گل گماں دارد کہ بندم آشیاں در گلستاں

اس صدا پر اقبال حیران ہو کر رومی سے پوچھتے ہیں:

"پیر و مرشد' ہم انتہائی بلندیوں کی طرف پرواز کر رہے ہیں اور مجھے یہاں کسی بھی آواز
کے سنائی دینے کا وہم و گمان تک نہ تھا مگر یہ کیسی آواز ہے' جو میں سن رہا ہوں۔"

اس پر رومی' اقبال کو بتلاتے ہیں کہ یہ تمہارا ہم وطن ہے اور "تمہاری ہی طرح اس کے سینے میں بھی ایک
بیقرار دل ہے لیکن اس کی قناعت اور استغنا نے اسے ایسی بلندیوں کا حامل بنا دیا ہے۔" آگے

غنی کی صفات اور اس کی وطن اور قدم کے ساتھ محبت بات چلتی ہے۔ اقبال رومی کی زبانی یہ تفصیل سن کر غنی سے ملنے کے مشتاق ہو جاتے ہیں۔ رومی دونوں کو ملاتے ہیں۔ غنی، اقبال سے مل کر بہت خوش ہوتے ہیں۔

ڈاکٹر شمس الدین کا کشمیری صوفی شاعر شمس فقیر کے بارے میں مرتب کیا ہوا رسالہ رسی نامہ سے موسوم ہے اور یہ ۱۹۵۹ء میں کلچرل اکادمی کے سلسلہ منتخبات کشمیری منظومات میں شایع ہوا ہے۔ یہ اس سلسلے کے دوسرے رسالوں کی طرح تعارف، تبصرہ اور نمونہ کلام کے تین حصوں پر مشتمل ہے ۱؎

محمد امین پنڈت، ریاست کے محکمہ معلومات عامہ میں مددگار کے عہدہ پر مامور تھے، وہ اچھا علمی اور ادبی ذوق بھی رکھتے ہیں۔ ان کے مضامین رسالوں میں شایع ہوتے رہتے ہیں۔ ایک مضمون جو "کشمیر کے تمدنی جشن" کے عنوان سے لکھا تھا، "تعمیر" (اگست ستمبر ۱۹۶۴ء) میں شایع ہوا ہے۔ اس اعتبار سے اہم ہے کہ اس میں ان میلوں اور جشن و تقاریب کی تفصیل لکھی ہے، جو اہل کشمیر سالہا سال سے مناتے ہیں۔ جشن لوہری اور بادام واری کے جشن کی اچھی تفصیل دی ہے۔ جشن لوہری کشمیر کے کسان، سردیوں کے اختتام پر مناتے ہیں اور بادام واری کا جشن، جو جشن شگوفہ کے نام سے موسوم ہے، بہار کی آمد کا جشن ہے۔

لیکن محمد امین پنڈت کا ایک اہم کارنامہ "تاریخ لداخ" ہے، جس میں لداخ کے جغرافیہ، اس کی قدیم اور جدید تاریخ، لداخ کے موسم، اس کی آب و ہوا اور خاص طور پر وہاں کی طرز معاشرت کے بارے میں اس تصنیف سے بڑی مفید اور دلچسپ معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ لداخ کے قومی تہواروں کی تفصیلات بھی معلومات آفریں ہیں۔ لداخ میں بودھ بڑی تعداد میں آباد ہیں۔ ان کے شادی بیاہ کے طریقوں کا حال لکھتے ہوئے بتاتے ہیں:

> "شادی کے دو طریقے ہیں۔ ایک یہ کہ عورت بیاہ کر شوہر کے گھر جائے۔ اس کو "بغا" بولتے ہیں۔ اس صورت میں عورت اپنے باپ کے گھر میں اپنے حقوق وراثت سے محروم ہو جاتی ہے اور اپنے شوہر کی دست نگر بننے پر مجبور ہو جاتی ہے۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ مرد بیاہ کر بیوی کے گھر جاتا ہے۔ اس کو "مقپا" کہتے ہیں، جس کو عام زبان میں خانہ داماد کہنا چاہیے۔ اس صورت میں مرد اپنے باپ کے گھر میں حقوق وراثت سے محروم ہو جاتا ہے اور اپنی بیوی

۱؎ ڈاکٹر شمس الدین نے زین العابدین رہنما کی لکھی ہوئی سیرت [illegible]

کی فرماں برداری پر مجبور ہوتا ہے۔ یہ عموماً وہی لڑکے کرتے ہیں جنہیں رواجاً اپنے باپ

کی وراثت نہیں مل سکتی۔"

یہ کتاب ابھی طبع نہیں ہوئی۔ ع۱

بیگم قریشی جن کا اپنے گھر کا نام تاج بیگم ہے، دو رسالوں کی مترجم ہیں۔ اصل رسالے سکولوں اور

خاص طور پر ابتدائی جماعتوں کی تعلیم کے لئے تعلیمی ریسرچ اور تربیت کی قومی کونسل نے مرتب کروائے ہیں۔

یہ رسالے "سائینس از ڈوئنگ" کے نام سے لکھے گئے ہیں۔ بیگم قریشی انہیں "سائینس عملی کام ہے" کے عنوان سے

اردو میں منتقل کیا ہے۔

بیگم قریشی کے اجداد سادات گیلانیہ سے ہیں، ان میں سے ایک بزرگ کشمیر چلے آئے تھے۔ ارشاد

و ہدایت ان کا کام تھا اور شہروں سے دور درویشانہ زندگی بسر کرتے تھے۔ لوگوں سے جہالت اور پس

ماندگی کو دور کرنے کی کوشش میں زندگی گزری۔ درس و تدریس ان کا مشغلہ رہا۔ ان کی اولاد میں ایک

شاخ کشتواڑ چلی گئی، دوسری کرناہ میں آباد ہوئی۔ بیگم قریشی اسی شاخ سے ہیں۔ ان کی ولادت ۱۹۱۶ء میں

ہوئی۔ ان کے والد سید احمد علی شاہ کشمیر کے ابتدائی روشن خیال لوگوں میں تھے، انہوں نے حالات کا رخ

سمجھ لیا تھا، اسی لئے عام رواج اور اپنے خاندان کی روایات کے خلاف خود انگریزی تعلیم حاصل کی اور ریاست

کے محکمہ جنگلات میں ملازم ہو گئے تھے۔ اپنے چار لڑکوں اور چار لڑکیوں کو بھی انگریزی تعلیم دلانے کی جرأت

کی، جن میں سے آج ہر ایک ریاست کے اہم ذمہ دار عہدوں پر فائز ہیں۔ ضمیر احمد فوج میں، شیام جی پولیس

کے ڈپٹی انسپکٹر جنرل ہیں۔ نذیر احمد، جو سیشن جج تھے اور سب سے چھوٹے ڈاکٹر نصیر احمد شاہ سرکاری میڈیکل

کالج کے صدر اور کشمیر کے مشہور فزیشن ہیں۔ بہنوں میں بیگم جلال الدین محکمہ تعلیم کے اعلیٰ عہدوں پر فائز رہیں،

مس محمودہ سرینگر کے ایک زنانہ کالج کی صدر ہیں۔ اس زمانے میں سکولوں کی تعداد گنتی کی تھی اور لڑکیوں کے

سکول تو برائے نام تھے۔ اس لئے لڑکیوں کی تعلیم گھر پر ٹیوٹر کے ذریعے ہوئی اور سرینگر بھجوا کر مڈل سکول

میں داخل کروا دیا۔ بیگم قریشی لکھتی ہیں کہ آٹھویں جماعت پاس کرنے کے بعد وہ نویں جماعت میں داخلہ

حاصل کرنے کے لئے گئیں تو وہ پہلی لڑکی تھیں جن سے نویں جماعت کا افتتاح ہوا۔

ع۱ کتاب کئی سال پہلے زیورِ طبع سے آراستہ ہو کر ....

میٹرک پاس کرنے کے بعد وہ سکول مسٹرس مقرر ہوگئیں لیکن حصول علم کی خواہش باقی رہی چنانچہ گھر ہی پر پڑھ کر ایف۔ اے اور بی۔ اے۔ کے امتحانات بھی کامیاب کئے۔ اس عرصہ میں ان کی شادی سید احمد قریشی سے ہوگئی۔ بی۔ اے پاس کرنے کے بعد والد کے مشورے اور شوہر کی اجازت سے وہ ایم اے کی تعلیم کے لئے لاہور بھیجی گئیں جہاں ان کی چھوٹی بہن مس محمودہ ایم۔ اے کی تعلیم کے لئے پہلے ہی بھجوائی گئی تھیں۔ دو سال لاہور میں رہیں اور ایم۔ اے کے امتحان کا جب وقت آیا تو ان کی لڑکی سخت بیمار پڑ گئی اور انہیں امتحان میں شرکت محروم رہنا اور لڑکی کو لے کر کشمیر لوٹنا پڑا۔ اس زمانے میں خواجہ غلام السیدین ناظم تعلیمات تھے ان کے مشورے سے بی۔ ٹی کا امتحان دیا اور کامیاب ہوگئیں۔ اس کے بعد ایم، اے بھی کیا اور حکومت نے انہیں انگلستان بھیجا جہاں انسٹیٹیوٹ آف ایجوکیشن لندن سے تعلیمی تربیت کا ڈپلومہ حاصل کیا۔

بیگم قریشی محکمہ تعلیم میں کئی ذمہ دار عہدوں پر فائز رہیں تعلیمات کی ڈپٹی ڈائرکٹرس ہوئیں۔ حکومت ہند کی جانب سے اقلیتی زبانوں کی افسر بھی رہیں۔ اور اب انسٹیٹیوٹ آف ایجوکیشن کی پرنسپل ہیں۔ انہیں کئی علمی اعزاز اور سماجی خدمات کے مواقع بھی عطا ہوئے۔ پنجاب یونیورسٹی کی سنڈیکیٹ کی ممبر رہیں اس وقت جموں یونیورسٹی کی سنڈیکیٹ کی رکن ہیں۔ ۱۹۶۵ء کی فوجی چپقلش میں ایمرجنسی ڈیوٹی انجام دی اور ہسپتال میں نرس کے طور پر زخمیوں کی مرہم پٹی کرنے میں امداد دی۔ بیگم قریشی کو جیسا کہ وہ لکھتی ہیں "لکھنے پڑھنے کا کافی شوق ہے"۔ انہوں نے لڑکیوں کی تعلیم کے لئے "علم خانہ داری" کے موضوع پر ایک کتاب لکھی ہے۔ سائنس پر ان کے دو ترجمے "سائنس عملی کام ہے" کے عنوان سے تیسری اور چوتھی جماعت کی تدریس کے لئے کئے گئے ہیں۔ اصل انگریزی رسالے تعلیمی تحقیقات اور تربیت کی نیشنل کونسل نے مرتب کرانے میں تیسری جماعت کی کتاب کے آغاز میں نوعمر بچوں کے ذہن کو اکسانے اور انہیں اپنے زمانے میں سائنس کی ترقی، ضرورت اور اہمیت کا احساس دلانے کے لئے یہ عبادت ملتی ہے۔

"آج ہم کیسے عجیب وغریب سائنس کے دور میں زندگی گذار رہے ہیں؟ انسان نے آخر کار چاند پر قدم رکھ کر خلا پر فتح پالی"۔

آگے موضوع کی طرف انتقال اس طرح ہوتا ہے۔

"صدیوں پہلے انسان سوچتا تھا کہ زمین چپٹی ہے، جہازران ساحل سے دور سفر کرتے ڈرتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ جہاز اس چپٹی زمین کے کنارے پہنچ کر گر جائے گا لیکن سپین کے زمین کی کھوج لگانے والے ایک شخص میگلن نامی کا خیال تھا کہ زمین چپٹی نہیں ہے، بلکہ گنبد نما ہے۔"

مس محمودہ احمد علی شاہ جن کی طرف ابھی اوپر کے ترجمے میں اشارہ کیا گیا بیگم قریشی کی سب سے چھوٹی بہن اور احمد علی شاہ کی سب سے چھوٹی صاحب زادی کی ریڈیو تقریروں اور دوسری تحریروں کا مجموعہ مرتب ہوا ہے۔

مس محمودہ ۱۹۱۹ء میں پیدا ہوئیں۔ ان کی ابتدائی تعلیم و تربیت بھی گھر ہی پر ہوئی، اس کے بعد سی ایم ایس گرلز ہائی سکول میں داخل ہوئیں۔ جہاں سے انہوں نے پنجاب یونیورسٹی میٹرک کا امتحان درجہ اول میں کامیاب کیا، اس کے بعد انٹرمیڈیٹ کی تعلیم کے لئے لاہور بھیج دی گئیں۔ لاہور میں کینیڈ کالج میں انہوں نے داخلہ لیا، اور انٹرمیڈیٹ اور بی اے کے امتحانات درجہ اول میں کامیاب کر کے ۱۹۴۳ء میں گورنمنٹ کالج لاہور میں ایم، اے کے لئے داخل ہو گئیں، ان کا منتخب مضمون سیاسیات تھا۔ لاہور میں قیام کے زمانے میں وہاں کے علمی اور ادبی حلقوں سے ان کے روابط بڑھے، اور اس زمانے کے مشہور اہل قلم جیسے احمد شاہ بخاری محمد دین تاثیر اور شعرا میں فیض احمد فیض اور مخدوم محی الدین، کرشن چندر، سردار جعفری، خواجہ احمد عباس اور کئی ترقی پسند شعراء جو لاہور آتے رہے، ان سے تعارف ہوا اور ان کی علمی اور شعری مجلسوں میں شرکت کے بھی مواقع ہے۔ علامہ اقبال جنہیں کشمیر سے تعلق خاطر تھا، اہل کشمیر سے گہرا لگاؤ رکھتے تھے۔ نوعمر خواتین کشمیر سے ایسی اعلےٰ التعلیم یافتہ ذہین لڑکیوں سے، ان کو ملنے کا کم موقع ہوا تھا۔ فطرتاً وہ ان کے قدر دان رہے، اور جب تک لاہور میں قیام رہا مس محمودہ علامہ اقبال سے ملتیں اور ان کے علم و فضل اور خیالات سے استفادہ کرتی رہیں اور خود اقبال کو ان سے مل کر خوشی ہوتی تھی۔

لاہور ہی میں قیام کے زمانے میں، ترقی پسند سیاسی تحریکوں سے بھی وہ متاثر ہوئیں۔ یہ مسایل اصل میں ان کے مطالعے کا جز تھے۔ کانگریس کے بائیں بازو کے حلقے کے اہل فکر سے ان کا میل ملاپ رہا تاہم سماجی شعور ان کا اپنا اور ادبی میلان ان کے اپنے تھے، چنانچہ ایسے اہل فن اور اہل علم سے ان کے روابط بڑھے۔ بلراج ساہنی کی انڈین پیوپلز تھیٹر کی تحریک سے بھی وہ منسلک رہیں اور لاہور میں خود اس انجمن کی صدر بھی منتخب ہو گئی تھیں۔

گہری اور صدیوں پرانی جھیلیں اور شاید ان سے بھی قدیم سر بفلک کوہسار ان کی نک بوس برفانی چوٹیاں جن پر صدیوں کی جمی ہوئی برف کی تہیں، اقبال کے الفاظ میں ان کے سر پر دستار فضیلت ہے اور جن پر سورج کی تیز اور چاند کی ملائم کرنیں اپنی اپنی باری سے جھلملاتی ہیں اور پھر اس کے گنگناتے نائے مستانہ انداز سے بہتی ہوئی ندیاں، شفاف چشمے، جن کے بارے میں اقبال نے کہا تھا۔"

پانی تیرے چشموں کا چمکتا ہوا سیماب

"اس کے رنگ برنگی پھول اور رجاں بخش پھل ـــــ میں سوچتی ہوں اس سارے طلسم رنگ و بو کو بیان کرنے کے لئے زبان اور قلمبند کرنے کے لئے انداز بیان کہاں سے لاؤں! یہاں زبان اور قلم دونوں کو اپنی کوتاہیوں کا احساس ہوتا ہے۔"

اپنی حسین سرزمین کی رعنائیوں کے تعلق سے ان کے جذبات ہمیشہ ابھر آئے ہیں، اور وہ یہاں کے فطری حسن کی طرح یہاں کے باسیوں کی ذہانت اور خاص طور پر ان کی ملنسار طبیعتوں، اور شائستہ اطوار پر ان کے بارے میں جذبات فخر و مباہات بھی دبا نہیں سکیں۔ مثلاً اپنے مضمون "کشمیر میں خواتین کی بیداری" میں جو "آجکل" (دہلی) کے شمارہ کشمیر میں شایع ہوا تھا، وہ لکھتی ہیں۔

"پرانے زمانے میں جو لوگ کشمیر آتے رہے، وہ اس خوبصورت وادی کے لازوال حسن اس کے سر بفلک پہاڑوں، زرخیز زمین اور مناظر فطرت کے لاثانی جمال سے متاثر ہوئے بنا نہیں رہ سکے۔ یہاں کے خوشنما کوہسار، اور مرغزار، وادیاں اور چشمے اور ان کے ساتھ ساتھ لہکتے اور مہکتے پھول، خاص کر کشمیری گلاب، قدرت کی فراوانی کے مظہر ہیں۔ قدرت کی اس فیاضی نے یہاں کے ذہنوں کو سینچا ہے اور اسی لئے اس وادی کی کوکھ سے دانشوروں، رشیوں اور امن کی متلاشی ہستیوں کا جنم ہوا۔"

نو عمر کشمیری خواتین، جو ان کی مستقبل کی توقعات کا مرکز ہیں، اور جن کی ذہنی تعمیر میں خود ان کا بھی ہاتھ رہا ہے۔ جب ان کو رواں دواں شاہراہ ترقی پر گامزن دیکھتی ہیں تو ان کا دل جذبات تحسین سے مملو ہو جاتا ہے اور وہ

ایم۔ اے کامیاب کرنے کے بعد انہیں اسلامیہ کالج لاہور کے شعبہ خواتین کی صدارت کے لئے مدعو کیا گیا، لیکن مس محمودہ کشمیر لوٹ کر یہاں اپنی پسماندہ اور علم سے محروم نو عمر بہنوں کی خدمت کرنا چاہتی تھیں۔ چنانچہ جب وہ یہاں آئیں تو ایک ہائی سکول میں انہیں ۵۷ روپیہ کی ملازمت دی گئیں، اور یہ اس زمانے کے اونچے گریڈ سمجھے جاتے تھے۔ بعد میں ایک مڈل سکول کی ہیڈ مسٹرس مقرر ہوئیں۔ لیکن ان کے کام کی اہمیت اس وقت معلوم ہوئی جب بارہمولہ گرلز ہائی سکول کی صدر بنا کر بھیجی گئیں۔ یہاں کی کسی قدر سیانی لڑکیوں میں وہ زیادہ آسانی کے ساتھ نئے حالات اور نئے عہد کے تقاضوں کا شعور بیدار کر سکتی تھیں، اور یہ کام مباحثوں کی مجالس نمونے کی پارلیمنٹ اور اسی طرح کے علمی اور ادبی محفلوں کے انعقاد کے ذریعہ بہتر طریقہ انجام پا سکا اور اس کا اثر بھی نہ صرف طالبات بلکہ وہاں کی عام خواتین پر بھی صحت بخش مترتب ہوا۔

۱۹۵۲ء میں وہ حکومت کے وظیفہ پر لیڈز گئیں، جہاں سے تعلیم و تربیت کا ڈپلوما حاصل کیا، اور اس کے بعد یورپ کے کئی ملکوں میں گھوم کر وہاں کے علمی، تعلیمی اور سماجی حالات کا مطالعہ کرنے کا بھی انہیں موقع حاصل ہوا۔ ۱۹۵۳ء میں وطن لوٹ کر انہوں نے زنانہ کالج، امیرا کدل کی صدر کی حیثیت سے جائزہ لیا، اور اب تک اسی کالج کی خدمت میں مصروف ہیں، اور ان کی ساری توانائیوں اور توجہ کا یہی مرکز بنا ہوا ہے، حالانکہ اگلی جموں و کشمیر یونیورسٹی اب جموں کی یونیورسٹی اور خاص طور پر کشمیر یونیورسٹی کی اعلیٰ علمی اور انتظامی مجلسوں سے بھی وہ گہرے طور پر وابستہ ہیں اور ان کی رکن ہیں [1]۔

مس محمودہ کی تقریروں اور مضامین کا مجموعہ جس کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے زیادہ تر ان کی دلچسپی کے موضوع جیسے تعلیم، تربیت، سماجی مسایل اور خاص طور پر نو عمر خواتین کی ذہنی اصلاح اور ترقی سے متعلق ہیں۔ ایک مضمون "یادیں" خود نوشت کی حیثیت بھی رکھتا ہے اور اس میں اور دوسرے مضامین میں جگہ جگہ رومانی شان ابھر آتی ہیں۔ مثلاً یہ یادہ:

"میری زندگی کا بیشتر حصہ کشمیر کی حسین وادی کے ساتھ وابستہ رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ میری یادیں بھی اسی سرزمین کے ساتھ وابستہ ہیں۔ قدرت نے کشمیر کو جی بھر کر نوازا ہے اور دل کھول کر خوبصورتی اور رعنائی سے سرفراز کیا ہے۔ اس وادی کی سرسبز شاداب زمین، اس کی نیلگوں

---

[1] مس محمودہ اب ملازمت سے [illegible]

کہہ اٹھتی ہیں۔

"خلوص عمل، اتحاد واتفاق، سچا جذبہ وطن، یقین محکم، عمل پیہم ـــ اور اس میں خواتین وطن کسی اور کے مقابلے میں پیچھے نہیں رہیں۔"

کلچرل اکادمی کے ڈپٹی سیکریٹری محمد یوسف ٹینگ، علم وادب اور تحقیق کا اچھا مذاق رکھتے ہیں۔ ان کا وطن شوپیان، کشمیر ہے جہاں ان کی ولادت ۱۹۳۵ء میں ہوئی۔ سرینگر تعلیم پائی اور اردو میں بی۔ اے آنرز کامیاب کرکے سرکاری ملازمت میں منسلک ہوگئے، لیکن ان کی دلچسپی صحافت سے رہی۔ چنانچہ پہلے وہ محکمہ اطلاعات کے ترجمان "تعمیر" کے مدیر کی خدمت انجام دیتے رہے۔ یہ کام ۱۹۵۹ء سے ۱۹۶۲ء تک ان کے سپرد رہا۔ اس سے پہلے شمیم احمد شمیم اس کے ایڈیٹر رہے تھے۔ یہ دوماہی رسالہ تھا اور اپنی مختصر زندگی میں اس کو اردو کے علمی اور ادبی رسایل میں ایک مقام حاصل ہوگیا تھا۔ اس کے مختلف شماروں کے ذریعے ریاست کے کئی سنجیدہ انشا پرداز، شاعر اور علمی موضوعات پر لکھنے والے اہل قلم منظر عام آسکے۔ "تعمیر" نے کشمیر کے بعض شاعروں کے بارے میں خاص شمارے بھی شایع کئے تھے، جن میں سے ایک ماسٹر زندہ کول ثابت کے حالات اور ان کے کارناموں پر مشتمل ۱۹ء میں شایع ہوا، دوسرا مہجور کی زندگی اور شاعری پر ۱۹۵۷ء میں نکلا۔

ٹینگ نے ۱۹۶۲ء میں کلچرل اکادمی کے دوماہی رسالے "شیرازہ" کی ادارت کے فرائض سنبھالے۔ صحافت سے ان کی دلچسپی نے تھوڑے عرصے کے اندر اندر اسے ملک کے سارے اردو رسالوں میں ممتاز بنا دیا، اور علم وادب کے مختلف شعبوں پر جو سرمایہ اس رسالے کے صفحات کے ذریعے منظر عام پر آیا اس میں سے کافی حصہ ایسا ہے جو پائیدار اہمیت کا مالک ہے۔ اس رسالے کے بھی کئی اچھے معیاری خاص شمارے شایع ہوئے، ان میں ڈاکٹر زور نمبر خاص طور پر قابل ذکر ہے۔

ٹینگ کی قلمی اور ادبی مساعی یہیں تک محدود نہیں، وہ کئی اخباروں کے کالم نویس ہیں۔ اس کے علاوہ تحقیق اور تنقید کے ستھرے ذوق سے بھی آشنا۔ چنانچہ ان کے کئی تنقیدی اور تحقیقی مضامین نہ صرف ان کے اپنے رسالوں بلکہ ملک کے دوسرے جریدوں میں بھی شایع ہوتے رہتے ہیں۔ ان میں سے کچھ منتخب مضامین کا ایک مجموعہ "کشمیر اور کشمیری ادب" کے نام سے انہوں نے مرتب کیا ہے جس کے ذیل میں مطالعے شامل ہیں:

(۱) رسول میر (۲) گکر یز ترجمہ یا تخلیق (۳) مہجور کی شاعری (۴) کشمیری زبان اور اردو

(۵) غلام نبی عارض (۶) خوشی محمد ناظر (۷) ایک ادبی سرقہ (۸) کشمیر کے اصلی باشندے

(۹) اقبال کی ذہنی لغاوت — جاوید نامہ (۱۰) مہجور کا آخری سفر۔

ان عنوانات سے یوسف ٹینگ کی دلچسپیوں کا اندازہ ہوتا ہے۔ ان میں سے رسول میر، غلام نبی عارض، مہجور کی شاعری، تنقیدی جائزے ہیں، گکر یز، خوشی محمد ناظر، ایک ادبی سرقہ اور کشمیر کے اصلی باشندے تحقیقی ہیں۔ اقبال کی ذہنی لغاوت، جاوید نامہ کے تاثرات کی نئی ترجمانی ہے۔ ٹینگ کے کچھ اور اچھے مضامین اس مجموعے میں جگہ نہ پاسکے، حالانکہ ان کے کچھ تنقیدی یا تعارفی جائزے جیسے ساگر چند گورکھا کی تصنیف "ہمالیہ کی گود میں" کا تعارف اپنے انداز اور اسلوب ہر لحاظ سے پڑھنے کے قابل مضامین تھے۔

یوسف ٹینگ کا فارسی اور ادب کا مطالعہ وسیع ہے اور تنقید میں ان کا قلم صاحب رائے اصحاب کی طرح چلتا ہے۔ انہوں نے ایک اسلوب نگارش بھی نشو و نما دے دیا ہے۔ ذیل کے اقتباس سے جو ان کے مضمون "کشمیر کے قدیم باشندے — روایت اور افسانہ" کا آغاز اس طرح ہوتا ہے:

"ہمالیہ کی دشال چوٹیوں کے حلقے میں کشمیر کی چھوٹی سی وادی سبز زمرد کی طرح جڑی ہوئی ہے۔ کسی لوک کہانی کے استعارے میں کشمیر کے محل وقوع کو بیان کرنے کی کوشش کی جائے تو کچھ یوں کہنا پڑے گا کہ سفید براق وردیاں پہنے ہوئے پہرہ دار ایک ماہ پیکر حسینہ کی جلوہ آرائیوں کو نظر بد سے بچائے ہوئے ہیں۔"

مضمون میں نیل مت پران اور راج ترنگنی سے لے کر موجودہ دور کے یورپی محققین کی رایوں تک کی چھان بین کی ہے۔ "ناگ" لفظ اور تصور کو جو کشمیر کی اساطیری تاریخ اور لبعد کے افسانوں کے ساتھ ایک رومانوی دلچسپی کا حامل بن چکا ہے، اس کی وضاحت کرتے ہیں۔

"ناگ پوجا اور چشموں اور سانپوں کی اساطیری حیثیت کوئی دور از کار استعارے نہیں ہیں بلکہ ایک قوم عجیب کی واضح علامتیں ہیں۔"

یوسف ٹینگ اپنے سوچنے کے انداز میں اور لکھنے کے اسلوب میں ہر جگہ اپنی انفرادیت قائم رکھنے

اور بعض وقت اس کو نمایاں کرنے کی طرف بھی مایل ہیں، اور اس میلان کی بدولت کبھی کبھی ان کے قلم سے کچھ اچھی ترکیبیں، اچھے اظہار اور لفظ ادا ہو گئے ہیں۔ مثلاً ساگر چند گورکھا کی تصنیف "ہمالیہ کی گود میں" کا تعارف کرتے ہوئے وہ ایک لفظ "پربت نوردی" استعمال کر گئے ہیں۔ یہ اصل میں بندھی ٹکی سمتوں سے ہٹ کر چلنے والے ذہن کا ایک وصف ہے۔ اردو ادب کی خدمت اور اس کی ترقی کا بھی انہیں اتنا ہی خیال ہے جتنا خود اپنی زبان کشمیری کی ترقی کا۔

یوسف ٹینگ چند اہم کتابوں کے مُرتب اور مُصنّف بھی ہیں۔ ان میں سب سے زیادہ اہم عبدالاحد آزاد مرحوم کی یادگار تصنیف کشمیری زبان اور شاعری ہے، جس کے دو حصّے پہلا اور دوسرا انہوں نے ترتیب دیا ہے، مقدمہ اور حواشی بھی لکھے ہیں، اور یہ کام سلیقے سے اور عالمانہ انداز میں انجام دیا ہے۔ مسودات کی ترتیب کے بارے میں وہ لکھتے ہیں:

"اس تذکرے کے مسودات جب پہلی بار میرے دیکھنے میں آئے تو بہت غلط ملط اور بے ترتیب تھے۔ نا وقت موت نے انہیں ان پر نظر ثانی اور ان کی خاطر خواہ شیرازہ بندی کا موقع ہی نہ دیا۔ یہ مسودات کافی ضخیم تھے اور ایک ہی جلد میں ان کا جمع کر دینا مجھے مناسب نہیں معلوم ہوا۔ اس لئے میں نے مرزا کمال الدین شیداؔ کے مشورے سے انہیں دو جلدوں میں تقسیم کر دیا ہے۔"

ترتیب کے سلسلے میں ٹینگ نے اپنے بسیط دیباچے میں آزاد کی تصنیف کی ارزیابی کی کوشش کی ہے، اور جگہ جگہ ضروری نوٹ بھی قلمبند کئے ہیں۔ دیباچے میں کشمیری زبان کے شعرا کے پہلے تذکرہ کی حیثیت سے آزاد کی تصنیف کا جو مرتبہ ان کی نظر میں ہے، اس کا ذکر کرتے ہوئے وہ براون کی تاریخ ادبیات ایران، شبلی کی شعر العجم اور حالی کے مقدمہ شعر و شاعری کے مقابلے اس تذکرے کو کشمیری زبان کے لئے زیادہ اہم قرار دیتے ہیں۔ لکھتے ہیں:

"لیکن آزاد کی کتاب نہ تو نظریاتی مباحث تک محدود ہے اور نہ ہی فقط تنقید تک، بلکہ سوانح اور تاریخ دونوں کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔ اس اعتبار سے یہ اپنی نوعیت اور نتائج کے

لحاظ سے کشمیری زبان کے لئے انتہا درجے کی اہم ہے۔ بلکہ اس سلسلے میں بجا طور پر

یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ سوانح اور تاریخ کے شعبے میں ہماری زبان کی سب سے بلند

چوٹی ہے۔"

مقدمۂ یوسف ٹینگ کی اچھی اور توجہ سے لکھی ہوئی تحریروں میں سے ہے۔ آزاد کی اس تصنیف اور کشمیری زبان کے شعراء کے بارے میں اردو میں بلکہ کسی زبان میں بھی اس پہلی تصنیف کی اشاعت کے خیال سے وہ فطرتاً جذباتی ہو جاتے ہیں تاہم تصنیف کی مجموعی قدر و قیمت کا اندازہ لگانے میں ان کا لب ولہجہ محتاط ہے۔ مثلاً آزاد کی تنقیدی صلاحیتوں کا ذکر کرتے ہوئے ہوُ وہ معذرت خواہی کا انداز اس طرح اختیار کرتے ہیں:

"آزاد کی ذہانت اور ذکاوت کا اندازہ ان کے آتش نوا کلام سے ہو سکتا ہے مگر تنقید کیلئے صرف اعلےٰ درجہ کی ذکاوت ہی نہیں بلکہ وسیع مطالعے اعلیٰ تعلیم اور تہذیب یافتہ اظہار کی ضرورت ہوتی ہے۔ آزاد مکتبوں کے تعلیم یافتہ تھے اور آئندہ تعلیم کے لئے انہیں ضروری سہولیات و فراغت حاصل نہ تھیں۔"

یوسف ٹینگ کا ایک اور مختصر مگر اہم کارنامہ کشمیری غزل کے میر رسول میر پر کتابچہ کی تدوین ہے جس میں شاعر کی زندگی کے حالات کا تعارف، کلام پر تبصرہ اور کلام کا انتخاب شامل ہے۔ یہ کتابچہ کلچرل اکادمی کے سلسلہ انتخاب منظومات کشمیری میں شایع ہوا ہے۔ رسول میر کی زندگی حالات زیادہ تر ان کے کلام سے اخذ کرنے کی کوشش کی ہے اور "کنگی" سے ان کے عشق کی روایت جس کو حالات میں بڑی جگہ دی ہے انہیں کے کلام سے واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔ کلام پر تبصرے میں ٹینگ اپنے اسلوب کے تحفظ کی زیادہ کوشش کرتے ہیں۔ مثلاً

"میر کے کلام میں ہر عظیم غزل گو کی طرح لہجے کے اتار چڑھاؤ زبان کے زیر و بم اور استعارات کے لطیف ابہام کا خاص دخل ہے۔"

کلچرل اکادمی کے سالنامے یا سالانہ اشاعت "ہمارا ادب" جس میں حتی الامکان سال بھر کے اچھے ادب کی اشاعت ملحوظ رکھی جاتی ہے اس کے تین جلدیں یوسف ٹینگ نے ترتیب دی ہیں۔ اور "تعمیر" "شیرازہ" اور ان خاص اشاعتوں کی ترتیب کے تجربوں نے انہیں اردو کے اچھے مرتبین کا درجہ عطا کر دیا ہے۔ ایک اور نئر ترتیب،

وطن دوستی کی نظموں کے مجموعے کی ہے، جو یوسف ٹینگ نے "وطن کی پکار" کے عنوان سے اکاڈمی کی جانب سے شایع کیا ہے۔

رشید تاثیر اہل صحافت بھی ہیں اور مصنف بھی۔ کشمیر میں آزادی کی جد و جہد کی تاریخ غالباً حکومت کی جانب سے مرتب کرائی جا رہی ہے لیکن عام دلچسپی کے لیے پڑھنے والوں اور کشمیر کی تاریخ کے اس اہم عہد کے بارے میں رشید تاثیر نے ایک مختصر کتاب "تحریک حریت کشمیر" کے نام سے مرتب ۱۹۶۸ء میں محافظ پبلی کیشنز سرینگر سے شایع کردی ہے۔ "محافظ" اصل میں وہ ہفتہ وار ہے، جس کو وہ مرتب اور شایع کرتے ہیں۔ وہ جری لکھنے والوں میں سے ہیں۔ کتاب کے عرض حال میں انہوں نے تحریک حریت کے موضوع پر اگلی تصانیف کی طرف اشارہ کیا ہے، اور اپنی کتاب کی ترتیب کی ضرورت ظاہر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ۱۹۳۱ء سے ۱۹۳۸ء کے واقعات قلمبند کرنے میں مصنفین کوتاہی برتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"۱۹۳۱ء سے ۱۹۳۸ء تک کے دور کو، جو سنگ بنیاد کی حیثیت رکھتا ہے، تقریباً تمام مورخوں نے نظر انداز کیا ہے، حالانکہ سیاست کشمیر کو سمجھنے اور جاننے کے لیے یہ اشد ضروری ہے کہ اس تحریک کے ابتدائی نقوش اجاگر کیے جائیں۔"

اس سلسلے میں رشید تاثیر نے اس بات کی طرف اشارہ نہیں کیا کہ بعض مصنفین اور مورخین نے اپنے اپنے سیاسی یا اور طرح کے نقطہ نظر سے بھی کام لیا ہے۔ بہر حال اردو میں اس اہم دور کی یہ اچھی تاریخ مرتب ہو گئی ہے اور آیندہ کے مورخ کے لیے اس میں کافی مواد اور دستاویزی نقلیں محفوظ ہو گئی ہیں۔

سید میر قاسم نے جو اس وقت ریاستی کانگریس کے صدر تھے، ریاست کے وزیر بھی رہے، اور روایت کے مطابق اردو کے اچھے شاعر ہیں اور قاسم تخلص کرتے ہیں، اپنے پیغام میں، جو کتاب کے آغاز میں شامل ہے، کتاب کی اشاعت کا خیر مقدم کرتے ہیں:

"رشید تاثیر تاریخ کشمیر کے جس پر آشوب دور کو ترتیب دے رہے ہیں، اس سے ریاستی باشندوں کی توقعات پوری ہوں گی۔"

محمد دین پانڈے سابق نائب وزیر اطلاعات کا تعارف بھی کتاب کے ساتھ شامل ہے۔ کتاب میں تاریخ

کے کچھ ابتدائی واقعات کے بعد مہاراجہ گلاب سنگھ، رنبیر سنگھ اور خاص طور پر ہری سنگھ کے عہد میں جو پیش رفت جدوجہد آزادی کی تحریک میں ہوئی اس کی تفصیلات جو اس کتاب میں درج ہیں ان پر اس سے پہلے کسی اور مصنف نے روشنی نہیں ڈالی تھی۔ اسی طرح یہ کتاب اس موضوع کی تصانیف میں اہمیت رکھتی ہے۔

ایک رنگارنگ۔ دلچسپیوں کے حامل لکھنے والے غلام نبی خیال ہیں جو ایک آزاد لو رد صحافی شاعر جو کشمیری اور اردو میں لکھتے ہیں مضمون نگار اور ایک اہم کارنامے کے مرتب ہیں۔ خیال نے کشمیری میں اخبار "وطن" ہفتہ وار نکالنے کا تجربہ کیا لیکن جب وہ بند ہو گیا تو انہوں نے محاذ رائے شماری کے ہفتہ وار "محاذ" کی ادارت کے فرائض انجام دیئے۔ جب اس اخبار سے ترک تعلق کر لیا تو کچھ عرصہ تک ایک اردو ہفتہ وار "اقبال" کے نام سے نکالتے رہے، اور اب اس کی اشاعت بھی مسدود ہے۔

خیال سلجھے ہوئے انشاء پرداز ہیں، سیاسی اور ادبی دونوں طرح کے موضوعات بھی ان کا قلم روانی سے چلتا ہے۔ مثال کے طور پر "محاذ" کے پہلے شمارے (جولائی ۱۹۶۴ء) کے لئے ایک اداریہ "زندان نامہ" کے عنوان سے لکھا تھا۔ اس مضمون میں قید اور آزادی کا مقابلہ اس انداز سے کیا ہے:

"آزادی کی محدود یا بے پناہ دنیا سے الگ تھلگ ایک ایسی دنیا بھی ہے جسے عالم قید و بند کہا جاتا ہے۔ زندان کی دنیا آزاد فضاؤں کی دنیا سے اس قدر مختلف ہوتی ہے کہ اس میں منتقل ہو کر انسان کو اپنی ذات، موجودہ عالم ہست و بود کی تخلیق ماننے پر شک ہوتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک حساس اور دھڑکتے دل والے انسان کو جب غیر فطری طور پر ایک محدود چار دیواری میں نظر بند کیا جائے تو اس کی فکری دنیا میں ایسا عظیم انقلاب رونما ہو جاتا ہے کہ اس کی ساری کائنات بدل کر رہ جاتی ہے۔"

کشمیری کے ادب پر ان کے مضامین شایع ہوئے ہیں۔ ایک اچھا جائزہ "کشمیری زبان کی مثنویاں" رسالہ "شیرازہ" کے شمارہ مارچ ۱۹۶۳ء میں شایع ہوا تھا جس میں کشمیری مثنوی کے ابتدائی نمونوں اور ان کی ترکیب اور اہم مثنویوں کا تنقیدی مطالعہ کیا گیا ہے۔ لیکن خیال کا اہم کام ظلمن کول بلبل کی رزمیہ مثنوی "سام نامہ" کی ترتیب اور اشاعت ہے جو کشمیری ۔۔۔ کے سلسلے میں لکھا جا چکا ہے۔

"سام نامہ" خواجو کرمانی کی ہم نام مثنوی پر مبنی ہے۔ خیال نے کوئی ۳۰۴ صفحات کے وسیع اور بسیط مقدمہ کے ساتھ اسے مرتب اور شایع کیا ہے۔ لیکن یہ شرح و بسیط ہی مقدمہ کی اصلی خوبی نہیں بلکہ اس کا تنقیدی اور کسی حد تک تحقیقی حصہ بھی وزن رکھتا ہے۔ خیال نے آغاز کشمیری کی پہلے دور کی مثنویوں کے تذکرہ سے کیا ہے جن میں زرمیہ اور بزمیہ دونوں طرح کی مثنویاں شامل ہیں۔ بعد میں زرمیہ مثنویوں کا حال لکھا ہے اور وہاب پرے اور امیر شاہ کریری کے زرمیوں پر زیادہ تفصیل سے روشنی ڈالی ہے اور ان سے لچھمن کول کے سام نامہ کا مقابلہ اور موازنہ بھی کیا ہے۔ شاعر کے حالات بھی جہاں تک ہو سکا تفصیل سے لکھے ہیں۔ مقدمہ کا وہ حصہ اہم ہے جس میں سام کی روایت پر بحث کی ہے۔ اور فردوسی سے لے کر عسجدی اور خواجو سب کا تذکرہ کر دیا ہے، کشمیری میں سام ناموں کی تفصیل بھی لکھی ہے۔ خیال نے فارسی سام ناموں کے واقعات سے بلبل کے سام نامہ کا مقابلہ بھی کیا ہے، اور جہاں بلبل نے انحراف کیا ہے۔ اس کا حوالہ دے دیا ہے۔ امیر شاہ کریری کے سام نامہ سے بلبل کے سام نامہ مقابلہ کرتے ہوئے خیال رقمطراز ہیں۔

"یہاں یہ بات پھر سے قابل غور ہے کہ ہرچند امیر اور بلبل دونوں نے ایک ہی شخص سام کو مرکزی کردار بنا کر اپنی اپنی تخلیقات پیش کی ہیں۔ لیکن امیر کا سام نامہ بلبل کی مثنوی سے چوگنا ضخیم ہے۔ دونوں مثنویوں کے مرکزی موضوع میں واقعات کی طوالت و اختصار کے علاوہ سارا مضمون مشترک ہے مگر امیر کے یہاں ایک قسم کا ڈھیلا پن سا اس لئے محسوس ہوتا ہے کہ انہوں نے اکثر جگہ کچھ ایسے غیر ضروری طول بیانی سے کام لیا ہے کہ افسانے کی شدت تاثیر میں ایک خلل سا پیدا ہوتا ہے اور افسانے کی دلچسپی بھی تفاصیل کے بوجھ سے دب کر رہ گئی ہے۔۔۔۔"

ریاست کی کلچرل اکاڈمی کی جانب سے اس کتاب کی اشاعت ۱۹۶۲ء میں عمل میں آئی تھی اور اس زمانے کے اکاڈمی کے سیکرٹری علی جواد زیدی نے اس کے لئے پیش لفظ لکھا ہے۔

سید تصدق حسین ریاست کے نوجوان وکیلوں میں ایک نمایاں مقام پیدا کر چکے ہیں ان کی تربیت سائنس میں ہوئی۔ بی ایس سی کا امتحان کامیاب کیا ہے، وہ سید نذیر احمد کے صاحب زادے ہیں۔ جن

کی طرف پچھلے صفحات میں ایک مقام پر اشارہ گزر چکا ہے۔ تصدق حسین نے ایل۔ایل۔بی کی ڈگری مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ سے حاصل کی، اور کوئی سات آٹھ سال سے وکالت کے پیشے میں سرگرم ہیں لیکن ادب اور اس سے متعلقہ مسایل سے ان کی دلچسپی فطری ہے، چنانچہ بعض یورپی مصنفین کی طرح جن کی دوسری دلچسپیاں اور مصروفیتیں ادب یا زبان کے کسی شعبے میں کام کرنے سے بالغ نہیں ہوسکیں تصدق حسین کو بھی وکالت کے پیشے کی ذمہ داریاں اردو میں مذکورہ بالا موضوع پر ایک طبعزاد کتاب مرتب کرنے سے باز نہ رکھ سکیں۔ یہ کتاب انہوں نے ۱۹۶۶ء میں شایع کی۔

کتاب میں سماج، اس کے ارتقا اور فنون لطیفہ اور ادب پر اس کے عمل اور رد عمل سے تفصیلی بحث کی ہے اور اس بحث کے دوران بہت سی علمی اور اصطلاحی گتھیاں جو پیدا ہوتی گئیں، ان کو سلجھانے کے لیے تصدق حسین نے توضیحات کا جو پیرایہ اور علمی انداز اختیار کیا ہے، اس سے اس مختصر سی کتاب کی قدر و قیمت بڑھ جاتی ہے۔ تاہم مصنف کی تحریر کا انداز کتاب کو علمی رسالہ بننے نہیں دیتا۔ بحث و گفتگو میں جگہ جگہ ادبی بلند پروازی کے علائم بھی موجود ہیں، اور کہیں کہیں یہ پرواز اتنی بلند ہو جاتی ہے کہ کتاب ادب لطیف کا ایک انشائیہ دکھائی دینے لگتا ہے۔ ارتقا کے عمل میں انسان کے حصے کو واضح کرتے ہوئے تصدق حسین لکھتے ہیں:

"انسان نے انفرادی تقاضوں کو اجتماعیت کی زنجیر میں جکڑ لیا ہے۔ انسانی فکر و ادراک کی نوک پلک نے منتشر خیالات کے خطرات اشک کو پرو کر لعل بدخشاں بنا دیا ہے۔ رہگزار کی تاریکیوں کو عزم و حوصلہ کے شمس و قمر کی تابانیاں عطا کی ہیں اور پھر اوہام کے سنگریزہ شکستہ کو حقائق طعام لذیذ سمجھ کر نوش جان کرتے رہے اور انسان کے افق تخیل پر صبح درخشاں کی طرح یقین کامل نمودار ہوا ہے۔"

ادب اور فنون لطیفہ کی آفاقیت کو نمایاں کرنے کی مستحسن زحمت برداشت کرتے ہوئے مصنف نے ادب کی طبقاتی تقسیم کے خیال کو ادب کی آفاقیت کے منافی بنایا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"یہ چند لوگ جو فن کی طبقاتی تقسیم کرنا چاہتے ہیں، فن کی پاکیزگی، عفت، تقدس اور لطافت

بلکہ اداکی پر اس شیوہ نیرنگیوں کو اپنی کم نظری کے باعث محکم حدود میں جکڑ دینے کے سلسلے میں

جکڑ کر رکھ دینا چاہتے ہیں۔ وہ پھول سے اس کی خوشبو کی لطافت رات سے اس کی سیاہی کی عظمت اور صبح سے اس کی درخشندگی کا حسن چھین لینا چاہتے ہیں لیکن گل ہائے احمریں کی آتش خنداں تنک، مایہ گریہ شبنم کے چند بے بود خطروں سے کہیں بجھ سکتی ہے!"

عرش صہبائی، جن کا تذکرہ شعرا کے ضمن میں گزر چکا ہے، اپنے عہد کے نوجوان شعرا کے ایک تذکرے "انجم کدہ" کے مولف ہیں۔ اس تذکرے کا حوالہ ان کے حالات میں بھی دیا جا چکا ہے۔ اس میں شعرا کے مختصر حالات کے ساتھ ان کا منتخب کلام بھی دیا گیا ہے۔ حالات، عرش کے قلم سے ہیں، اور اس کا حرف آغاز رہبر جدیدیہ نے لکھا ہے۔ رہبر اس بات پر زور دیتے ہیں کہ "انجم کدہ" کی اشاعت، اردو ادب میں اجارہ داری اور جماعت پرستی کے خلاف ایک مہم کا آغاز ہے"۔ یہ دراصل معذرت نامہ ہے، نوجوان شعرا کے حالات کو منظر عام پر لانے کا۔

"انجم کدہ" مکتبہ اردو ادب، جموں نے شایع کیا ہے، اور اس کی اشاعت کا سنہ ۱۹۶۳ء ہے۔

ایک اور تذکرہ "شاد رہیں تری گلیوں پہ" کے نام سے مدن موہن شرما نے مرتب کیا ہے، لیکن یہ تذکرہ سے زیادہ تعارف ہے ان افسانہ نگاروں کا، جو جموں سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان میں کرشن چندر، ان کے بھائی مہندر ناتھ اور بہن سرلا دیوی کے علاوہ جموں کے اکثر افسانہ نگاروں کا تعارف اور ان کا ایک منتخب افسانہ شامل ہے۔ مدن موہن شرما کا انداز تعارف اکثر شاعرانہ ہو جاتا ہے مثلاً کرشن چندر کے بارے میں وہ لکھتے ہیں:

"کرشن چندر ایک آئینہ خانہ ہے جس میں ادب خود اپنا چہرہ دیکھ رہا ہے"۔

ٹھاکر پونچھی کے بارے میں لکھتے ہیں:

"ٹھاکر کی کہانیوں میں زندگی انگڑائیاں لیتی ہے"۔

یہ رسالہ اردو کرڈ، بیر مٹھا، جموں سے شایع ہوا ہے۔

جموں ہی سے ایک تیسرا تذکرہ "جگدیال جوتیاں" کے عنوان سے وید راہی نے مرتب کیا ہے، یہ نوڈوگری شعرا کے تعارف کے مقصد سے مرتب کیا گیا ہے، اس میں دینو بھائی پنت، رام ناتھ شاستری،

کشن سمیلپوری، پرمانند الست، کہر سنگھ مدھوکر، کیش شرما، پنڈت شمبھو ناتھ، ویدپال دیپ اور تارا سمیلپوری کے کلام کا تعارف اور منتخب ڈوگری کلام شامل ہے۔ اس کی اشاعت ڈوگری سنستھا جموں کی جانب ۱۹۵۷ء میں ہوئی ہے۔ ہندی حصے میں ویدراہی نے پچھلے بارہ برس میں ڈوگری شاعری کو جو ترقی نصیب ہوئی ہے اس کا خاکہ دیا ہے۔ پنڈت سنسار چند صدر ڈوگری سنستھا نے اس کے لئے پیش لفظ تحریر کیا ہے۔

اس عہد کے مصنفات اور مولفات کے سلسلے میں کلچرل اکاڈمی کے سلسلہ انتخابات منظومات کشمیری کی تفصیل بھی ضروری ہے، ان میں تقریباً سب کی جانب ان کے مرتبین کے حالات کے سلسلے میں اشارہ کیا جا چکا ہے۔ یہ کل گیارہ رسالے ہیں جو اب تک شایع ہو چکے ہیں۔ ان میں اللہ دید سے لے کر آزاد و مہجور تک تقریباً سارے نمایندہ شاعر آ گئے ہیں۔ ان رسالوں کی ترتیب عموماً ایک ہی تجویز کے ماتحت عمل میں آئی ہے ہر رسالے کے تین حصے ہیں (۱) تعارف (۲) تبصرہ (۳) نمونہ کلام۔

رسالوں کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

(۱) حبہ خاتون۔ مرتبہ امین کامل، جو ۱۹۵۹ء میں شایع ہوا۔

(۲) وہاب پرے۔ جس کو پروفیسر محی الدین حاجنی نے ترتیب دیا ہے۔ اس کا سنہ اشاعت بھی ۱۹۵۹ء ہے۔

(۳) شمس فقیر۔ اس رسالے کے مرتب ڈاکٹر شمس الدین احمد ہیں اور اس کا سنہ اشاعت بھی وہی ہے۔

(۴) مقبول کرالہ واری۔ ڈاکٹر حامدی کشمیری کی ترتیب کے ساتھ ۱۹۵۹ء ہی میں شایع ہوا۔

(۵) حقانی۔ عزیز اللہ حقانی جو کشمیری صوفی شاعر ہوئے ہیں۔ اس رسالے کو فطرت کاشمیری نے اوپر کے سنہ ہی میں مرتب کیا۔

(۶) آزاد۔ عبدالاحد آزاد کے حالات اور کلام کو پروفیسر پی، این، پشپ نے اسی سنہ میں مرتب کیا۔

(۷) پرمانند۔ پروفیسر ایس، کے، توشخانی نے مرتب کیا ہے اور یہ ۱۹۶۱ء میں شایع ہوا۔

(۸) عبدالاحد نادم۔ کشمیری کے مشہور لغت گو شاعر کے حالات اور کلام کو غلام رسول نازکی نے ۱۹۶۱ء میں مرتب کیا۔

(۹) لل [illegible] اور پروفیسر جیالال

طالب نے مذکورہ بالا سلسلہ میں مرتب کیا ہے۔

(۱۰) رسول میر۔ مرتبہ محمد یوسف ٹینگ جو ۱۹۶۰ء میں شایع ہوا۔

(۱۱) مہجور۔ پیرزادہ غلام احمد مہجور کے حالات اور کلام کو بھی پروفیسر لشپ نے اوپر کے سنہ میں مرتب کیا ہے۔

ان رسالوں کے علاوہ محمد یوسف ٹینگ کے تذکرے میں ان کے مرتبہ "ہمارا ادب" کے چار سالناموں کا اشارہ گزر چکا ہے۔ اس کی اب تک پانچ جلدیں شایع ہوئی ہیں۔ ان کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

(۱) ہمارا ادب ۱۹۵۹ء۔ مرتبہ ڈاکٹر حامدی کاشمیری

(۲) " ۱۹۶۰ء اور ۱۹۶۲ء مرتبہ محمد یوسف ٹینگ

(۳) " ۱۹۶۳ء " "

(۴) " ۱۹۶۵ء " "

(۵) " ۱۹۶۵ء " "

ان جلدوں میں جموں و کشمیر انشاپردازوں اور شاعروں کی منتخب تخلیقات شایع ہوئی ہیں۔ جن میں سے کچھ پائیدار اہمیت کی بھی حامل ہیں۔ ایسے کارناموں میں کچھ غزلیں اور نظمیں، افسانے، تحقیقی اور تنقیدی مضامین اور چند ڈرامے شامل ہیں۔

موسیقی یا سنگیت کشمیر کا محبوب موضوع رہا ہے، اور ریاست میں اردو کی مقبولیت اور ابتدائی اشاعت میں ایک بڑا محرک یہی رہا ہے۔ اس موضوع پر پچھلے سال (۱۹۶۹ء) میں ایک مختصر مگر مفید رسالہ "نقش سنگیت" کے نام سے شایع ہوا ہے۔ اس کی مصنفہ رفعت جبین بچھ، محمد امین بچھ کی صاحب زادی ہیں، جن کا حال "دیہات سدھار" کے اڈیٹر کی حیثیت سے لکھا جا چکا ہے۔ رفعت جبین، سرکاری زنانہ کالج، امیرا کدل، سرینگر کی موسیقی کی لکچرار ہیں۔ کتاب زیادہ تر کالجوں میں اس مضمون کی طالبات اور طلبا کی نصابی ضرورتوں کے مقصد سے لکھی گئی ہے جس سے موسیقی کے سارے ابواب اور ان کے متعلقہ راگوں، راگنیوں اور ان کے اصولوں کی خاصی جانکاری ہو جاتی ہے۔

موسیقی کے بارے میں ایک اور کتاب مسز جے وِنتی پار مولفنیف کر رہی ہیں۔ وہ زنانہ کالج نواکدل میں موسیقی کی لکچرار اور شعبہ کی صدر بھی ہیں۔ موسیقی سے ان کی دلچسپی خاندانی ہے۔ ان کے والد پنڈت وید لعل دھر وکیل سنگیت کے ماہر ہیں۔ ایک زمانے میں ریڈیو کشمیر سرینگر کے سٹاف آرٹسٹ ہیں۔ مسز دھر کی ابتدائی تربیت اپنے والد کے یہاں ہوئی۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ تعلیم کی بھی تکمیل کرتی رہیں چنانچہ لکھنو یونیورسٹی سے سماجیات میں ایم۔ اے کی ڈگری حاصل کی ہے۔ موسیقی ان کا بی اے میں مضمون رہا۔ بمبئی کے گندھر مہا ودیالیہ سے بی میوزک کا امتحان بھی کامیاب کیا اس کے علاوہ پریاگ سنگیت سمیتی الہ آباد سے موسیقی کا سینیئر ڈپلوما بھی حاصل کیا۔ ان سب صلاحیتوں کے باوجود جموں و کشمیر یونیورسٹی میں بی ایڈ کی تربیت بھی پائی اور سند حاصل کی۔ اس وقت ایم میوزک کے امتحان کی تیاری کر رہی ہے۔

مسز پار موار دو ہندی پنجابی انگریزی اور کشمیری پانچ زبانیں جانتی ہیں اور ان میں طالبات کو موسیقی کی تعلیم بھی دیتی ہیں۔ ہندوستانی کلاسیکی موسیقی کے ساتھ خاص کشمیر کی صوفیانہ موسیقی کا بھی مطالعہ کیا ہے اور اس کے درس بھی دیتی ہیں۔ موسیقی کے بہت سے مقابلوں اور یوتھ فیسٹول میں حصہ لے کر داد تحسین حاصل کی۔ ریاست میں غالب کی صد سالہ برسی کے موقع پر ان کے کالج کی جانب سے غالب کے کلام کی پیش کشی کی جو محفل منعقد ہوئی تھی اس کی سربراہ مسز پار موہی تھیں۔

موسیقی پر ان کی کتاب جو قریب میں شایع ہو جائے گی کلاسیکی اور صوفیانہ موسیقی دونوں پر حاوی ہے۔ اس کتاب کی بنیاد بھی کالجوں میں موسیقی کے تدریس اور تربیت کے نصاب پر رکھی گئی ہے جس میں صوفیانہ موسیقی بھی شامل ہے۔ ع[1]

باہر کے :

کشمیر سے باہر کے اہل قلم جنہیں کشمیر میں کچھ وقت مقیم رہنے کے مواقع ہوئے اور جنہیں تصنیف و تالیف سے بھی دلچسپی رہی ان میں ڈاکٹر شکیل الرحمن قابل ذکر ہیں۔ وہ کشمیر یونیورسٹی کے مابعد طیلسانی شعبہ اردو کے ریڈر ہیں۔

ع[1] یہ کتاب آج تک شایع نہیں ہوسکی ہے

اور کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔ ان کا اصلی وطن چمپارن ، ریاست بہار ہے۔ پٹنہ یونیورسٹی سے انہوں نے ایم اے اور ڈی لٹ کی ڈگریاں حاصل کیں ، اور ملازمت کی تلاش میں کشمیر آئے۔ یہاں پہلے پہل انہیں سری پرتاپ کالج میں اردو کے لیکچرار کی حیثیت سے کام کرنے مواقع ہے۔ اس کے بعد وہ پوسٹ گراجویٹ شعبۂ اردو ، جموں وکشمیر یونیورسٹی میں منتقل ہوگئے۔

ڈاکٹر شکیل الرحمٰن کی تصانیف کئی ہیں۔ شکیل بدایونی کی شاعری پر انہوں نے ایک مختصر سی شکیل بدایونی کی رومانی شاعری کے نام سے لکھی تھی۔ ادب اور نفسیات کے عنوان پر بھی ان کی ایک تصنیف ہے۔ ایک اور تصنیف نفسیات اور جمالیاتی قدریں کے عنوان سے بھی لکھی۔ غالب کی صد سالہ برسی کے دوران ڈاکٹر شکیل الرحمٰن نے بھی ایک مطالعہ شایع کیا تھا جس کا عنوان "غالب اور جمالیات" ہے۔

علمی و ادبی ادارے :

۱۹۴۷ء کے بعد سرینگر ، جموں اور بعض اضلاعی منتقہ میں بھی کئی ادارے قائم ہوئے ، جن کے کاروبار کا ذریعہ اردو رہا۔ بعض ادارے اردو ادب کی خدمت ہی کے مقصد سے قائم کئے گئے تھے ، اور بعض اصلاحی رہنا ہی یا امدادی تھے۔ ان میں انجمن نصرت الاسلام کا ادارہ برابر کارگذار رہا اور اب بھی اس کے سالانہ اجلاس اسی طرح شاندار پیمانے پر منعقد ہوئے ہیں اور ان میں تقریروں ، مضامین اور نظم خوانی کا سلسلہ بھی برقرار ہے۔ اس کے اہتمام سے اب کئی مدارس چل رہے ہیں۔

انجمن ترقی پسند مصنفین ، جو ۱۹۴۷ء سے قبل قائم ہوئی تھی ، ۱۹۴۷ء کے بعد بھی کچھ عرصہ اسی نام سے کام کرتی رہی ، بعد میں اس کے اراکین ، کلچرل فرنٹ ، کلچرل کانگریس اور اس کی مختلف اکائیوں ، تھیٹر ، اور آرٹ میں کے کام میں زیادہ گتھ گئے اور رفتہ رفتہ اس انجمن کی کارکردگی کم ہوتی گئی۔ انجمن کی ایک شاخ ینگ رائٹرس ایسوسی ایشن کے نام سے بھی قائم ہوئی تھی۔ اور اس کا مقصد خاص طور پر نوجوان لکھنے والوں میں ترقی پسند ادب کی تحریک کو فروغ دینا تھا۔

نخابار کے ... نے ۱۹۵۷ء کے قریب ... قائم کی تھی جس کے

بانی مشہور سیاسی کارکن بہاؤالدین زاہد تھے۔ خواجہ غلام محمد صادق ریٹائرڈ اور کئی سیاسی رہنما اس کے ہمدردوں اور موئیدین میں تھے۔ اس کے ارکان میں پشکر ناتھ برج پریمی، حکیم منظور، بیج بہادر بھان، وحید احمد، طاہر مضطر، بدرالدین، محی الدین شال وغیرہ شامل تھے۔ اس کی مجلسیں منعقد ہوئیں جن میں شاہیر ادب دوست، جیسے دینا ناتھ نادم، رحمٰن راہی، غلام نبی فراق، شمیم احمد شمیم حصہ لیتے تھے۔

اسی زمانے میں ایک انجمن ہندی مسند کے نام سے بھی قایم ہوئی تھی لیکن اس کے جلسوں میں اردو ہی میں مضامین اور کہانیاں پڑھی جاتیں اور کلام پیش ہوتا تھا۔ اس کا دفتر محلہ گنپت یار میں تھا۔ مسند کے صدر وسنت کمار تیمبو تھے جو ہندی کے شاعر تھے۔ برج پریمی اس کے سیکرٹری منتخب ہوئے تھے۔ اراکین میں رادھا کشن بے کس، پرتھوی ناتھ جوتشی، سوم ناتھ بالی، شیدا دلی، موہن رینہ، راج دلاری، بے کشوری، دوارکا ناتھ جلالی، راج کمل اور کچھ اور نوجوان تھے۔

انجمن ارباب ذوق ایک اور ادبی ادارہ تھا جو ۱۹۵۰ء میں سرینگر چند اہل ذوق نوجوانوں نے قایم کیا تھا۔ اس کے سرگرم اراکین میں تیج بہادر بھان، پشکر ناتھ، حکیم منظور، برج پریمی، محی الدین شال، محمود ہدہ خشی اور چند اور نوجوان ادیب شامل تھے۔ یہ نوجوان دراصل پہلے حلقہ علم وادب کے ساتھ تھے، لیکن بعد میں انہوں نے اپنے نوجوان حوصلوں کی تربیت کے لئے یہ انجمن علیحدہ بنالی تھی۔ اس کا مرکز زینہ کدل میں تھا اور کچھ عرصہ تک انجمن نہایت سرگرمی سے کام کرتی رہی۔ اس کے جلسے باضابطگی کے ساتھ منعقد ہوتے تھے، جن میں مضامین اور افسانے پیش کئے جاتے اور شعرا اپنا کلام سناتے تھے۔ ریاست کے ارباب ذوق انجمن کے جلسوں میں تقریر یا کلام سنانے کے لئے مدعو کئے جاتے اور بیرون ریاست سے آنے والے ادیب اور شاعر بھی اس کے جلسوں میں شرکت کرتے تھے۔ انجمن نے کچھ مشاعرے اور موسیقی کی محفلیں بھی وسیع پیمانے پر منعقد کی تھیں کشمیر کی کچھ پرانی انجمنوں کی روایت کو برقرار رکھنے کے لئے اس انجمن کی محفلیں مغل باغات میں بھی منعقد کی جاتی تھیں۔

انجمن ادب کے نام سے ایک انجمن بڈگام میں قایم ہوئی تھی۔ اس کے جلسے بھی باضابطگی سے منعقد ہوتے تھے جن میں بڈگام کے اہل ذوق ادیبوں اور شاعروں کے علاوہ سرینگر اور دوسرے مقامات کے ادیب اور شاعر بھی شرکت کرتے تھے۔ اس انجمن کی تشکیل میں فاروق بڈگامی، شاہد بڈگامی، غلام حسن نجوی، سید اکبر ہاشمی

ڈاکٹر جانکی ناتھ در، موتی لال ساقی، پریم ناتھ شاد، برج پریمی وغیرہ کی مساعی کو دخل تھا۔ انجمن کے ادبی جلسوں میں کشمیری اور اردو دونوں زبانوں میں مضامین پڑھے جاتے، افسانے اور نظمیں پیش کی جاتی تھیں، اور ان کے بارے میں اظہار خیال بھی کیا جاتا تھا۔

انجمن ترقی اردو ادب ۱۹۵۵ء میں قایم ہوئی تھی۔ کئی صاحب ذوق ادیب اور شاعر اس کی رکنیت میں شامل تھے اور اس کے جلسے باضابطہ ہوا کرتے۔ جلسوں میں افسانے اور تنقیدی مضامین کے علاوہ غزلیں اور نظمیں بھی پڑھی جاتیں اور ان کے بارے میں اظہار خیال کیا جاتا۔ غلام محمد جانباز نے اس کی ایک مجلس میں کرشن چندر کے ناول "جب کھیت جاگے" پر تبصرہ لکھ کر پڑھا تھا، جو بعد میں "پرتاپ" (شمارہ دسمبر ۱۹۵۸ء) میں شایع ہوا۔

سیمابی ادبی انجمن کی طرف شہزور کاشمیری کے حالات میں اشارہ کیا گیا تھا۔ اس انجمن کا انگریزی نام سیماب لیٹری سوسائٹی تھا۔ اس ادارہ کا قیام ۱۹۴۹ء کے اواخر میں سیماب اکبرآبادی کے تلامذہ میں خاص طور پر شہزور کاشمیری اور خموش سرحدی پیش پیش تھے۔ انجمن کے اغراض و مقاصد پر "وکیل" ہفتہ وار، سرینگر کے ایک اداریہ میں روشنی ڈالی گئی تھی، اور لکھا تھا کہ کشمیر میں کئی اردو اخبار شایع ہوتے ہیں، لیکن ان کی توجہ ادب سے زیادہ سیاست کی طرف ہے، اس لئے:

> "یہاں کے حلقہ ہائے علم و فن مدت سے ضرورت محسوس کر رہے ہیں کہ کشمیر میں اردو ادب کے لئے سازگار ماحول پیدا کیا جائے۔"

"وکیل" نے سیمابی ادبی انجمن کے ترجمان کی حیثیت سے اپنی خدمات بھی پیش کی تھیں۔ انجمن کے صدر شہزور کاشمیری معتمد لکھن لال محو اور خزانہ دار پنڈت جگناتھ خبیری نشتر منتخب ہوئے تھے۔ انجمن کے زیر اہتمام شعری محفلیں منعقد ہوتی تھیں اور وسیع پیمانے پر مشاعروں کا بھی اہتمام کیا جاتا تھا۔

کشمیر بزم ادب ۱۹۵۲ء میں قایم ہوئی تھی جس کے سرگرم اراکین میں ملک کے چوٹی کے ادیب اور شاعر شامل تھے۔ پروفیسر محی الدین اور مرزا غلام حسن بیگ عارف ان میں خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ اس بزم کے اہتمام سے علمی اور ادبی محفلیں منعقد ہوتی تھیں، جن میں شعراء اور ادیب اپنا کلام، افسانے اور تنقیدی مضامین پڑھ کر سناتے اور ان کے حسن و قبح پر گفتگو ہوتی۔ بزم کی جانب سے ایک رسالہ "گلریز" اردو اور کشمیری دونوں زبانوں

میں شایع ہوتا تھا۔

جھرنا ادبی سنگم، علم و ادب سے ایک دلچسپی رکھنے والے نوجوان قاضی نفیر فرخ کی کوششوں سے قایم ہوا تھا، اور بعد میں اس کی افادیت کو وسیع کرنے کے مقصد سے اس کی ایک مجلس انتظامی بنا دی گئی تھی جس میں یونیورسٹی اور کالجوں کے کچھ اساتذہ اردو اور چند دوسرے علم و ادب سے دلچسپی رکھنے والے اصحاب بھی شامل تھے۔ سنگم کی جانب سے ایک ماہ نامہ "جھرنا" کے نام سے جاری ہوا تھا جس میں علمی اور ادبی مضامین، تنقیدیں اور افسانے شایع ہوتے تھے۔ سنگم کے پیش نظر وسیع پیمانے پر اشاعت کا ایک نظام نامہ بھی تھا لیکن سنگم کا کام ایک سال سے زیادہ عرصہ تک جاری نہ رہ سکا۔

کلچرل فورم، شمیم احمد شمیم ہفت روزنامہ "آئینہ" کی کوششوں کا نتیجہ تھا۔ بخشی غلام محمد اس کے سرپرست چنے گئے تھے۔

کشمیر کلچرل سوسائٹی، پنڈت پریم ناتھ بزاز، کنہیا لال ایڈوکیٹ اور شمیم احمد شمیم کی مساعی سے ۱۹۶۶ء میں قایم ہوئی تھی۔ اس کے اہتمام میں کشمیر کی تہذیب اور ثقافت پر گفتگو کرنے کے لئے جلسے منعقد کئے جاتے اور ان جلسوں میں اردو اور انگریزی میں تقریریں ہوتیں۔ یہ تقریریں "آئینہ" میں شایع ہوئی ہیں۔ انگریزی میں ان تقریروں کا ایک مختصر مجموعہ شایع ہوا ہے۔[1]

کشمیر کلچرل لیگ، ۱۹۶۹ء میں قایم ہوئی، میرزا غلام حسن بیگ عارف اور مکھن لال مومند گار مدیر "خدمت" اس کے سربراہ ہیں۔ لیگ کے جلسوں میں کشمیر کی تہذیب، ثقافت اور ادبی مسایل پر تقریریں ہوتی ہیں۔

ان اداروں کے علاوہ یونیورسٹی کے شعبہ اردو اور کالجوں میں بزم ادب قایم ہیں۔ یونیورسٹی کی بزم ادب بہت پرانی بزم ہے۔ طلبا اور اساتذہ دونوں اس کے جلسوں میں حصہ لیتے ہیں۔ طلبا اور طالبات اپنی تخلیقات پیش کرتے ہیں اور ان کے بارے میں اظہار خیال کیا جاتا ہے۔ بزم کی سرپرستی میں مشاہیر ادب اور اساتذہ کی تقریریں بھی ہوتی ہیں چنانچہ پروفیسر آل احمد سرور، پروفیسر خواجہ احمد فاروقی، پروفیسر اختر اورینوی، صالحہ عابد حسین، ڈاکٹر ثریا، اظہار حسین، ڈاکٹر معین احسن جذبی، رضیہ سجاد ظہیر، سید سجاد ظہیر، علی سردار جعفری، ڈاکٹر عابد حسین

---

[1] اس سوسائٹی کا طرف اسے تی جلسے بھی منعقد ہوگا

کو بزم نے دفعتاً فوقتاً مدعو کیا اور ان کی تقریروں یا کلام سے استفادہ کیا۔ بزم کے مشیر اساتذہ ہوتے ہیں اور اس کے عہدہ دار طلبا ہی میں سے منتخب کئے جاتے ہیں۔ شعبہ کے صدر اس بزم کے نگران ہیں۔

آل جموں و کشمیر ٹیچرز ایسوسی ایشن ریاست کے سکولوں کے اساتذہ کا ایک ادارہ ہے جس کا مقصد اساتذہ کے درمیان تبادلہ خیال کے لئے ایک فورم مہیا کرنا اور ان کی فلاح و بہبودی کے مسایل پر غور کرنا ہے۔ اساتذہ کے مطالبات عہدہ داروں کے سامنے اجتماعی مطالبات کے طور پر پیش کئے جاتے ہیں۔ اساتذہ کی کانفرنسیں بھی منعقد ہوتی ہیں۔ ایسوسی ایشن کی جانب سے ایک ترجمان "استاد" کے نام سے شایع ہوتا ہے جس میں اساتذہ کے مضامین، افسانے اور ان کا کلام شایع ہوتا ہے۔ یہ ایسوسی ایشن سب سے پہلے ۱۹۴۲ء میں قایم ہوئی تھی، بہت سے انقلابات سے گزر کر اب بھی یہ برسرِ کار ہے۔

جموں میں اس وقت کئی علمی اور ادبی انجمنیں اور ادارے قایم ہیں اور اردو شعر و ادب کی خدمت شایستہ طور پر انجام دے رہے ہیں۔ بزم فروغ اردو اکتوبر ۱۹۶۳ء میں قایم ہوئی تھی۔ اس کے اغراض و مقاصد میں "اردو زبان اور ادب کو فروغ دینا اور صحت مند، جاندار، صالح اور تعمیری ادب کی تخلیق" کی ہمت افزائی کرنا ہے۔ اس کے سرگرم اراکین میں مکیش کاشمیری، منظر اعظمی، مالک رام آنند، دیانند کپور، چودھری دینا ناتھ رفیق، راجیش گوہر، ہر بھگوان شاد، لیش سروج، نند گوپال باوا، گردھاری لال آنند تمنا، وریندر رجبوال، قادر حسین مجروح، تنویر بھدرواہی، ساغر نسیم حسرت، گیان چند شرما، فاروق درانی، اکرام حسین، منشی رام شرما شامل ہیں۔ ان کے علاوہ دوسرے ادب دوستوں جیسے ڈاکٹر گیان چند جین، صدر شعبہ اردو، جموں یونیورسٹی، عشرت کاشمیری، پروفیسر بی۔ ڈی۔ مل شرما، پشکر ناتھ، وسیم اختر، منگو رام وفا، مدن موہن شرما، دیانند شرما، اوم پرکاش بالی، وجے سوری کی اعانت اور مشورے بھی اسے حاصل ہیں۔ منظر اعظمی، لکچرار اردو جموں یونیورسٹی اس کے صدر ہیں اور نور الزماں صدیقی انور اس کے جنرل سیکرٹری۔

بزم کے زیر اہتمام ہفتہ وار ادبی محفلیں منعقد ہوتی ہیں جن میں ادیب اور شاعر اپنی تخلیقات پیش کرتے ہیں۔ جموں آنے والے ادبی مشاہیر کو بھی بزم مدعو کر کے ان کے خیالات سے استفادہ کرتی رہتی ہے۔ بزم نے ۱۹۶۵ء میں اراکین کی تخلیقات کا ایک مجموعہ "منتخب ادب" کے نام سے شایع کیا۔ یہ مجموعہ بزم کی کاروائیوں

کے بارے میں ایک رپورتاژ کے علاوہ حسب ذیل تخلیقات پر مشتمل ہے۔

ناصر حسین قریشی۔ اقبال کی انقلابی شاعری

مالک رام آنند۔ افسانہ "جانے وہ کیسے لوگ تھے"

لیش سروج۔ " امرت جیسا زہر

نورالزمان صدیقی۔ " لت

راجیش گوہر۔ " پونم کا چاند

نند گوپال باوا۔ " آخری خواہش

کشوری منچندہ۔ " سیاہی

گیان چند شرما۔ " فریب

ساغر نسیم۔ " اشکوں کی دنیا

قادر حسین مجروح۔ " قلی

منظوم افکار میں جوش ملیانی، مست گنوری، پورن سنگھ ہنر، رکھو بیر داس ساحر سیالکوٹی، سورج کنول سرور، منوہر لال ولی، حکیم منظور، محمود حسین محمود، تنویر بھدرواہی، عشرت کاشمیری اور دوسرے اراکین کا کلام شامل ہے۔

انجمن ادب، جموں ۲۶، فروری ۱۹۶۷ء میں قایم ہوئی، اور اس کے مقاصد میں اردو کے علاوہ ہندی کے ادب کو بھی فروغ دینا ہے۔ انجمن کے زیر اہتمام ادبی مقابلے اور مشاعرے منعقد ہوتے ہیں اور ہفت روزہ ادبی جلسے بھی جاری ہیں۔ اس کی شاخیں پونچھ، کٹھوعہ، ریاسی، اکھنور، کٹڑہ، میں بھی قایم ہیں۔ انجمن کے سلسلۂ اشاعتی پروگرام بھی ہے۔ اور ایک مجموعے "زخم بہاراں" کی اشاعت کا اعلان کیا گیا ہے جو جموں اور ادھم پور کے شعرا کے کلام کا منتخب مجموعہ ہے۔ انجمن کے صدر سریندر ساجد، نائب صدر انجم ادھم پوری، جنرل سیکرٹری مدن موہن عاقل، سیکرٹری جگل کشور غافل ہیں اور اراکین بلراج کمار ساز، کلدیپ صابر، ارون کمار نظمی، لیش کمار سوز ہیں۔

ایک اور فعال اور کارگزار ادارہ مکتبہ ادارہ ادب، جموں ہے، جس کے ناظم اعلیٰ [illegible] سید ہیں اور

اراکین میں جموں کے اکثر صاحب ذوق ادیب اور شاعر شامل ہیں۔ عرش صہبائی اور عابد مناوری اس ادارہ کے روح رواں ہیں۔ مکتبہ کی جانب سے معاصر شعرا کے حالات اور منتخب کلام کا ایک مجموعہ "انجم کدہ" شایع ہوا ہے جسے عرش نے مرتب کیا ہے۔ اس کی اشاعت کا سنہ ۱۹۶۳ء ہے اس میں حسب ذیل کتابوں کی اشاعت کا اعلان کیا گیا ہے۔

اندرجیت لطف۔ بربط دل

چشم نیم باز۔ عرش صہبائی

رہبر جدید۔ خیاباں

عابد مناوری۔ موجِ صبا

ایلین کھوسلہ۔ زہر آب

وجے سوری۔ خلش (ناول)

ایک افسانوں کا مجموعہ جس کا عنوان ہے۔ "انجام سے آغاز تک"

کلچرل اکادمی جس کا پورا نام اکادمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لینگویجز ہے ۱۹۵۸ء میں ریاست میں عروج زبانوں اردو، کشمیری، ڈوگری، پنجابی، لداخی، دردی، بلتی وغیرہ کو فروغ دینے کے مقصد سے قائم ہوئی۔ یہ معتبر سرکاری ادارہ ہے جس کے سیکرٹری، میرزا کمال الدین شیدا، علی جواد زیدی، پروفیسر جیا لعل کول رہ چکے ہیں اور اس وقت نیلا مبر دیو شرما ہیں۔ علی محمد لون اور محمد یوسف ٹینگ اس کے ڈپٹی سیکرٹری ہیں۔ وزیر اعلیٰ بہ حیثیت عہدہ اس کے صدر ہوتے ہیں۔

اکادمی کی ایک جنرل کونسل ہے جس کے صدر وزیر اعلیٰ اور اراکین میں کئی علم دوست عہدہ دار اور اصحاب شامل ہیں۔ ہر زبان کے لئے ایک مشاورتی مجلس مقرر ہے، اور اکادمی کا اشاعتی پروگرام ہر زبان کے لئے ہر سال تجویز کیا جاتا ہے۔ ہر زبان میں ایک دو ماہی رسالہ "شیرازہ" بھی لازمی طور پر نکالا جاتا ہے۔ اردو "شیرازہ" کا ذکر اس باب میں صحافت کے تحت کیا جا رہا ہے۔ اس کے علاوہ فی الحال

ذیل کے کتابچے یا تصانیف اردو میں شایع ہو چکی ہیں۔

۱۔ کشمیری زبان اردو شاعری۔ مرتبہ عبدالاحد آزاد (۳ جلدوں میں)

۲۔ کلام کشمیری ان رسالوں کی تفصیل حصہ تصانیف میں دی جا چکی ہے۔ یہ سب رسالے کشمیری زبان اور ادب کے بارے میں ہیں، اور ان کے ذریعہ کشمیری شعرا کو وسیع تر ادبی حلقوں سے روشناس کرانے کی کوشش کی گئی ہے۔

اکادمی کے سالنامہ "ہمارا ادب" کا تذکرہ بھی گزر چکا ہے۔

اکادمی کے زیر اہتمام، وسیع پیمانے پر کل ہند مشاعرے بھی منعقد کئے جاتے ہیں۔ اور ان میں شرکت کے لئے چوٹی کے شعرا کو مدعو کیا جاتا ہے۔ گزشتہ برسوں میں کچھ سیمپوزیم بھی منعقد ہوئے جن میں سے ایک مولانا ابوالکلام آزاد کے بارے میں تھا۔ اس سیمپوزیم کے مقالے بھی اکٹھے شایع کئے گئے ہیں۔

اکادمی نے ابھی تک اردو ادب کے بارے میں کسی اشاعتی تجویز کو ہاتھ میں نہیں لیا، تاہم ریاست کے اردو ادیبوں اور شاعروں کو اپنی ادبی تخلیقات، جیسے افسانوں کے مجموعے، ناول، کلام کے مجموعے شایع کرنے کے لئے رقمی امداد عطا کرتی ہے۔ اسی ضمن میں دو ادبی تنقیدی اور تاریخی تصانیف "کشمیر میں فارسی ادب کی تاریخ" اور "اردو نظم پر پوربی اثرات" جو ڈاکٹر حبیب اللہ حامدی کاشمیری کا ڈاکٹریٹ کا مقالہ ہے شایع ہو چکے ہیں۔ اس کے علاوہ ہر سال ریاست کے لکھنے والوں کی سال کی بہترین تصانیف پر ایک یا دو انعامات بھی دیئے جاتے ہیں۔[1]

ڈوگری سنستھا، ڈوگری زبان اور ادب کی ترقی اور اشاعت کے مقصد سے ۱۹۴۳ء میں جموں میں قایم ہوئی۔ یہ ایک غیر سرکاری ادارہ ہے، جس کے ارکان ڈوگری کے ادیب اور شاعر ہیں۔ اس سنستھا کے کاموں کا جو جایزہ ۱۹۴۳ء سے لے کر ۱۹۶۱ء کی تفصیلات پر مشتمل ہے، اردو ہی میں شایع ہوا ہے، اس میں اس بارے میں تھوڑی تفصیل دی گئی ہے، جس کا اقتباس حسب ذیل ہے۔

"ڈوگری سنستھا کا چراغ اس وقت زمانے کی دہلیز پر روشن ہوا، اسے جوان حوصلوں کا شمعدان ملا، جس پر جل کر اس نے ماضی کے دھندلکوں کو مٹایا، اور اپنے ثقافتی ورثہ کی دلکش داستان کو منظر عام پر لانے میں کوشاں ہے اور مستقبل میں قوم کے لئے

---

[1] دیکھئے ضمیمہ

ایک نئی جمہوری طرز کی زندگی کے ارتقا کے لئے قوم کے پہلوؤں میں ادبی اور فنی صلاحیتیں اجاگر کرنے لگا۔"

آل جموں و کشمیر انجمن تبلیغ الاسلام کے نام سے ایک ادارہ حضرت سید میرک شاہ کاشانی (شالامار) کی سرپرستی میں سرینگر میں قایم ہے۔ اس انجمن کے مقاصد میں اسلام کی صحیح تعلیمات کو عام کرنا اور غلط اور گمراہ کن عقاید کی اصلاح ہے۔ انجمن کا ترجمان "التبلیغ" کے نام سے شایع ہوتا ہے۔ جس میں زیادہ تر اسلام مذہب، ثقافت اور تاریخ کے بارے میں مضامین شایع ہوتے ہیں۔

جامع نورالٰہی عربی اور فارسی کے عالم مولوی نور الٰہی کے فرزند عبدالحی نے قایم کیا ہے۔ ایک کالج جو اردو کالج کے نام سے موسوم ہے، جامعہ کشمیر اور جامعہ اردو علی گڑھ کے اردو امتحانات کے لئے لڑکیوں کی تعلیم تدریس کے لئے قایم ہے۔ ایک رسالہ بھی "نورالٰہی" کے نام سے شایع ہوتا ہے، جس میں زیادہ تر کالج کی طالبات کے درسی موضوعات اور کتابوں پر نوٹ اور مضامین شایع ہوتے ہیں۔

کاشُر بزم ادب کے نام سے دہلی میں مقیم کشمیری ادب دوستوں نے اگست ۱۹۵۷ء میں قایم کی تھی۔ اس کے صدر مشہور افسانہ نگار پریم ناتھ در اور نایب صدر علی محمد طارق، سرور امر سنگھ جنرل سیکرٹری، بشمبر ناتھ کول جوائنٹ سیکرٹری، سومناتھ سادھو اشاعتی سیکرٹری، اقبال کشن کول خزانچی، ارجن ناتھ کول کتب خانہ دار، اور اراکین مجلس انتظامی میں جانکی بھان، شمبھوناتھ بٹ، شنکر ناتھ کول، ڈاکٹر رادھا کشن پارمو، پریم ناتھ کول، محمد مقبول اور منوہر کول تھے۔ بزم کی جانب سے اردو اور کشمیری کا ایک دوماہی ترجمان "پمپوش" شایع ہوتا تھا۔ اس کا ایک حصہ ہندی کے لئے بھی وقف تھا۔ یہ رسالہ کچھ عرصہ جاری رہا۔

صحافت | رسایل:-

جموں و کشمیر میں اردو ادب کا ذوق رکھنے والے اہل قلم لوگوں کی کثرت اور ان کے شوق کے نتیجے کے طور پر اس صدی کی تیسری دھائی سے اخباروں کے ساتھ ساتھ رسالے یا ماہنامے بھی کافی تعداد میں نکلنے رہے [illegible] جن میں سے چند کا ذکر پچھلے [illegible] گزشتہ ایک باب میں گزر چکا ہے۔

موجودہ عہد میں رسایل کی تعداد میں بہت اضافہ ہوا۔ ان میں بہت سے ایسے ہیں جنہیں عام اہل ذوق حضرات نکالتے ہیں۔ کچھ سرکاری رسایل بھی ہیں اور کئی رسالے ریاست کے علمی اور ادبی اداروں سے شایع ہو رہے ہیں۔ ان کی تفصیل ذیل میں درج کی جاتی ہے۔

(۱) عام ادبی اور علمی رسایل :۔

(۱) "ہما" ۱۹۵۲ء سے سرینگر سے شایع ہونے لگا تھا۔ اس کے مدیر ظفر کیلی تھے۔ رسالے کے چار یا پانچ شماروں سے زیادہ نہ نکل سکے۔ اس میں علمی اور ادبی مضامین اور افسانوں کے علاوہ منظومات بھی شایع ہوتے تھے۔

(۲) آزاد بھی ۱۹۵۲ء سے نکلنے لگا تھا۔ اس کے مدیر بدری ناتھ کول، مالک نشاط پریس تھے۔

(۳) سویرا۔ جموں سے ویدراہی اور وید گپتا کی ادارت میں نکلتا رہا۔

(۴) رتن۔ جموں سے ملک راج صراف نکالتے تھے یہ بچوں کے لئے مخصوص تھا۔

(۵) پریم۔ یہ رسالہ نرسنگھ داس نرگس کی ادارت میں شایع ہوتا ہے۔ نرگس کے ان رسالوں نے جموں و کشمیر کے اہل قلم حضرات کے لئے ایک اچھا فورم فراہم کر دیا تھا۔ یہ رسالے، جیسا کہ اس سے پہلے لکھا جا چکا ہے، ملک بھر میں مقبول تھے۔ خاص طور پر "رتن" میں لکھنے کے شوق نے ریاست کے بہت سے نوجوان لکھنے والوں کی ہمت افزائی کی اور وہ جلد ہی اچھے انشاپرداز یا شاعر کی حیثیت سے منظر عام پر آئے۔ ان رسالوں کے لکھنے والوں میں تقریباً سارے ملک کے مشہور اہل قلم شامل تھے۔ ریاست کے لکھنے والوں میں گلزار احمد فدا، دیا کرشن گردش، شو منہاس، کیف اسرائیلی، محمود ہاشمی، صادق کشمیری، معراج الدین احمد، غلام حیدر خاں کشتی، محبوبہ یاسمین، اور خود نرگس کے فرزند اقبال تمنائی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

(۶) خاتون۔ کے نام سے سرینگر سے ایک ماہ نامہ اگست ۱۹۶۵ء میں نکلنے لگا تھا۔ اس کی مدیر فہمیدہ بیگم تھیں، اس کے ایک دو شماروں سے زیادہ شایع نہ ہو سکے۔ اس کے لکھنے والوں میں شمیم انوار، رشیدہ قریشی نشاط جمانی، کشور سلطانہ، شمیم فدا وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

(۷) گوجر دیس، اقبال عظیم کی ادارت میں جموں سے ۱۹۶۵ء میں نکلا تھا۔ یہ ماہ نامہ وقفوں کے ساتھ ۱۹۶۹ء تک شایع ہوتا رہا۔ یہ رسالہ اس اعتبار سے نہایت اہم تھا کہ ریاست کے گوجر طبقے کے مفاد کیلئے وقف تھا۔ اس اہم طبقے کی زندگی اور زبان اور ادب کے بارے میں ہماری معلومات بہت محدود ہیں۔ اس میں پڑھے لکھے لوگ بہت کم ہیں۔ رسالے میں گوجر طبقے کی قدیم تاریخ اور ان کے ادبی آثار کی کھوج کر کے مفید معلومات شایع کی جاتی تھیں۔ اس رسالے میں زیادہ تر گوجر مشاہیر لکھا کرتے تھے جن کے ادبی اور شعری افکار بھی اس میں شایع ہوتی رہیں۔ ان میں سے چند کے نام یہ ہیں:۔ سرور کسانہ، ایڈیٹر قومی آواز جموں، چوہدری محمد شفیع کھٹانہ، ڈپٹی چیرمین مجلس قانون ساز، جو ریاست میں نائب وزیر بھی رہے، رانا علی حسن چوہان، چوہدری غلام احمد رضا، چودھری دیوان علی خاں کھٹانہ، چوہدری بلند خان، ریاسی، میاں نظام الدین لاروی سجادہ نشین درگاہ باباجی نظام آباد (وانگت، کشمیر)

شعرا میں جن کے افکار رسالے کے مختلف شماروں میں شایع ہوئے ہیں حسب ذیل قابل ذکر ہیں:
اقبال عظیم، نون پونچھی، خدا بخش زار، سائیں قادر بخش، محمد اسرائیل مہجور، عبدالقیوم سوز ہزاروی، چونی لال شعلہ مولوی محمد اسمٰعیل ذبیح راجوروی، محمد اسرائیل اثر، چوہدری حسن الدین حسن پونچھی، چودھری محمد شریف بن باسی، چوہدری محمد علی صابر بھاٹرو، محمد اسمٰعیل مہجور، نواں شہر، حاجی علیم الدین کٹاریہ، چوہدری محمد صادق، میاں جاوید نظامی۔ رسالے میں گوجر طبقے کے بارے معلومات کے علاوہ ان کے لوک گیت، سی حرفیاں اور دوسری اصناف کے نمونے بھی شایع ہوئے ہیں۔

(۸) نگینہ، ۱۹۶۷ء سے شایع ہو رہا ہے۔ اس کے مدیر وحشی سعید ساحل اچھا ادبی ذوق رکھتے ہیں۔ یہ افسانہ نگار، ناول نگار اور مضمون نگار بھی ہیں۔ ان کے حالات پچھلے باب میں لکھے جا چکے ہیں۔ اس رسالے کے لکھنے والوں میں کئی نئے نام، جیسے مجید ارجمند کشمیری، ارمان کشمیری، ناشاد کشمیری، ہمارے سامنے آتے ہیں۔ رسالے میں علمی اور ادبی مضامین کے علاوہ غزلیں اور نظمیں بھی شایع ہوتی ہیں۔ اس کے کچھ خاص نمبر بھی نکلے، جن میں سے افسانہ نمبر جو مئی ۱۹۶۸ء میں شایع ہوا تھا، خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ ادھر کچھ عرصے سے رسالے میں فلمی خبریں، تفصیلات اور تبصرے بھی شایع ہونے لگے ہیں [1]

---

[1] : رسالوں کے سلسلے میں سنگم کا نمونہ بھی قابل ذکر ہے۔ یہ رسالہ موہن یاور کی ادارت میں شایع ہوتا تھا۔

(ب) علمی اور ادبی اداروں کے رسالے :۔

ان میں "گلریز"، "کونگ پوش" اور "کاروان"۔ "گلریز" کشمیر بزم ادب کا ترجمان تھا۔ اس کے بانی مرزا غلام حسن بیگ عارف تھے۔ یہ ۱۹۵۲ء میں جاری ہوا تھا۔ اس کے مدیر ابتدا میں محمد صدیق کیروی تھے۔ اس کا ذکر بھی گزر چکا ہے، لیکن اس کی ترتیب کا کام پروفیسر محی الدین حاجنی انجام دیتے تھے۔ بعد میں محمد امین کامل اس کے مدیر رہے۔ عبدالحق برق اور ڈاکٹر عزیز احمد بھی اس کے ادارے میں شامل رہے تھے۔ "گلریز" کے مستقل لکھنے والوں میں مرزا غلام حسن بیگ عارف، شوریدہ کاشمیری، تنہا انصاری، محمد امین کچھو، شہزور کاشمیری، راجہ محمد یعقوب خان، عزیز کاشمیری، حبیب کامران، علی محمد لون، امیش کول، پردیسی، سوم ناتھ زتشی، نور محمد روشن وغیرہ سب اہل قلم ہیں۔ یہ رسالہ ۱۹۵۵ء تک جاری رہا۔

کونگ پوش، جون ۱۹۵۰ء سے نکلنے لگا تھا۔ علی محمد لون، غلام رسول نازکی اور غلام نبی فراق کے علاوہ پنڈت دینا ناتھ نادم، غلام احمد مہجور اور مرزا غلام حسن بیگ عارف نے بھی اس کی ادارت کے فرائض انجام دیتے تھے۔ کچھ عرصہ کے بعد جب یہ ماہنامہ بند ہو گیا تو اس کی جگہ "کاروان" جاری کیا گیا، لیکن یہ بھی زیادہ عرصہ تک جاری نہ رہ سکا۔ "کونگ پوش" اور یہ رسالہ اردو اور کشمیری دونوں زبانوں میں نکلتا تھا۔ "کونگ پوش" انجمن ترقی پسند مصنفین کا ترجمان تھا۔ عزیز ہارون نے بھی اس کی ترتیب کی خدمات انجام دیں۔[۱]

"شیرازہ" کلچرل اکادمی کا دو ماہی رسالہ ۱۹۶۲ء میں جاری ہوا، اور تھوڑے عرصے کے اندر اندر اس رسالے کو ملک بھر کے علمی اور ادبی رسالوں میں مقبولیت اور ایک بلند مقام حاصل ہو گیا۔ اس کے پہلے مدیر محمد یوسف ٹینگ تھے اور وہی اب تک اسکو ترتیب دے رہے ہیں، لیکن علی جواد زیدی کلچرل اکیڈیمی سے وابستگی کے زمانے میں اس کے نگران تھے، جن کے بارے میں لکھا جا چکا ہے۔ گزشتہ چھ سات برس کے عرصہ میں اس رسالے نے اردو علم و ادب کی خدمت کے ساتھ ساتھ کشمیری ادب کو بھی روشناس کرانے کا اہم فرض انجام دیا۔ اس میں جموں اور کشمیر کے علاوہ باہر کے لکھنے والوں کے افکار بھی شایع ہوتے ہیں، اور عموماً ان کا معیار بلند ہوتا ہے۔

"شیرازہ" نے بھی کئی خاص شمارے شایع کئے جن میں ڈاکٹر مہجور نمبر، ثقافت ہند نمبر، پنڈت نہرو نمبر

۱؎ ... [illegible] کونگ پوش [illegible] کلچرل کانفرنس کے ترجمان کی حیثیت سے دوبارہ جاری ہوا اور سال بھر تک شائع ہوتا رہا۔ اردو کونگ

اہم شمارے ہیں۔ اسی رسالے میں ابتدا سے اب تک جتنے مضامین، مقالے، افسانے، غزلیں اور نظمیں شایع کیں، ان کی ایک منتخب فہرست بھی بہت طویل ہو جاتی ہے۔

"جھرنا" ماہوار رسالہ جھرنا ادبی سنگم کی جانب سے ۱۹۶۶ء میں جاری ہوا تھا۔ ادبی سنگم ایک ادب دوست نوجوان، قاضی نصیر فرخ کی مساعی سے قایم ہوا تھا۔ جس کی مجلس انتظامی میں یونیورسٹی اور کالجوں کے کچھ اساتذہ اور کئی علم دوست اصحاب شامل تھے۔ جھرنا ایک سال تک شایع ہوتا رہا۔

"نور الحق" نام سے ایک رسالہ جامعہ نور الحق سے جاری ہوا ہے، جس کے بانی مولوی عبدالحق ہیں اور اس کے مدیرین میں مسعودہ امین اور رفعت تبسم شامل ہیں۔ جامع نور الحق کی سرپرستی میں اردو کالج بھی قایم ہے جس میں جامعہ اردو، علی گڑھ اور مطالعہ کشمیر کے اردو امتحانات کی تدریس ہوتی ہے۔

(ج) تعلیمی اداروں کے رسایل:

(۱) بسکو بیوگل۔ ٹنڈل بسکو میموریل سکول، سرینگر سے بہت عرصہ پہلے نکلنے لگا تھا۔ یہ اردو انگریزی اور ہندی تین زبانوں میں عموماً سالنامے کے طور پر شایع ہوتا رہا۔ اس کی ترتیب طالب علموں کے سپرد تھی، اور سکول کے استاد، عموماً ہیڈ ماسٹر اس کے نگران رہے۔ عرصہ کی خاموشی کے بعد ۱۹۷۰ء میں اس کا دوبارہ اجرا ہوا، اور یہ سکول کے ہیڈ ماسٹر پیر سلام الدین قادری کی دلچسپی اور مساعی کا نتیجہ ہے۔ اس شمارے کے مدیر سید وجاہت حسین ہیں۔

(۲) قاضی ناگ: سرکاری ہائر سیکنڈری سکول، ہندوارہ کے طلبا اور اساتذہ کی دلچسپی سے نکلنے لگا ہے۔ مئی ۱۹۶۶ء میں اس کا پہلا شمارہ شایع ہوا تھا، اس کے مدیر غلام رسول کمائی اور نگران غلام قادر شیخ مدرس تھے۔ یہ چار زبانوں اردو، کشمیری، ہندی اور انگریزی پر مشتمل ہوتا ہے۔ رسالے میں طلبا اور اساتذہ دونوں کے مضامین اور نظمیں شایع ہوتی ہیں۔

(۳) شالامار: سرکاری ہائر سیکنڈری سکول شالہ مار کا رسالہ جس کے حصہ اردو کے اڈیٹر جگناتھ نیبری رہے۔

(۴) کوثر ناگ کے نام سے شوپیاں ہائر سیکنڈری سکول کی جانب سے ایک رسالہ شایع ہو رہا ہے۔

(۵) نرجھر: ڈی۔اے۔وی ہائیر سیکنڈری سکول، سرینگر کے طلبہ کا رسالہ اردو، انگریزی اور ہندی تین زبانوں میں شایع ہوتا ہے۔

(د) تعلیمی رسایل: (۱) تعلیمی اور ادبی مسایل کے بارے میں اساتذہ کے خیالات کے اظہار کے لئے جو رسالے نکالے گئے ان میں "استاد" بہت اہمیت رکھتا ہے۔ یہ رسالہ ریاست کی انجمن اساتذہ (آل کشمیر ٹیچرس ایسوسی ایشن) کا ترجمان تھا، جس کے بانی پنڈت دینا ناتھ نادم تھے۔ نادم رسالے کے پہلے مدیر بھی رہے۔ ۱۹۵۶ء میں اس کا اجرا ہوا تھا اور اس کا ایک حصہ کشمیری پر بھی مشتمل ہوتا تھا۔ اس رسالے نے ریاست کے اساتذہ میں علمی، ادبی اور تعلیمی ذوق کو ابھارنے میں بڑا کام انجام دیا۔ اس کے مستقل لکھنے والوں میں گنگا دھر بھٹ دیہاتی، جگناتھ خیبری، جیالال پنڈتا، ارجن دیو جالا، برج پریمی، ارجن دیو مجبور، منظور ہاشمی، رسا جاودانی، شامل تھے۔ ان کے علاوہ غلام محمد قریشی، امین کامل، عبدالغنی پرے، پیرزادہ غلام محمد، اکبر جے پوری، خضر مغربی، نذ امینی، غلام نبی شاہ سہروردی، گوپی ناتھ رینہ، غلام محمد قریشی، محمد کاظم میر، غلام مصطفےٰ انصاری، ضیا پلوامہ، غلام محمود محمودی، موتی لال کول بیگم میاں اسد اللہ، کاشی ناتھ تکو، جانکی ناتھ سادھو، سورج رام کھجوریہ، شریف الدین شارق، حکیم چند سین، اقبال ناتھ ونچو، مقبول ندیم کاشمیری، غلام حسن (گلدورہ)، غلام احمد ہمدانی، گلشن آرا ہمدانی، غلام نبی عارض، رزمی ہاشمی، سعد اللہ شاد بھی شامل رہے۔ خواجہ غلام محمد صادق نے بھی اس کے لئے لکھا

رسالے میں جتنے تعلیمی، ادبی اور علمی مضامین، نظمیں اور غزلیں شایع ہوئیں، ان میں پائیدار نوعیت کے منتخب مضامین کی فہرست بھی بہت طویل ہو جاتی ہے۔ گنگا دھر بھٹ دیہاتی کے کئی مضامین، کچھ اچھی کہانیاں اور ایک آدھ ڈراما بھی اسی رسالے میں شایع ہوا۔ ماہ نامہ کی حیثیت سے جب یہ رسالہ موقوف ہو گیا تو اس کے بجائے "استاد" کے نام سے پندرہ روزہ نکالا گیا۔

(۲) ابتدائی تعلیم۔ جموں و کشمیر انسٹیوٹ آف ایجوکیشن کی جانب سے شایع ہوتا ہے۔ یہ سہ ماہی

رسالہ ہے ۱۹۶۴ء سے یہ شایع ہو رہا ہے۔ یہ تعلیمی مسایل سے بحث کرتا ہے اور اس میں اساتذہ اور محکمہ تعلیم کے عہدہ داروں کے مضامین چھپتے ہیں۔ اس کے مدیر محمد شفیع ہیں اور نگران ایم اے لہروال۔ اکثر مضامین تعلیم کے ابتدائی مراحل سے تعلق رکھتے ہیں، ریاست کے ابتدائی مدارس میں درس و تدریس میں مصروف اساتذہ کی دلچسپی کے مضامین، تعلیم کے بارے میں بدلتے ہوئے نظریوں اور تعلیمی فن کے جدید طریقوں سے اساتذہ کو واقف کرانا اس کا عظیم مقصد ہے۔ لہ

(۲) جدید تعلیم۔ کے نام سے ایک اور رسالہ بھی شایع ہوتا ہے۔ اور یہ بھی اساتذہ کے لیے مفید معلومات شایع کرتا ہے۔

(ھ) کالجوں کے رسایل: (۱) پرتاپ۔ سری پرتاپ کالج سرینگر کا رسالہ اس سلسلے کے رسایل میں سب سے قدیم ہے۔ یہ اس صدی کے تیسرے دہے سے نکلنے لگا تھا اور اب تک جاری ہے۔ اس رسالے کو کالج کے صاحب ذوق پرنسپل اور اساتذہ کی سرپرستی اور رہنمائی حاصل رہی۔ ڈاکٹر محمد دین تاثیر نے اس کے ابتدائی مراحل میں رہنمائی کی اور اساتذہ میں پروفیسر طیب شاہ صدیقی، شیخ پروفیسر محمد ابراہیم، پروفیسر کیول کشن بالی جیسے صاحب ذوق اہل قلم اس کے نگران اور مشیر رہے۔ اس کے ادیٹروں میں شمیم احمد شمیم، صادق علی امیر وغیرہ اس زمانے کی نمایاں شخصیتیں ہیں۔ پروفیسر محی الدین حاجنی کے کئی مضامین اس رسالے میں شایع ہوئے ہیں۔ رسالے میں لکھنے والے طلبا میں سے کئی اس زمانے کے اچھے انشا پردازوں اور شاعروں میں شمار ہوتے ہیں۔ ان میں غلام محمد شمیم، کنول نین پرواز، علی محمد لون، پریم ناتھ در، علی محمد خموش، اصغر یزدانی، غلام محمد تسنیم، حکیم شمسی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

۲۔ لالہ رخ۔ امر سنگھ کالج کا رسالہ اور دوسرا اہم رسالہ ہے۔ جس کو ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم پرنسپل کالج کی سرپرستی اور محمود ہاشمی، ظفر پیامی، قیصر قلندر جیسے انشا پردازوں اور شاعروں کی رہنمائی حاصل رہی۔ یہ رسالہ اس صدی کے چوتھے دہے سے نکلنے لگا تھا۔ اور اب تک شایع ہو رہا ہے۔ محمود ہاشمی کچھ عرصہ تک اس کے نگران رہے۔ مدیر طلبا میں سے چنے جاتے ہیں۔ ظفر پیامی اور قیصر قلندر اس کے مدیر

لہ یہ رسالہ اب شایع نہیں ہوتا۔

رہ چکے ہیں۔ اس میں طلبا کے علاوہ اساتذہ کے مضامین بھی شایع ہوتے ہیں۔

(۳) پمپوش :۔ زنانہ کالج سرینگر کی طالبات کا ترجمان ہے، جس کو کالج کی صاحب ذوق عالم صدر مس محمودہ احمد علی شاہ کی سرپرستی حاصل ہے۔ یہ رسالہ کافی ضخیم شایع ہوتا ہے۔ طالبات اور اساتذہ کے علاوہ اس میں بیرونی ادیبوں کے مضامین اور شعرا کی نظمیں اور غزلیں شایع ہوتی ہیں۔ رسالے کی مدیر طالبات ہوتی ہیں اور نگرانی اساتذہ میں سے کسی کے سپرد ہوتی ہے۔ حصہ اردو کی بلقیس فاطمہ استاد اردو رہ چکی ہیں۔ اس وقت مسز حامدی اس کی نگراں ہیں۔ غالب کی سو سالہ برسی کا شمارہ غالب کے بارے میں کئی معلومات آفریں مضامین پر مشتمل ہے۔ اس میں طالبات کی وہ غزلیں بھی شایع ہوئی ہیں جو انہوں نے غالب کی سو سالہ برسی کی تقریبات کے سلسلے میں غالب کی زمینوں میں لکھی تھیں۔

(۴) زون :۔ زنانہ کالج نواکدل کی طالبات کا رسالہ جیسے مسز شملہ مفتی پرنسپل کالج کی رہنمائی نصیب ہے۔ رسالے میں زیادہ تر طالبات لکھتی ہیں اور کبھی کبھی اساتذہ کے مضامین بھی شایع ہوتے ہیں۔ مسز زہرہ بیگم استاد اردو اس رسالے کی نگران ہیں اور طالبات میں سے مدیر منتخب کئے جاتے ہیں۔ "زون" ایک کشمیری لفظ ہی جس کے معنی چاند کے ہیں۔ زون یوسف شاہ چک کی ملکہ حبہ خاتون کا نام تھا اس لئے اس لفظ کے ساتھ کئی رومانی تصورات وابستہ ہو گئے ہیں۔

(۵) بادام واری :۔ اسلامیہ کالج سرینگر کے طلبا کا رسالہ ہے۔ بادام واری رسالے کا عجیب و غریب نام اس کی جائے وقوع بادام واری سے مستعار ہے۔ اور یہ کئی کالجوں اور کچھ سکولوں کے رسالوں کے ناموں کی خصوصیت بھی بن گئی۔ بادام واری ہاری پربت کے دامن میں بادام کا وسیع و عریض باغ ہے جہاں موسم بہار کے آغاز میں جب بادام کے درختوں میں شگوفے کھلتے ہیں تو بڑا جشن منایا جاتا ہے اور سرینگر بلکہ باہر کے صاحب ذوق لوگ بھی اس کی سیر کو آتے ہیں۔ بادام کے درختوں میں شگوفوں کا کھلنا زمستان کے رخصت ہونے اور بہار کی آمد کا اعلان ہوتا ہے اسی طرح اس باغ اور اس نام کے ساتھ اہل کشمیر کی بڑی خوشگوار یادیں وابستہ ہیں۔ بادام واری کا اجرا ۱۹۶۲ء سے ہوا اور یہ سال بہ سال برابر شایع ہوتا ہے۔ اس کے موجودہ پرنسپل پروفیسر محمد یوسف کو رسالے کے فروغ کی بڑی فکر ہے۔

(۶) ویری ناگ :- اننت ناگ اسلام آباد کالج کے طلبا کا رسالہ ہے، یہ نام اس وجہ سے منتخب کیا گیا ہے۔ کہ اس کالج سے قریب تر وہ چشمہ ہے، جو ویری ناگ کے نام سے ساری دنیا کے سیاحوں کی جائے سیاحت بنا ہوا ہے۔ یہ ولستا یا جہلم کا سرچشمہ بھی ہے، جس کے اطراف شہنشاہ جہانگیر نے ایک خوبصورت عمارت اور وسیع باغ تعمیر کروایا تھا۔ کالج کے اگلے صدر پروفیسر مقبول فاضلی جو فارسی کے استاد رہ چکے ہیں، اس کی رہنمائی کرتے رہے۔

(۷) توی۔ جموں کے گاندھی میموریل کالج کے طلبا کا رسالہ ہے، اور یہ کالج کے رسالوں میں قدیم ہے۔ اس وقت کے جموں کے بہت سے لکھنے والے اس میں لکھ کر انشا اور شعر گوئی کی تربیت حاصل کرتے رہے۔ ان میں سے کئی رسالے کے مدیر بھی رہے۔

(۸) ولر :- سرکاری کالج سوپور کا رسالہ ہے۔ ولر جھیل دنیا کی میٹھے پانی کی سب سے بڑی جھیل اس حیثیت سے شہرت رکھتی ہے۔ اسی سے رسالے کا نام مستعار ہے۔ پرنسپل عبدالاسلام ڈار عرصہ تک اس رسالے کے سرپرست رہے، پروفیسر الطاف حسین اس کے نگران ہیں۔

(۹) آئینہ : گورنمنٹ کالج، پونچھ کے طلبا کا رسالہ ہے۔ پونچھ کی سرزمین آج سے عرصہ پہلے اور آج بھی اپنی مردم خیزی اور خاص طور پر اردو کے اچھے ادیبوں اور انشا پردازوں کو نشو و نما دینے کا باعث رہی ہے۔ کالج کے اردو کے اساتذہ میں کنول کشن بالی، اس کے نگران رہے، جو اردو کے شاعر اور نقاد بھی ہیں۔ اس وقت فارسی کے استاد محمد شفیع اس کے نگران ہیں۔ گوجر طبقے اور پہاڑی زبان کے بارے میں اس کے شماروں میں اچھے مضامین ہوئے ہیں۔

(و) یونیورسٹی کے رسایل :

(۱) نیا شعور : یونیورسٹی کے مابعد طیلسانی اردو شعبے کے ترجمان کی حیثیت سے ۱۹۶۱ء سے شایع ہونے لگا جس میں زیادہ تر اساتذہ کے تنقیدی اور تحقیقی مضامین شامل ہوتے تھے۔ کچھ مضامین ایم۔ اے بھی اس کے دو تین شماروں میں شایع ہوتے رہے۔ اس کے پہلے نگران ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور تھے۔ جو یونیورسٹی کے پہلے اردو پروفیسر شعبے کے صدر اور فیکلٹی آف آرٹس کے ڈین بھی تھے۔

(۲) ادبیات :- کشمیر یونیورسٹی کے اردو اور فارسی کے اساتذہ اور طلبا کے تحقیقی مضامین کے لئے یہ رسالہ "نیا شعور" کی جگہ ۱۹۶۷ء سے نکل رہا ہے۔ پہلے شمارے کو شعبہ فارسی کے استاد رحمن راہی نے مرتب کیا تھا۔ اس کے دو تین شمارے جواب تک شایع ہو چکے ہیں۔ خاص طور پر کشمیر سے متعلق چند اہم تحقیقی مضامین کی اشاعت کا باعث ہوئے ہیں۔ ۱۹۶۹ء کا شمارہ جو غالب کی سوسالہ برسی کے سال شایع ہوا تھا۔ غالب کی زندگی اور ان کے فن پر چند اہم مضامین کا حامل ہے۔ اس میں ان تقریبات کی روداد بھی شایع ہوئی ہے، جو فروری ۱۹۶۸ء سے لے کر فروری ۱۹۶۹ء تک یونیورسٹی اور جموں اور کشمیر کے کالجوں میں منعقد ہوئے تھے۔ اس رسالے کو پروفیسر عبدالقادر سروری، صدر شعبہ ترتیب دے رہے ہیں۔

(۳) دانش :- کشمیر یونیورسٹی کے فارسی تنبیہ مابعد طیلسانی کا ترجمان ہے، جس کا صرف ایک شمارہ اس سال یعنی ۱۹۷۰ء میں شایع ہوا ہے۔ اس رسالے میں کچھ مضامین فارسی کے بھی شامل ہیں۔ چند مضامین غالب کی فارسی شاعری کے کسی پہلو پر لکھے گئے ہیں اور یہ مضامین شعبہ فارسی اور شعبہ اردو کے اساتذہ کے لکھے ہوئے ہیں۔ [۱]

(دی) سرکاری رسالے :

(۱) دیہاتی دنیا : ریاست کے محکمہ دیہات سدھار اور پنچایت کی جانب سے ۱۹۴۹ء کے لگ بھگ شایع ہونے لگا تھا۔ اس وقت محکمے کے ناظم پنڈت کیشپ بندھو تھے، اور انہیں کی دلچسپی کا نتیجہ اس رسالے کا اجرا تھا۔ اس کے پہلے اڈیٹر پنڈت گنگا دھر بھٹ دیہاتی مقرر ہوئے تھے۔ اس میں شک نہیں کہ رسالے میں زیادہ تر ایسے مضامین اور معلومات شایع ہوتی تھیں، جن کا تعلق دیہات اور اس کی زندگی اور کسانوں کی بہبودی سے تھا تاہم پنڈت گنگا دھر بھٹ کی ذاتی دلچسپیوں کی بدولت اس میں ادبی مضامین بھی شایع ہوتے تھے۔

(۲) دیہات سدھار :- دیہاتی دنیا کا جانشین تھا۔ ۱۹۵۵ء میں جب محکمہ دیہات سدھار کی تنظیم جدید عمل میں آئی تو اس رسالے کا نام بدل کر "دیہات سدھار" کر دیا گیا جس کے پہلے مدیر رام چند شرما مقرر ہوئے تھے لیکن جلد ہی محمد امین کچھ اس کے مدیر مقرر ہوئے۔ جو اس وقت تک محکمے کے دفتر میں منتظم کے عہدہ پر تھے

[۱] اس رسالے کے کئی ایک شمارے اب تک برابر چھپے ہیں۔

محمد امین کچھ فارسی اور اردو کے اچھے متعلم ہیں اور شعر و انشا کا بھی ذوق رکھتے ہیں۔ کچھ کی ادارت میں رسالہ اپنے مقاصد کی تکمیل کے ساتھ ساتھ ادبی ذوق کو بھی فروغ دیتا رہا۔ چنانچہ اس میں شعراء کے کلام کے علاوہ کئی تنقیدی مضامین اور انشائیے وغیرہ بھی شایع ہوئے۔ اس رسالے کے ذریعہ اردو ادب کا ذوق جموں اور کشمیر کے دور دراز حصوں تک پہنچ سکا۔ کچھ ۱۹۶۷ء تک اس کے اڈیٹر رہے۔ اس کے بعد عشرت کاشمیری کے تفویض اسی کی ادارت کے فرایض ہوئے۔ عشرت دو سال تک یہ خدمت انجام دیتے رہے۔ وہ اردو کے شاعر اور انشاپرداز بھی ہیں اور ان کا حال گزشتہ صفحات میں لکھا جا چکا ہے۔ اس وقت رسالے کے اڈیٹر اردو کے مشہور افسانہ نگار نور شاہ ہیں[1]

(۳) تعمیر۔ حکومت کے محکمہ اطلاعات کی جانب سے ۱۹۵۴ء میں جاری ہوا تھا۔ یہ دور وہ تھا جب عوامی حکومت قایم ہونے کے بعد قایدین اپنی تہذیب اور شایستگی کے تار و پود جوڑنے بیٹھے۔ اس کے لئے یہ رسالہ ترجمان کا کام دیتا رہا۔ رسالہ کا نام "تعمیر" اس تعمیر نو کی طرف اشارہ تھا جس کا خاکہ قایدین آزادی کے ذہن میں تھا۔ رسالے کے پہلے اڈیٹر شمیم احمد شمیم مقرر ہوئے تھے اور شریک مدیر محمد یوسف ٹینگ تھے۔ رسالہ بڑی تقطیع پر بڑے سلیقے سے شایع ہوتا تھا اور اس کے مضامین اور حصہ نظم کا معیار بھی کافی بلند ہوتا تھا۔ کچھ عرصے کے بعد یہ رسالہ بند ہو گیا، تو اس کی اشاعت ۱۹۵۶ء سے محکمہ اطلاعات کے نشری شعبے لالہ رخ پبلی کیشنز کے حوالے کر دی گئی۔ شمیم احمد شمیم کا تعلق، کچھ عرصہ بعد ۱۹۵۹ء میں رسالے کی ادارت سے منقطع ہو گیا اور محمد یوسف ٹینگ کے تفویض رسالے کی ادارت کے فرایض کر دیئے گئے۔ رسالے کے لکھنے والے سارے ملک کے تھے، اس رسالے کے بھی ایک سے زیادہ خاص نمبر جیسے مہجور نمبر، آزاد نمبر، مولانا ابوالکلام آزاد نمبر شایع کئے گئے۔[2]

(ج) مذہبی رسایل:

(۱) البلیغ جموں و کشمیر انجمن تبلیغ الاسلام کا ترجمان ہے، اور ۱۹۶۷ء سے حضرت سید میرک شاہ کاشانی کی زیر سرپرستی شایع ہو رہا ہے۔ اس کے اڈیٹر اور ناشر سید محمد قاسم بخاری ہیں۔ رسالے میں اسلامیات اور مشاہیر اسلام کے بارے میں مضامین اور نظمیں بھی شایع ہوتی ہیں۔

---

[1] بعد میں خالد حسین اور محمد امین بٹ بھی اس رسالے کے مدیر رہے۔

[2] تعمیر ۱۹۷۰ء کے بعد دوبارہ جاری ہوا۔ اس وقت اس کے مدیر خالد بشیر ہیں۔ ۱۹۸۳ء میں تعمیر کا اردو کے بارے میں ایک ضخیم نمبر شایع ہوا جو کئی اعتبار سے قابلِ قدر ہے۔

(۲) "الارشاد" :- جامعہ باب العلم بڈگام سے شایع ہوتا ہے جو مذہبی علوم کا ادارہ ہے۔ اس کے سرپرست آغا سید یوسف ہیں اور مدیر رسالہ آغا سید مصطفیٰ۔ رسالہ ۱۹۷۶ء سے جاری ہے۔ مذہبی مضامین، مراثی اور مناقب اس کے خاص موضوعات ہیں۔ کچھ ادبی مضامین اور ثقہ نوعیت کی نظمیں بھی اس میں شامل ہوتی ہیں۔

(۳) سفینہ :- خانقاہ سوختہ، نواکدل، سرینگر سے شایع ہو رہا ہے۔ اس کے مدیر محمد عباس انصاری ہیں۔ اس رسالے میں بھی مذہبی نوعیت کے مضامین کے علاوہ اسلامی تاریخ اور ثقافت پر مضامین شایع ہوتے ہیں۔

(۴) تحفظ - کل جموں و کشمیر انجمن تحفظ الاسلام، کا ترجمان ہے جس کے اڈیٹر غلام نبی ہیں۔ انجمن کے مقاصد مسلمانوں کے مختلف فرقوں، انجمنوں اور اداروں کو مسلم مفادات کی خاطر ایک ہی پلیٹ فارم پر جمع کرنا، ان میں وحدت فکر و عمل کو فروغ دینا ہے اور رسالہ انہیں مقاصد کی تکمیل کے لئے جاری کیا گیا ہے۔

(۵) اسی انجمن کی جانب سے مولانا محمد انور شاہ کی یادگار میں ایک ماہ نامہ "الانوار" کے نام سے شایع کیا جا رہا ہے۔ جس کے مدیر اختر کاشمیری ہیں۔ رائے عامہ کو اکسانے کے لئے بھی انہوں نے اخبار سے کام لیا تھا۔

اس وقت ریاست کے مختلف شہروں سے کوئی بیس روزنامے اور اس کی ڈیوڑھی تعداد میں ہفت روزہ اخبار نکلتے ہیں۔ کچھ پندرہ روزہ بھی ہیں۔ ریاست کا قدیم ترین اخبار "رنبیر" جس نے اس صدی کے دوسرے اور تیسرے دہے میں ریاست میں صحافت کی تاریخ بنائی تھی، چوتھے دہے کے بعد بھی وقفہ وقفہ سے نکلتا اور بند ہوتا رہا۔ اس زمانے میں اس کی مقبولیت بھی محدود ہو کر رہ گئی تھی۔ "وتستا" کا جانشین یا معاصر پنڈت پریم ناتھ بزاز کا "ہمدرد" جس نے صحافت کے ساتھ ساتھ ادبی ذوق کو ابھارنے میں بھی شایاں خدمات انجام دی تھیں، اب مسدود ہو چکا تھا۔ سرینگر کے اخباروں میں پنڈت کشیپ بندھو کا "دیش" اور "کیسری" ہفتہ [illegible] بند ہو گئے "[illegible]" جس کی ادبی خدمات کے

کئی حوالے پچھلے باب میں گزر چکے ہیں۔ اس عہد کے آخری برسوں میں ایک نزاع کا شکار ہو کر مسدود ہو گیا تاہم اپنی طویل عمر اور پابندی اشاعت کی وجہ سے نہ صرف ریاست بلکہ اردو کے اخباروں میں ایک احترام کا مقام رکھنے والا اخبار اس دور کے بڑے حصے میں شایع ہوتا رہا۔ اس دور کے روزناموں اور ہفت روزہ اور دوسرے اخباروں کی تفصیل ذیل میں درج کی جاری ہے۔

و۔ روزنامے:

۱۔ "مارتنڈ" سناتن دھرم لوک سبھا کا اخبار تھا۔ کشیپ بندھو کے بعد کئی اہل قلم پنڈتوں نے اس کی ادارت کے فرائض انجام دیئے۔ یہ صحیح ہے کہ اس دور میں اخبار کی اگلی مقبولیت باقی نہیں رہی تھی، لیکن اپنے مقاصد کی تکمیل اور ادبی روایات کو برقرار رکھنے میں حتی الامکان وہ اگلی روایات کا پابند رہا۔ دو سال پہلے سرینگر میں ایک پنڈت لڑکی پر مشہوری ہندو کی ایک مسلمان نوجوان سے شادی کے بعد ہندو ایکشن کمیٹی نے جو تحریک برپا کی، اس کے نتیجے میں اس اخبار کی ملکیت بھی معرض بحث میں آئی اور آخر کار اخبار کی اشاعت میں رخنہ پڑا۔[۱]

اخبارات:

اخبارات کی اشاعت کے لحاظ سے تعداد کی حد تک شاید ہی کوئی اور ریاست جموں و کشمیر کا مقابلہ کر سکتی ہے۔ اس صدی کے ربع اول سے، جب سے اخبارات کی اشاعت کی اجازت ملی، اس کثرت سے اخبار جاری ہوتے رہے کہ جیسا کہ اوپر اشارہ کیا گیا ہندوستان کے کوئی دو شہر جموں اور سرینگر کے معیار کو نہیں پہنچ سکتے۔ اخبارات اور پریس کی اجازت ملنے کے ساتھ ہی ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اہل صحافت اور اہل انشا کی موج ارادوں سے بند ٹوٹ گیا۔ اس دور میں اخباروں کی تعداد پچھلے دور سے بھی زیادہ ہو گئی ہے۔ اخباروں کی اس کثرت کا ایک سبب، ایک فایدہ اور ایک نقصان بھی ہے۔ سبب یہ ہے کہ ریاست میں اور ریاستوں کے مقابلے میں ہر پڑھا لکھا اخبار پڑھنے کا خواہش مند ہے اور خود خرید کر پڑھتا ہے۔ اس میں اخباروں کی قیمت ان کی مدد کرتی ہے۔ فایدہ یہ ہے کہ اخبار ریاست کے دیہات میں اور

۱۔ اب "مارتنڈ" ایک ہفتہ وار کی صورت میں انگریزی میں ہندوؤں کے ترجمان کی حیثیت سے شائع ہوتا ہے۔

تقریباً ہر گھر میں پہنچ جاتے ہیں۔ دوسرے پہلو سے یہ نقصان ہے کہ اخباروں کی کثرت، کسی اخبار کو بھی اوسط معیار سے اوپر اٹھنے میں مانع ہوتی ہے۔

اخباروں کی عوامی اپیل کا ایک سبب تو ان کی سنسنی خیز خبریں ہوتی ہیں، دوسرا سبب ان کی قیمت ہے جو دوسری ریاستوں کے اخباروں کے مقابلے میں کم ہوتی ہے۔ کئی اخبار ایسے ہیں، جو کسی مفاد کی غرض سے یا مقصد کی تکمیل کے لئے نکالے جاتے ہیں، اور اس مقصد کے حصول کے بعد ان کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ پچھلے دور سے یہ روایت چلی آرہی ہے۔ چنانچہ پنڈت ہرگوپال خستہ اور پنڈت سالگرام کے حالات میں اس طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ جب وہ مہاراجہ رنبیر سنگھ سے ناراض ہوگئے تو لاہور سے اخبار نکال کر ان کی ذات اور ان کے نظم ونسق پر تنقید کرنے لگے۔ بعض عہدہ داروں، جیسے سردار محمد حیات خاں کی مخالفت کے لئے بھی انھوں نے اخبار جاری کئے تھے۔ پھر مہاراجہ پرتاپ سنگھ کے خلاف انگریزوں کی کارروائی کے خلاف یہ نزاع اس کی زندگی پر موثر ہوئی۔ اس وقت اس کے اڈیٹر پنڈت بدری ناتھ مٹو تھے۔

(۲) "مارتنڈ" کی مسدودی کے بعد سناتن دھرم یووک سبھا نے ایک روزنامہ "نوجیون" جاری کیا ہے۔ جو "مارتنڈ" ہی کی روایات پر کاربند رہنے میں کوشاں ہیں۔ اس نام کا ایک اور اخبار اس دور کے اوائل میں پنڈت دینا ناتھ وار یکوشاہر نکالتے تھے۔

(۳) "چاند" جو پنڈت نرسنگداس نرگس نکالتے تھے، ریاست کے ایک اور قدیم اخباروں میں سے ہے، جو پہلے ہفت روزہ تھا، اور اس دور میں روزنامہ بنا دیا گیا۔

(۴) "خدمت" ریاست کے اخباروں میں گزشتہ تئیس سال کے عرصہ سے بڑی باضابطگی کے ساتھ شایع ہونے والے اخباروں میں سے ہے۔ یہ ہمیشہ ریاست کی حکومتی جماعت کا ترجمان رہا۔ پہلے نیشنل کانفرنس کے خیالات کا حامل تھا، اب ریاستی کانگریس ترجمان ہے۔ اب تک اس کے حلقہ ادارت میں کئی قابل اہل قلم شامل رہے ہیں۔ ۱۹۴۷ء میں غلام رسول عارف اس کے مدیر رہے ہیں۔ ۱۹۵۱ء میں مولانا محمد سعید مسعودی اس کو ترتیب دیتے تھے۔ ان کے بعد پنڈت

کیشپ بند ہونے بھی کچھ عرصہ اس کی ادارت کے فرائض انجام دیئے۔ غلام محمد کشفی جو ۱۹۴۵ء اور بعد اس کے مزاحیہ کالم "انکشافات" کے عنوان سے لکھا کرتے تھے، اور انشا پردازی کے بڑے مستحسن انداز کے مالک تھے، ادارت کے فرائض بھی انجام دیتے رہے۔ کچھ عرصہ کے لئے علی محمد خان کے تعاون بھی اس کی ادارت کی خدمت رہی اور رحمٰن راہی اور پنڈت مکھن لال آتو معاون مدیر کی خدمت انجام دیتے رہے ۱۹۴۸ء سے پنڈت نند لال واتل اس خدمت کو انجام دے رہے ہیں۔ ادبی خدمات میں واتل، سنجیدہ فکر اور معتدل انداز نظر کے حامل اہل صحافت میں سے ہیں۔

(۵) آفتاب۔ ایک اور استقلال اور باضابطگی کے ساتھ شایع ہونے والا روزنامہ ہے جس کے مدیر ثناء اللہ بٹ ہیں ۱۹۴۷ء کے فسادات نے مدیر کو سرحد پار ڈھکیل دیا تھا، چنانچہ کچھ عرصہ وہ پاکستان میں مقیم رہے اور ان کے ذوق صحافت نے انہیں راولپنڈی سے اخبار "کشمیر" نکالنے پر مایل کیا تھا۔ یہ اخبار کچھ عرصہ جاری رہا۔ اس کے بعد وہ کشمیر آئے اور ۱۹۵۶ء سے "آفتاب" جاری کیا۔ اخبار کسی خاص جماعت کا ہمنوا نہیں ہے، اور خبروں اور تبصروں کے علاوہ ادبی تجزیے، کہانیاں، مضامین اور نظمیں بھی اس میں شایع ہوتی ہیں۔ اس کے مزاحیہ حصے کا عنوان "خضر سوچتا ہے ولر کے کنارے" مقرر ہے، جس میں حالات حاضرہ پر مزاحیہ انداز میں تبصرے کئے جاتے ہیں۔

(۶) قومی آواز۔ جموں سے شایع ہوتا ہے، جس کے اڈیٹر رگھوبیر سنگھ مکت ہیں۔ یہ جموں کے انگ کا کانگریسی جماعت کا اخبار ہے، اور اس میں بھی خبروں اور تبصروں کے علاوہ ادبی مضامین اور نظمیں وغیرہ شایع ہوتی ہیں۔

(۷) اُجالا۔ جموں کے پرانے اخباروں میں سے ہے، اسے لالہ امرناتھ ملہوترہ نے ہفت روزہ کے طور پر جاری کیا تھا، ۱۹۶۳-۶۴ء سے یہ روزنامہ ہو گیا مگر اب وہ پابندی کے ساتھ شایع ہو رہا ہے۔ ۱۹۶۹ء کے اواخر میں لالہ ملہوترہ کی کبر سنی کی وجہ سے اس کی ملکیت اور ادارت وجے سوری کے نام منتقل ہو گئی ہے۔ وید گپتا بھی اس کے حصہ دار ہیں۔ وجے سوری کو ابتدا سے صحیفہ نگاری سے دلچسپی رہی ہے، چنانچہ نذیر احمد سمنانی کے روزنامہ "سندیس" میں وہ کام کر چکے تھے۔ وجے سوری کی ادبی

دلچسپیوں کے نقوش کبھی کبھی اخبار کے کالموں میں نظر آتے ہیں۔

(۸) مزدور۔ سرینگر سے کوئی تیرہ چودہ سال کے عرصے سے شایع ہو رہا ہے۔ اس کے اڈیٹر پیارے لال کار ہلو ہیں۔ مزدوروں کے مسایل اور ان کی شکایات کے لئے یہ فورم کا کام کرتا ہے۔

(۹) سندیس۔ جموں سے نذیر احمد سمنانی کی ادارت میں شایع ہو رہا ہے۔ سمنانی کا عملی سیاست سے بھی تعلق ہے۔ وہ ریاست کی طرف پارلیمینٹ کے رکن بھی رہ چکے ہیں اور اس وقت ریاست کی قانون ساز کونسل کے رکن ہیں۔

(۱۰) نیا سنسار۔ غلام رسول عرفانی کی ادارت میں نکلتا ہے۔[۱]

(۱۱) رہبر۔ غلام محی الدین کی ادارت میں شایع ہو رہا ہے۔

(۱۲) چنار۔ ایک جماعت کا اخبار ہے جس کی ادارت کے فرایض پرانے اہل صحافت اسرار احمد آزاد کے تفویض تھی اور محمد مقبول اس کے شریک مدیر تھے۔ آزاد عرصہ سے اس میدان میں ہیں وہ کانگریسی نقطہ خیال کے محاسن ہیں۔ لیکن ترقی پسند بلکہ کمیونسٹ تصورات کے حامل۔ انہوں نے اخبار کو خبروں اور تبصروں کے علاوہ ادبی بنانے کی بھی کوشش کی تھی۔ پچھلے سال انہوں نے اخبار سے قطع تعلق کیا اور اس سال ان کا انتقال ہو گیا۔ پچھلے سال سے اخبار کی ادارت کے فرایض طارق انجام دے رہے ہیں۔[۲]

(۱۳) جہان نو۔ ۱۹۵۲ء میں سرینگر سے جاری ہوا تھا میر غلام محمد راجپوری اس کے مالک تھے اور ادارت شمبوناتھ گورکھ کے تفویض تھی۔ بعد میں یہ ہفتہ وار ہو گیا تھا اور اب بند ہو گیا ہے۔

(۱۴) سرینگر ٹائمز۔ صوفی غلام محمد کی ادارت میں سرینگر سے شایع ہو رہا ہے۔ سیاسی مسایل کے بارے میں اس کے کارٹون بڑی مقبولیت حاصل کر چکے ہیں۔

(۱۵) نوائے کشمیر۔ نیشنل کانفرنس اور بخشی غلام محمد سابق وزیر اعظم ریاست کے خیالات اور سیاسی تصورات کا حامل اخبار ہے۔ صوفی غلام محمد اس کے مدیر ہیں۔[۳]

(۱۶) ہمدرد۔ غلام رسول عارف کی ادارت میں تقریباً پندرہ سال سے شایع ہو رہا ہے۔ ایک اور تجربہ کار صحافی جی۔ ایم۔ ڈار اس کے شریک مدیر ہیں۔ مزاحیہ کالم بھی اخبار کا ایک حصہ ہوتا ہے اور اس کا

---

[۱] عرفانی کے انتقال کے بعد یہ اخبار بند ہو چکا ہے۔

[۲] چنار بھی اب شایع نہیں ہوتا۔

[۳] [illegible]

ایک اور کالم حکایات وشکایات کا ہے، جس کے ماتحت عوام کی شکایات حکومت کی توجہ میں لائی جاتی ہیں۔

(۱۷) ڈلر۔ ۱۹۶۸ء سے سرینگر سے جی۔ ایم۔ ڈار کی ادارت میں شایع ہو رہا ہے اس کا ایک خاص کالم "روشنی کا مینار" کے عنوان سے شایع ہوتا ہے، جس کے تحت قرآن کے احکام درج کیے جاتے ہیں۔

(۱۸) زمیندار۔ ایک اور اہم اخبار ہے، جو محمد شفیع سمنانی کی ادارت میں کچھ عرصہ سے شایع ہو رہا ہے۔[1]

(ب) ہفت روزہ :

(۱) روشنی۔ جس کے مدیر عبدالعزیز کاشمیری تھے، ۱۹۴۷ء سے قبل جاری ہوا تھا۔ اس دور میں کچھ عرصہ شایع ہونے کے بعد بند ہو گیا۔ عبدالعزیز اچھے اہل قلم ہیں۔ وہ اسلامک ریویو کی نمایندگی بھی کرتے رہے۔

(۲) صبح۔ مشہور قاید راجہ محمد اکبر خان کا اخبار، جس کا ذکر ایک اگلے باب میں آچکا ہے، اس دور میں کچھ عرصہ جاری رہا۔ یہ ۱۹۴۰ء میں میرپور سے جاری ہوا تھا اور ۱۹۵۶ء تک نکلتا رہا۔ راجہ محمد اکبر خاں بڑے اچھے مقرر بھی تھے۔ انہیں باغیانہ تقریروں کے الزام میں کئی دفعہ سزا دی گئی۔ ۱۹۵۱ء کے ایک شمارہ میں جب محمد اکبر خان کا انتقال ہو چکا تھا، ان کی قومی خدمات پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا تھا۔

> "صبح آج سے گیارہ سال قبل نیشنل کانفرنس کے مقتدر رہنما مجاہد میرپور راجہ محمد اکبر خان مرحوم کی ادارت میں میرپور سے ہفتہ وار نکلنا شروع ہوا۔ دراصل راجہ صاحب کی اس تقریر نے ہی جس کی پاداش میں اس دفعہ (۱۲۴) کے تحت انہیں تین سال کی قید سخت کی سزا کا حکم ہوا تھا، ملک کی قسمت کا پانسہ بدلا۔ اس تقریر کی بنیادوں پر ہی مسلم کانفرنس کو نیشنل کانفرنس میں تبدیل کیا گیا تھا۔"

اس وقت یہ اخبار دوسرے دور میں داخل ہوا ہے۔

(۳) کیسری۔ پنڈت کشیپ بندھو کا اخبار بھی ۱۹۴۷ء سے قبل جاری ہوا تھا، اس دور میں اس کی اشاعت بھی کچھ عرصہ تک جاری رہی۔ پنڈت گنگا دھر بھٹ دیہاتی بھی اس کے حلقہ ادارت میں شامل تھے۔

(۴) وکیل۔ پنڈت شمبو ناتھ وکیل نے جاری کیا تھا۔ ان کے بے وقت انتقال کے بعد ان کے فرزند پنڈت لشکر ناتھ کول وکیل کچھ عرصہ تک چلاتے رہے۔

---

[1] سرینگر سے شایع ہونے والے آجکل کے روزناموں میں نوائے صبح، اقبال، سرینگر ایکسپریس، آفتاب، مارننگ ٹائمز، آزادی، نقشبند، شاہسوار، انڈین ٹائمز، مادر کشمیر وغیرہ شامل ہیں۔

(۵) قومی درد۔ پنڈت جیالال کلم کا اخبار تھا۔ کلم ہائی کورٹ کے جج تھے اور انگریزی میں "کشمیری پنڈت" کتاب کے مصنف۔

(۶) پیام انقلاب۔ ۱۹۴۷ء کے بعد جاری ہوا تھا۔ یہ پرچا سوشلسٹ جماعت کا ترجمان تھا۔ اور اشتراکیت کا سخت مخالف۔ خواجہ محمد امین بٹ اس کے مدیر تھے اور وہ بھی سوشلسٹ پارٹی کے رکن تھے۔ خبروں اور خبروں پر تبصرے کے علاوہ سیاسی مسایل پر مضامین، خاص شماروں میں افسانے اور نظمیں اور کبھی کبھی کشمیری میں نظمیں بھی اس میں شایع ہوتی تھیں۔

(۷) سرلا۔ جو اکھنور سے دیانند کپور کی ادارت میں ۱۹۴۷ء کے پہلے سے نکل رہا تھا۔ بعد بھی کچھ عرصہ جاری رہا۔

(۸) نوائے قوم۔ اے سرور کسانہ کی ادارت میں ۱۹۴۶ء میں جاری ہوا تھا۔ یہ گوجر طبقے کا اخبار تھا، اور وقفوں سے یہ بعد میں بھی شایع ہوتا رہا۔ اس اخبار کا دعویٰ یہ تھا کہ یہ عوام کا ترجمان ہے۔ دیہات اور اضلاع کی خبریں اس میں زیادہ شایع ہوتی تھیں۔ ادبی پارے اور نظمیں بھی شایع ہوتی رہیں۔

(۹) سویرا۔ جموں کے پرانے ہفت روزہ اخباروں میں سے ہے۔ وید گپتا اور وید راہی کی مشترکہ ادارت میں ۱۹۵۲ء میں شایع ہوتا تھا، لیکن کچھ عرصہ بعد یہ مسدود ہو گیا۔

(۱۰) اذان۔ جماعت اسلامی کا ہفت روزہ، جو ۱۹۵۲ء سے مولوی سعدالدین کی ادارت میں شایع ہوتا رہا۔ بعد میں سید علی گیلانی اس کے اڈیٹر رہے۔ مسلمانوں میں دینی تعلیم کا شعور پیدا کرنا اور ان میں اخوت اور بھائی چارہ کو ترقی دینا اس کا بنیادی مقصد ہے۔ مذہبی موضوعات کے علاوہ ادبی مسایل پر بھی اس میں مضامین شایع ہوتے ہیں۔ منظومات کی اشاعت سے بھی اسے پرہیز نہیں۔ اس کے چند مستقل عنوانات میں ایک "دید و شنید" دوسرا "وقت کی پکار" یہ صحیح ہے کہ اخبار کے لکھنے والوں کے رجحانات اسلامی ہوتے ہیں۔ تاہم معقولیت پسندی اور وسیع نقطہ نظر اس کا مسلک ہے۔

(۱۱) جے سوولیشی۔ کا اجرا جموں سے اس صدی کے پانچویں دہے کے وسط میں ہوا تھا۔ یہ پرچا پرجا پریشد کی ترجمانی کرتا تھا۔ اب بند ہو گیا ہے۔

(۱۴) رہنما۔ سرینگر سے تیرہ چودہ سال سے شایع ہو رہا ہے۔ اور پیر مبارک شاہ اس کے مہتم، طابع اور ناشر ہیں۔ اخبار کا سرنامہ "مظلوموں اور بے سہاروں کا ترجمان" ظاہر کرتا ہے کہ عوام کی شکایات کے لئے اس کے صفحات وقف ہیں۔ اس کا ایک مستقل کالم "سنتا جا" ہوتا ہے۔[1]

(۱۵) زمیندار۔ محمد شفیع سمنانی کی ادارت میں اس دہے کے اوایل سے شایع ہو رہا ہے۔ عام مفاد کی خبریں، تبصرے اور کبھی ادبی مضامین اور نظمیں بھی اس میں شایع ہوتی ہیں۔ اقبال کا یہ شعر۔

جس کھیت سے دہقان کو میسر نہ ہو روزی   اس کھیت کے ہر خوشہ گندم کو جلا دو

اس کے سرنامہ پر لکھا ہوتا ہے۔

(۱۶) کشمیر ٹرانسپورٹر۔ ۱۹۶۳ء سے ٹرانسپورٹ اور حمل ونقل کے کام میں معروف لوگوں کے ترجمان کی حیثیت سے جموں سے شایع ہو رہا ہے اور اس کے مدیر اجیت سنگھ ہیں۔ اس کا سرنامہ "ریاستی ٹرانس پورٹ صنعت کا واحد ترجمان" مقرر ہے۔ حمل ونقل کے مسایل اور ان کے نقطہ نظر کو اس اخبار کے ذریعے حکومت کے حلقوں تک پہنچانے کی کوشش کی جاتی ہے۔

(۱۷) کرم وہیر۔ ریاست کے سکھ طبقے کا ترجمان ہے جو ۱۹۶۳ء سے نکل رہا ہے۔ اس کے مدیر گیانی کرتار سنگھ کومل ہیں۔ کومل پنجابی کے شاعر اور اردو کے اہل صحافت ہیں۔ عام خبروں اور تبصروں کے علاوہ اس میں پنجابی ادب کے بارے میں مضامین خاص طور پر شایع ہوتے ہیں۔

(۱۸) محاذ۔ پہلے ۱۹۵۸ء میں محاذ رائے شماری کے اخبار کی حیثیت سے جاری ہوا تھا پھر یہ بند ہو گیا۔ ۱۹۶۴ء میں اس کا دوبارہ اجرا عمل میں آیا۔ اس کے مدیرین غلام نبی خیال اور عبدالغنی مسرت فریدی تھے۔ اس کے لکھنے والوں میں شیخ محمد عبداللہ، مرزا محمد افضل بیگ، خواجہ غلام رسول کوچک، سیف الدین قاری، صدر الدین مجاہد نمایاں تھے۔ مجاہد ریاست کے پرانے صحیفہ نگار اور قاید ہیں۔ ان کا تذکرہ پچھلے ایک باب میں گزر چکا ہے۔

(۱۹) محاذ کے نام سے جموں سے ایک اور ہفتہ وار ہربھجن سنگھ بالی کی ادارت میں اسی سال شایع ہونے لگا۔ نند گوپال باوا اس کے شریک مدیر ہیں۔ اس کے ہر شمارے میں ادبی خبریں اور ثقافتی امور

---

[1] رہنما، اب کافی زمانے سے شایع نہیں ہوتا۔

(۲۰) جیوتی۔ سماج ساتھ سمیتی کا اخبار، جس کی ادارت کے فرائض پہلے پنڈت دینا ناتھ وار یکوشاہد انجام دیتے تھے۔ اس وقت پنڈت شام لال ولی کے تفویض یہ خدمت ہے۔

(۲۱) آئینہ۔ شمیم احمد شمیم، جو مجلس قانون ساز کے بڑے متکلم بلکہ اپنے انداز کے واحد متکلم رکن ہیں، اس کے مدیر ہیں، وہ اڈوکیٹ بھی ہیں اور اردو ادب کے اچھے متعلم اور انشا کے ایک خاص ڈھب پر بلا شرکت غیرے تصرّف رکھتے ہیں، جو مخصوص شمیم کا اسلوب ہے۔ شمیم علماء اور اہل صحافت کے ایک برگزیدہ سلسلے سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کے دادا مولوی محمد عبداللہ وکیل صاحب درس بزرگ تھے، جن کا حال لکھا جا چکا ہے۔ ایک چچا مولوی محمد ایوب صابر ہفت روزہ "البرق" کے مدیر تھے۔ شمیم کا یہ ہفتہ وار ۱۹۶۳ء میں جاری ہوا۔ لیکن اس سے پہلے وہ رسالہ "تعمیر" کی ادارت کے فرائض انجام دے چکے تھے۔ شمیم کے "آئینہ" نے اردو صحافت میں، فرض صحیفہ نگاری کی جراءت، جو کبھی کبھی جرأت رندانہ کی سرحد تک پہنچ جاتی ہے اور تلخ و تند لب و لہجہ اور نرم گفتارانہ طنز و مزاح کا ایک ایسا رجحان داخل کیا ہے کہ اس کی تلخ نوائی میں ایک جاں نوازی بھی مضمر ہوتی ہے اور یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ وہ بھی جن پر وہ تعریض کرتا ہے اور وہ بھی جن کی تعریف میں وہ لکھتا ہے، دونوں اس کے گرویدہ ہیں۔ اس تلخ گفتار شیرینی کے آئینے کو کبھی بے مزہ نہیں پایا۔ اسی لیے اس اخبار کی تحریریں محض صحافت نہیں بلکہ شائستہ انشا پردازی ہے۔ اسی لئے "آئینہ" اردو صحافت میں اپنے لئے ایک ممیز مقام پیدا کر چکا ہے۔ اس کا بہت قرینہ ہے کہ "آئینہ" کی بہت سی تحریریں، مولانا ابوالکلام آزاد کے اپنے مخصوص انداز کی انشا پردازی کی طرح، اردو کے ادبیات العالیہ کا حصہ بن جائیں گی۔

(۲۲) میزان۔ مقبول حسین کی ادارت میں ۱۹۶۳ء سے جاری ہوا۔ اس میں بھی خبروں اور تبصروں کے علاوہ علمی اور ادبی مضامین بھی شایع ہوتے رہے۔ مشاہیر کے اسکیچز بھی اس کا مخصوص جز تھے۔

(۲۳) وِتستا۔ پریم ناتھ بزاز کے اخبار کے مشہور اور تاریخی نام سے ایک ہفتہ وار ۱۹۶۵ء سے شایع ہونے لگا تھا۔ اس کے اڈیٹر ڈی، این، کول تھے۔ خبروں کے علاوہ مزاحیہ پارے "سوال و جواب" اور طنزیہ فیچر

اس کے خاص عنوانات تھے۔

(۲۴) رفتار۔ مشہور افسانہ نگار موہن یاور کی ادارت میں ۱۹۶۵ء سے شایع ہو رہا ہے۔ خبروں پر تبصرے اور علمی و ادبی مضامین اس میں بھی شایع ہوتے ہیں۔ ادبی خبریں اخبار کا ایک مخصوص کالم ہے، مزاحیہ پاروں کے لئے "قلم قتلے" کا عنوان منفرد ہے، جس میں "قلم کار" کی تحریریں شامل ہوتی ہیں۔

(۲۵) آہنگ۔ طاہر مضطر کی ادارت میں ۱۹۶۵ء سے ۱۹۶۷ء تک شایع ہوتا رہا۔ عام دلچسپی کے مضامین بھی اس کا ایک جز تھے۔ معاصر سماجی اور سیاسی شخصیتوں پر اخبار کی تعریفیں بعض وقت سخت لب و لہجہ اختیار کر جاتی تھیں۔

(۲۶) سلسبیل۔ "آہنگ" کا جانشین طاہر مضطر ہی کی صدارت میں کچھ عرصہ تک شایع ہوتا رہا۔ عام علمی و ادبی مضامین اور نظمیں "فکر و فن" کے عنوان سے نکلتی تھیں۔

(۲۷) مضطر۔ "سلسبیل" کی مسدودی کے بعد طاہر مضطر کے ذوق صحیفہ نگاری نے "مضطر" کا روپ دھارا، لیکن اس روپ کو بھی پائداری نہیں نصیب ہو سکی۔

(۲۸) ہمارا استاد۔ سرینگر سے ۱۹۶۷ء میں جاری ہوا۔ یہ ریاست کی انجمن اساتذہ کا پرچہ ہے، جس کو پنڈت شمبھوناتھ کیول مرتب کر رہے ہیں۔ اخبار کے سرنامے پر ایک شعر درج ہوتا ہے، جس کا مطلب ہے: "استاد کے عزائم وقت کے دھاروں کا رخ بدل دیتے ہیں"۔ اخبار میں درس و تدریس اور تعلیمی دلچسپی کے علاوہ عالم قارئین کے لئے مضامین، ادبی نوعیت کے مضمون، انشائیے اور نظمیں بھی شامل ہوتی ہیں۔ پنڈت گنگادھر بھٹ دیہاتی، اس کے لکھنے والوں میں خاص طور پر نمایاں ہیں۔ پنڈت شمبھوناتھ کیول اچھے انشاپرداز اور شاعر ہیں۔ ان کے اداریہ خیال زا ہوتے ہیں۔ ان کی نظموں میں سے ایک نظم جو اخبار کے ایک شمارے میں شایع ہوئی، اس کے چند شعر ہیں۔

ہم ننھے منے ہیں نادان　　سمجھ نہیں کچھ ہیں نادان
بھلے برے کی نہیں پہچان　　بھارت ماں کی ہم سنتان
دیش کا اونچا نام کریں گے　　خون پسینہ ایک کریں گے
ہندو، کرسچین اور مسلمان　　بھارت ماں کی ہم سنتان

اخبار کے دوسرے لکھنے والوں میں غلام محمد وفائی، صدر گورنمنٹ اورنیٹل کالج، سرینگر گردھاری لال جلالی وغیرہ بھی قابل ذکر ہیں۔[1]

(۲۹) اقبال۔ غلام نبی خیال نے ۱۹۶۸ء میں شایع کرنا شروع کیا تھا۔ اس سے پہلے وہ کشمیری میں ایک ہفتہ وار "وطن" کے نام سے نکالتے تھے۔ ان کا تذکرہ گزر چکا ہے۔ خیال نے ادب لطیف یا نثری شاعری کی پرانی ریت کو پھر زندہ کرنے کی کوشش کی تھی جس کے تیسرے دہے کے ادیب دلدادہ تھے۔ "فانوس خیال" کے عنوان ذیل کا پارہ ایک شمارہ میں شایع ہوا تھا۔

اس دور کی تاریکی گواہ ہے
کہ یہ دور گزر جائے گا
میرے گوتم، میرے عیسیٰ
میں افسانے سجا رہا ہوں
میں خواب محل سنوار رہا ہوں
یہ غنچے کب مسکرائیں گے
یہ سیاہی کب چھٹے گی
میرے گوتم، میرے عیسیٰ
مجھے روشنی کا انتظار ہے۔

(۳۰) وطن۔ وجے سمن سوستی، جموں سے نکالتے تھے۔

(۳۱) گلاب۔ وجے سمن سوستی کی بیگم سپن مالا کی ادارت میں شایع ہوتا تھا۔ سپن مالا پنجابی کی شاعر ہیں اور ان کے ایک مجموعے پر انعام بھی عطا ہو چکا ہے۔ اس کا تذکرہ گزر چکا ہے کہ سپن مالا ایک ادیب خاندان سے ہیں۔

(۳۲) جہلم۔ کے نام سے ایک ہفتہ وار ۱۹۶۷ء میں سرینگر سے شایع ہونے لگا تھا۔ اسے غضنفر احمد مرتب کرتے تھے۔ چند شماروں کے بعد یہ موقوف ہو گیا۔

---

[1] یہ اخبار اب شائع نہیں ہوتا۔

(۳۳) الغفران۔ ۱۹۶۸ء میں مشہور شاعر غلام رسول نازکی کی ادارت میں شایع ہونے لگا تھا۔ مدیر کے ادبی مذاق کی جھلک اس میں نمایاں ہوتی تھی اور ادبی مذاکرات اس کے شماروں کی نمایاں خصوصیت تھی۔ "اڈیٹر کی ڈائری" اس کا ایک مستقل کالم تھا۔ مشاہیر شعرا کے کلام کی شرح بھی اس میں درج کی جاتی تھی۔ یہ اخبار بھی جلد بند ہو گیا۔

(۳۴) سندیس۔ ڈی۔ ایل۔ شرما کی ادارت میں جموں سے شایع ہوتا تھا۔

(۳۵) جموں سندیس۔ ایک اور ہفتہ وار جموں سے شایع ہوتا تھا جس کے مدیر رام پیارا صراف تھے۔

(۳۶) دلیر۔ سوپور سے پیر عبدالغنی کی ادارت میں ۱۹۶۸ء سے نکل رہا ہے۔ یہ اخبار سیاست میں مسلم نقطۂ خیال کی نمایندگی کرتا ہے اور خود مسلمانوں کو راہِ اعتدال اختیار کرنے کی تلقین کرتا ہے۔ لطیف شاہین اور سید معراج الدین عاقل اس کے لئے مزاحیہ پارے لکھتے ہیں۔ "مشعل راہ" اس کا ایک کالم ہے جس میں اسلامی احکام معاشرت کی تفصیلات درج کی جاتی ہیں۔

(۳۷) آواز۔ ہفتہ وار جموں سے اونکار سنگھ آوارہ کی ادارت میں شایع ہونے لگا ہے۔ یہ اخبار آنند مارگی مسلک کا پرچار کرتا ہے۔ اونکار سنگھ آوارہ شعر بھی کہتے ہیں۔

(۳۸) گوجر۔ جموں سے ۱۹۶۸ء میں شایع ہونے لگا تھا جس میں گوجر طبقے کے مسایل ان کی تاریخ اور ادب کو نمایاں مقام حاصل تھا۔ چوہدری نور الدین کتاریہ اس کے اڈیٹر تھے۔ یہ اخبار بھی زیادہ عرصہ تک جاری نہ رہ سکا۔

(۳۹) کوہسار ٹائمز۔ جاوید احمد لنگامی کی ادارت میں ۱۹۶۹ء سے شایع ہونے لگا تھا۔ یہ دراصل "گوجر" ہفتہ وار کا جانشین تھا اور اسے جو زیادہ طویل عمر نصیب نہ ہو سکی۔

(۴۰) جمہور۔ جون ۱۹۴۷ء کے لعد ہی میر نور محمد کی ادارت میں نکلنے لگا تھا۔ کچھ عرصہ جاری رہنے کے بعد بند ہو گیا۔

(۴۱) پیام۔ میر نور محمد ہی کی ادارت میں نکلنے لگا تھا لیکن یہ بھی جلد بند ہو گیا۔

(۲ہ) محافظ۔ رشید تاثیر کی ادارت میں سرینگر سے نکل رہا ہے۔ رشید تاثیر ایک کتاب کے بھی مصنف ہیں جس کا ذکر گزر چکا ہے۔

(۳ہ) شہباز۔ کے نام سے بھی ایک اخبار جاری ہوا تھا جس کا اب نام ہی یادگار رہ گیا ہے۔

(۴ہ) چٹان۔ بھی کچھ عرصہ تک شایع ہوتا رہا تھا۔

(ج) سہ روزہ:

سہ روزہ اخباروں میں "کوہستان" ادبی انداز کے لحاظ سے امتیاز رکھتا ہے۔ یہ اخبار سرینگر سے شایع ہو رہا ہے اور اس کے اڈیٹر عبدالحمید نحوی اور رالیس' این' گاڈرو ہیں۔

کچھ اور اخبار بھی نکلتے تھے، جن کے صرف حوالے ملتے ہیں لیکن ان کے بارے میں ضروری تفصیلات دستیاب نہیں ہوتیں۔ ان کے نام یہ ہیں۔

مہابیر۔ اتحاد جاگیرداراں' سواستک

(د) پندرہ روزہ:

(۱) مسلم۔ مئی ۱۹۶۷ء میں جاری ہوا تھا۔ اس کے مدیر مولوی محمد نورالدین اور شریک مدیر الیس احمد ہیں۔ مولوی نورالدین اسلامیہ ہائی سکول کے مدرس ہیں۔ اخبار مسلم مفادات کا علمبردار ہے۔

(۲) توحید۔ ایک اور پندرہ روزہ اخبار اس زمانے میں شایع ہونے لگا تھا' اور اس کے مقاصد بھی وہی تھے، جو "مسلم" کے ہیں۔ لیکن اب بند ہو چکا ہے۔

وطن سے باہر:

کئی اچھے ماہر صحافت، جن کی تربیت کشمیر اور جموں کی صحافتی فضا میں ہوئی تھی۔ اس زمانے میں تقسیم کے بعد کے فسادات کی وجہ سے یا اپنی مجبوریوں کے سبب ریاست سے باہر چلے گئے ہیں۔ اس وقت بیرون ریاست سے باہر اپنی صلاحیتوں کی بدولت اردو کے نمایاں صحیفہ نگاروں میں شمار ہو رہے ہیں۔ انہیں میں روزنامہ ملاپ جو اس وقت آل انڈیا ریڈیو میں نیوز ریڈر کی خدمت

انجام دے رہے ہیں۔ میر نور محمد کشمیر سے پہلے دہلی گئے تھے، جہاں ۵۶-۱۹۵۵ء میں وہ عالم سرتاج کی شرکت میں "جوہر" کے نام سے ایک ہفتہ وار نکالتے رہے۔ ڈاکٹر عبدالجبار دہلوی اور حامل عباسی بھی ان کے شریک کار رہے۔ ایک انگریزی اخبار "فری تھنکر" کے نام سے بھی انہوں نے جاری کیا تھا جس میں شیام لال کچھا اور مکھن پال ان کے رفیق کار رہے۔

حفیظ اللہ جالب کاشمیری اور نورالدین اختر پاکستان چلے گئے ہیں، جہاں راولپنڈی سے ہفت روزہ "آغاز" نکال رہے ہیں۔

رفیق خاور جنہوں نے کراچی کے معتبر ماہ نامے "ماہ نو" کے مدیر کی حیثیت سے ساری اردو دنیا میں ایک مقام پیدا کر لیا ہے، جموں کے متوطن تھے ان کی تعلیم جموں ہی میں ہوئی اور تعلیم کی تکمیل کے بعد اس وقت کے پرنس آف ویلز کالج کے کتب خانے کے کتب خادار رہے تھے۔ اس زمانے میں "جاوید" جموں سے نکلتا تھا، جس میں رفیق خاور کی تخلیقات شایع ہوتی تھیں۔ اللہ رکھا ساغر جن کا تذکرہ گزر چکا ہے، "جاوید" کے مدیر تھے۔

شورش کاشمیری بڑے بے باک صحیفہ نگار ہیں۔ وہ بھی پاکستان چلے گئے ہیں اور لاہور سے "چٹان" نکال رہے ہیں۔ مولانا ابوالکلام جو خود بھی ایک سربرآوردہ صحیفہ نگار تھے، شورش کی صلاحیتوں کے قدر دان تھے۔ لاہور کے قیام کے زمانے میں، ان کے اختر شیرانی سے مراسم ہو گئے تھے۔ روزنامہ کوہستان (شمارہ ۸، ستمبر ۱۹۶۳ء) میں انہوں نے اختر شیرانی کی شاعری پر ایک مضمون "شاعر رومان۔ اختر شیرانی" کے عنوان سے شایع کیا تھا جس میں ان سے اپنی ایک ملاقات کا تذکرہ بھی لیا ہے۔ اس مضمون کا اقتباس ہے:

"حسن اتفاق سے ایک روز میں تاجور کے ہاں تھا کہ اختر آ گئے۔ شراب میں غرق تھے پہلے تو ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں پھر میں نے پوچھ ہی لیا۔ "اختر صاحب شاعری میں آپ کے استاد کون ہیں؟" وہ علامہ سے بھڑے کے لئے پیسے ہتیار ہے تھے طرح دیئے گئے۔ میں نے سوال دہرایا۔ جھنجلا کے کہا۔ "ہر سوال کی اپنی جگہ ہوتی ہے۔ اس وقت کیا کتھا لئے بیٹھے ہو" میں نے اصرار کیا۔ تاجور نے کہا "تو کہتے کیوں نہیں"۔ بھنا کر بولے

ؔ اگرچہ شورش کا انتقال ہو چکا ہے۔ مگر "چٹان" برابر شایع ہو رہا ہے۔

"بھائی استاد تو تاجور صاحب ہیں، لیکن واقعہ یہ ہے کہ شاگرد استاد پر بازی لے گیا"

آغا خلش کاشمیری عرصہ سے بمبئی میں ہیں اور ہفتہ وار "مصور" نکال رہے ہیں۔

"ہمدرد" کے ادارۂ تحریر میں بزاز کے ساتھ جن اہل قلم حضرات نے کام کیا تھا، ان میں ایک پرتھوی ناتھ کول بھی تھے اور اخبار میں مزاحیہ کالم "برق نار" کے عنوان سے لکھا کرتے تھے۔ سری پرتاپ کالج میں تعلیم کے زمانے میں وہ "پرتاپ" کے اڈیٹر بھی رہے تھے۔ اس وقت امریکی سفارت خانہ دہلی کے محکمہ اطلاعات میں کارگزار ہیں۔

اللہ رکھا ساغر اور قدرت اللہ شہاب بھی پاکستان میں ہیں۔ شہاب کے والد ریاست میں وزیر وزارت رہے تھے۔

انصاف۔ میر عبدالعزیز سرینگر کے سیاسی کارکن اور کالم نویس ہیں۔ ۴۷ء میں پاکستان چلے گئے سرینگر میں مسلم کانفرنس کے جریدہ "دن" کو "شر" اور "ملت" کے ایڈیٹر تھے۔ وہ پریم ناتھ بزاز کے 'ہمدرد' کے کالم نویس تھے اور اس میں طنزیہ اور ہجویہ نظمیں 'نمک پاش' کے فرضی نام سے لکھتے تھے۔ آج کل راولپنڈی سے 'انصاف' کے نام سے ہفتہ وار اخبار نکال رہے ہیں۔

"کشیر" - یہ معیاری اور خوبصورت ہفتہ وار خواجہ عبدالصمد وانی راولپنڈی سے نکال رہے ہیں۔ اس کے مستقل کالم معلومات اور علمی و تاریخی نکات کا خزانہ ہوتے ہیں۔ یہ پاکستان میں کشمیریوں کا سب سے موثر اور کثیر الاشاعت اخبار ہے اور اسکی سرحد کے دونوں جانب قدر کی جاتی ہے۔

جموں و کشمیر گورنمنٹ گزٹ

زندگی کے مختلف شعبوں، تعلیم کے مختلف مراحل اور خاص طور پر اعلیٰ مدارج میں کاروباری زندگی سرکاری اور نجی مراسلت میں زبان کا چلن، ادبی حیثیت سے بھی اسے کئی طرح سے مالامال کرتا ہے۔ سب سے بڑی بات تو یہ ہوتی ہے کہ ان وسیع رقبوں سے لفظ اور اظہار کے گوناگوں سانچے زبان میں نشو و نما ہوتے ہیں۔ اور پھر عوامی استعمال کی سطح سے اوپر ابھر کر وہ ادبی زبان کو بھی مالامال کر دیتے ہیں۔ انگریزی عہد کے آغاز تک زندگی کے ان سارے ہی شعبوں میں رواج نے اردو کے اظہاری سانچوں میں بڑی وسعت پیدا کر دی ہے۔ اگر یہ سلسلہ عمل کسی ایک عہد پر آ کر رک جائے تو اسے زبان کی نشو و نما رک جانا کہا جاتا ہے۔ زندگی بہرحال آگے ہی بڑھتی جاتی ہے، اور اگر زبان اس کے ساتھ ساتھ آگے نہ بڑھے، تو اس کی فطری صلاحیتوں کے باوجود اس میں ٹھہراؤ پیدا ہونے کا خدشہ بڑھ جاتا ہے۔

انگریزی نظم و نسق کے اختیار کر لیے جانے کے بعد کئی ریاستوں میں اردو کو ثانوی حیثیت حاصل ہو گئی، اور آزادی کے بعد کئی ریاستوں میں اس حیثیت کے ختم ہو جانے کی صورت رونما ہو گئی ہے۔ انگریزی علاقوں میں اردو کا چلن محدود یا موقوف ہو جانے کے بعد بھی مرحوم ریاست حیدرآباد اور ریاست جموں و کشمیر میں یہ سلسلہ قایم رہا اور ریاست جموں و کشمیر میں اب بھی قایم ہے۔ نجی خطوط، سرکاری مراسلت، اعلانیے حسب سابق اردو میں لکھے جاتے رہے۔ ڈوگرہ دور کی سرکاری مراسلت کے کچھ نمونے پچھلے ابواب میں دیئے جا چکے ہیں۔ یہاں ۱۹۶۸ء کے ریاست کے سرکاری اعلامیہ (جموں و کشمیر گورنمنٹ گزٹ مورخہ ۱۸ اپریل ۱۹۶۸ء) سے کچھ اقتباسات درج کیے جاتے ہیں۔

اشتہارات

ازعدالت کلکٹر/سب ڈویژن، سوپور

مثل نمبر ۱۴ دعے ۱ سنہ ۱۹۶۷-۶۸ء

تحصیل سوپور سب ڈویژن

روبکار تحصیل دربارۂ وصولی لقایا مالیہ سرکار رقمی ۲۳۲۰۳/۸۱ روپیہ از علی میر ولد عبداللہ میر

نمبردار جالنورہ، تحصیل سوپور، ضلع بارہ مولہ۔

اشتہار عام

ہر خاص و عام کو بذریعہ ہذا مطلع کیا جاتا ہے کہ علی میر نمبردار موضع جالنوارہ تحصیل سوپور کے ذمہ مبلغ ۲۳۲۰۳/۸۱ روپیہ مالیہ سرکار وصول طلب ہے۔ اس سلسلے میں نمبردار مذکور سے اقدامات وصولی تحصیل سے جاری ہو چکے ہیں لیکن وصولی لقایا مالیہ نہیں ہوئی ہے۔ عملہ ماتحت سے سبیل وصولی طلب کی گئی۔ حسب رپورٹ عملہ ماتحت علی میر نمبردار مذکور کو کھیوٹ نمبر ۳۹ دعے ۱۰ دعے ۱۴ دنمبر ۹ میں رقبہ ملکیتی و شاملات جایز تعدادی ۱۱ کنال و یک طبقہ مکان خس پوش واقع در موضع جالنوارہ تحصیل سوپور تا حال بیع و رہن میرا ہے۔ لہٰذا ہر خاص و عام کو مطلع کیا جاتا ہے کہ رقبہ تعدادی معہ ۱۱ کنال و یک طبقہ مکان خس پوش ملکیتی علی میر نمبردار جالنوارہ و درختان ثمردار و بے ثمر ایستادہ در رقبہ مندرجہ کھیوٹ ہائے صدر کی عام بولی مقام جالنوارہ بروز بدھ وار بتاریخ یکم مئی سنہ ۱۹۶۸ء بوقت گیارہ بجے روز جلسہ عام میں پکاری جائے گی۔ کامیاب بولی دہندہ کو رقم زرچہارم موقع پر ہی ادا کرنا ہوگا۔ اور باقی رقم بولی منظور ہونے پر یکمشت اندر پندرہ یوم داخل خزانہ کرنا ہوگا۔ اگر کامیاب بولی دہندہ اندر میعاد لقایا رقم بولی داخل خزانہ نہ کر سکا تو اس صورت میں رقم زرچہارم بحق سرکار ضبط ہوگا اور مزید بولی پکاری جائے گی۔ تحریر ۲۶ مارچ سنہ ۱۹۶۸ء۔ دستخط ایچ۔ ایچ۔ محبوب جی۔ کلکٹر/سب ڈویژن سوپور

(۲) از عدالت منصف مجسٹریٹ درجہ اول پلوامہ

علت ۷/۱۴ سال ۵۵ء تھانہ پولیس پلوامہ

سرکار بنام رزاق بٹ گلوان ولد محمد بٹ گلوان ساکن بونگرن وانپورہ۔ تحصیل پلوامہ

ملزم جرم ۳۷۹ R.P.C

اشتہار

زیر دفعہ ۸۷ - ض - ف

بمراد آگاہی ملزم رزاق بٹ مذکور مقدمہ عنوان الصدر میں ملزم رزاق بٹ گلوان مذکور کو عرصہ دراز سے عدالت ہذا سے بذریعہ وارنٹ ہائے طلب کیا جا رہا ہے۔ الا ملزم مذکور حاضر عدالت ہذا نہیں آتا۔ رپورٹ پولیس سے عیاں ہے کہ ملزم کا معمولی طور پر عدالت ہذا میں حاضر ہونا دشوار ہے۔ لہٰذا بذریعہ اشتہار ہذا ملزم رزاق بٹ گلوان مذکور کو آگاہ کیا جاتا ہے کہ وہ بتاریخ ۳/۵/۶۸ بوقت ۱۰ بجے روز اصالتاً حاضر عدالت ہذا آوے۔ بصورت دیگر ملزم مذکور کے خلاف کارروائی زیر دفعہ ۸۸ - ض - ف عمل میں لائی جائے گی۔

اشتہار ہذا آج بہ ثبت دستخط راقم و مہر عدالت ہذا اجرا کی گئی۔ تحریر ۳/۶۸ ۱۹

دستخط

جی۔ ایل۔ منہاس

ایک تعلیمی ادارہ کا مراسلہ

ادارۂ جامعہ باب العلم بڈگام

انجمن شرعی شیعان جموں و کشمیر

شریعت آباد - بڈگام

NO. 940-JBI DATED: 11-7-1966

بخدمت جناب اسسٹنٹ رجسٹرار صاحب جموں و کشمیر یونیورسٹی کشمیر ڈویژن

آپ کا مکتوب مورخہ ۱۹۶۶/۱۱/ نمبر F.19 (9) 65/GAF/D شکریہ کے ساتھ وصول ہوا۔ آپ نے تحریر فرمایا ہے کہ جامعہ باب العلم کے معاینہ کے سلسلے میں یونیورسٹی کی طرف سے ایک کمیٹی کی تشکیل عمل میں آئی ہے جو بہت جلد جامعہ کا معاینہ کرنے والی ہے۔ لیکن آپ نے تاریخ کی تعین نہیں فرمائی ہے۔ بہر حال جامعہ کے معاینے کی خاطر یونیورسٹی کے ارباب حل و عقد نے جو یہ مستحسن قدم اٹھانے کا تہیہ فرمایا ہے۔ اس طرز عمل سے انہوں نے جامعہ کی دیرینہ خواہش پوری کرنے کا سامان کیا ہے۔ لہذا جامعہ کمیٹی کا تشکر کے ساتھ خیر مقدم کرتا ہے۔

چونکہ جامعہ کے اکثر طلبا مولوی، مولوی عالم اور مولوی فاضل ان دنوں یونیورسٹی کے امتحانات کی تیاری کے سلسلے میں جامعہ سے رخصت لے چکے ہیں، اور نتیجہ برآمد ہونے تک ان کا یہی رویہ جاری رہے گا۔ علاوہ اس وقت تک نئی جماعت بندی کا مکمل طور پر انتظام نہ ہوگا۔

ان حقایق کے پیش نظر پر امید ہوں کہ آپ ماہ نومبر میں ہمارے ادارہ کا معاینہ فرمائینگے تاکہ اس وقت تک جدید جماعت بندی وغیرہ کا انتظام عمل میں لایا گیا ہوگا۔

آپ کا مخلص

آغا سید محمد ناصر الموسوی

مدرس اعلیٰ

جامعہ باب العلم انجمن شرعی بڈگام

ایک اشتہار عام

ریاست میں عام اشتہارات اردو ہی میں شایع ہوتے ہیں۔ اگست ۱۹۶۵ء میں تمام مذاہب کے رہنماؤں کی ایک کانفرنس منعقد ہوئی تھی۔ اس سلسلے میں جو اعلان شایع کیا گیا تھا اس کے اہم اقتباسات ذیل میں درج کیے جاتے ہیں۔

سرینگر میں آل مذاہب کانفرنس کے بانی جین منی شری سوشیل کمار جی مہاراج
کی حاضری میں

تمام مذہبوں کے رہنماؤں کا جلسہ

سرینگر کی دھرم پریمی جنتا کے لئے سنہری موقعہ

ضرور تشریف لاکر اس موقع سے فایدہ اٹھاویں

سرینگر کے بھائیو اور بہنو! آپ کو یہ جان کر خوشی ہوگی کہ تمام دنیا کے مذہبوں کی کانفرنس کے بانی منی شری سوشیل کمار جی مہاراج دہلی سے پیدل سفر کر کے سرینگر تشریف لائے ہیں۔

آج ساری دنیا مذہب کی سچائی اور طاقت کو ماننے لگی ہے اور اس کے پھیلاو کی زیادہ سے زیادہ ضرورت محسوس ہونے لگی ہے۔ اس کو مدنظر رکھتے ہوئے مہاراج کی حاضری میں جلسہ کا پروگرام ہر اتوار کی صبح ۹ بجے رکھنے کا نہیہ کیا ہے۔

لہذا سب بھائی بہنوں سے نویدن ہے مقررہ جگہ اور وقت پر تشریف لاکر فایدہ اٹھاویں۔

نویدک

سری نگر کی مذہبی پبلک

(مبروکاز پریس)

دو شادی کے دعوت نامے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم   نحمدہ و نصلی علی رسولہ الکریم

پیالہ منتظر مقدم تو بار انند   نہادہ چشم براہ تو دوستار انند

جناب مکرم۔   السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہٗ۔

بتقریب کارِ خیر نور چشمی غلام محمد خان عمرہ بزم دعوت احباب کا منعقد ہونا قرار پایا ہے لہذا التماس ہے کہ براہ کرم بتاریخ ۲۲ ستمبر ۱۹۶۶ء بروز ویروار بوقت ۸ بجے شام درخانہ داعی تشریف لاکر وہاں سے ہمراہ شاہ در دولت خانہ حاجی سونہ جو اونتو محلہ انتو حمام سوپور تشریف لاکر تناول ماحضر فرماکر داعی واحباب کو مشکور فرماویں۔ (گر قبول افتد زہے عزو شرف)

الداعی۔ غلام حسن اونتو   محلہ اونتو حمام   سوپور

---

(۲) بسم اللہ الرحمٰن الرحیم نحمدہٗ سبحانہٗ و نصلی و نسلم علی رسولہ الکریم

جنابِ محترم!

بتقریب کارِ خیر دختر نیک اختر

آپ کی تشریف آوری وہم طعامی درخانہ حاجی عبدالاحد صاحب کپرہ بمقام ملار ٹہ بہوری کدل

نیاز مند۔ غلام حسن مرجان۔ (ملارٹہ بہوری کدل)

پروگرام

تقریب	تاریخ	یوم	وقت	صاحب	مستورات
استقبال برات وتناول ماحضر	۲۹ ماہ اکتوبر ۱۹۶۶ء	سینچروار	۸ بجے شام	۱	×

نوٹ:۔ مستورات کے متعلق عرض ہے کہ وہ ۲ بجے روز تشریف لاکر مزید اطلاع آنے کا انتظار نہ کریں۔

ضمیمہ

ریاست کی دوسری زبانوں کی طرح کلچرل اکادمی اردو کی ترویج ترقی اور اشاعت کے لئے ایک منصوبہ بند طریقہ کار پر عمل پیرا ہے۔ کتابوں اور رسالوں کی اشاعت کے علاوہ سیناروں، مشاعروں اور ادبی محفلوں کا اہتمام کرنا اکادمی کے پروگرام کا مستقل حصّہ ہے۔

یومِ جمہوریہ کے موقع پر کل ہند مشاعرے کا اہتمام ہر سال جموں میں کیا جاتا ہے۔ اسی طرح اپنی باری پر اردو کانفرنس کا انعقاد بھی ہوتا ہے۔ جس میں ریاست کے اردو ادیبوں کے علاوہ بیرون ریاست کے ادباء اور شعراء کو بھی شرکت کی دعوت دی جاتی ہے۔ اردو دنیا کے مقتدر ادیبوں کے اعزاز میں محفلوں کو آراستہ و پیراستہ کرنے میں اکادمی کسی سے پیچھے نہیں رہی ہے۔ اب تک جن ادباء اور شعراء کے اعزاز میں استقبالیہ محفلوں کو ترتیب دیا گیا ہے۔ اُن میں "اختر الایمان"۔ "کرشن چندر"۔ "شمس الرحمان فاروقی"۔ "جوگندر پال" —— "عصمت چغتائی" خصوصیت کیساتھ قابلِ ذکر ہیں۔

اکادمی نوجوان اُردو ادیبوں کی حوصلہ افزائی کے لئے ہر سال خصوصی محفلیں منظم کرتی ہے۔ ان محفلوں میں نوجوان ادیبوں کو اپنی تازہ تخلیقات پیش کرنے کی دعوت دی جاتی ہے۔ بعد میں ان تخلیقات کو شیرازہ کے نوجوان نمبر میں شایع کیا جاتا ہے

اکادمی کا اُردو جریدہ "شیرازہ" پہلے ایک سہ ماہی تھا۔ بعد میں اسکی دو ماہی اشاعت کا انتظام کیا گیا۔ گزشتہ دو سال سے یہ رسالہ ایک ماہنامہ کی صورت میں شایع ہوتا ہے۔ اس رسالے کو اُردو دُنیا کے سربرآوردہ ادباء، شعراء اور محققین کا تعاون حاصل رہا ہے۔ اُردو دُنیا کو کشمیر کی تہذیب اور تمدن سے روشناس کرنے کے لئے کشمیر کے بارے میں مضامین کو اس میں ترجیحی طور پر شایع کیا جاتا ہے۔ "شیرازہ" کے اُن خصوصی شماروں کے علاوہ جن کا ذکر پہلے ہوا ہے۔ "شیرازہ" (اردو) نے "حسن نمبر"، "اقبال نمبر"، "ثقافت نمبر"، "افسانہ نمبر"، "شیخ العالم نمبر"، "صادق نمبر"، "للہ دید نمبر"، "پریم چند نمبر" اور "شیر کشمیر نمبر" شایع کیا ہے۔ ان خصوصی شماروں کی مسلمہ افادیت کے پیش نظر اُردو دُنیا میں انکی اہمیت مصدقہ ہے۔

بلند قامت اُردو ادباء اور شعراء کی یاد کو تازہ کرنے کے لئے اکادمی نے خصوصی اقدامات کئے۔ غالب صدی تقریبات کے دوران اکادمی نے غالب کی غزلوں کے کشمیری تراجم شیرازہ کشمیری کے غالب نمبر میں شایع کئے۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر گیان چند جین کی کتاب "تفسیر غالب" اور "رقعات غالب" نام کی کتابیں بھی شایع کی گئیں۔

اِقبال صدی تقریبات کا اہتمام اکادمی نے ریاستی پیمانے پر کیا۔ ہائی سکول کے درجے سے لیکر یونیورسٹی کے درجے تک طلبا اور طالبات کے مباحثوں کو منظم کیا گیا ہر درجہ پر امتیاز حاصل کرنے والوں کو نقد انعامات اور توصیفی اسناد سے نوازا گیا

ریاستی پیمانے پر مباحثے میں امتیاز حاصل کرنے والوں کو اقبال ٹرافی اور نقد انعام دیا گیا

حکیم مشرق کے فن اور فلسفہ کے بارے میں سرینگر اور جموں میں دو سیمینار کئے گئے، جن میں بیرون ریاست سے علی سردار جعفری، ڈاکٹر وحید اختر، ڈاکٹر عبد الحق وغیرہ نے مقالات پیش کئے۔ اس کے علاوہ ریاست کے اردو ادیبوں اور نقادوں نے بھی ان سیمناروں میں شرکت کی۔ سیمناروں میں پڑھے گئے مقالات کو بعد میں "محفلِ اقبال" کے نام سے کتابی صورت میں شائع کیا گیا۔ ڈاکٹر صاحب کے اردو اور فارسی کلام کو تقریبات کے دوران کشمیری میں منتقل کروایا گیا۔ متن کے ساتھ کلام کا کشمیری ترجمہ "پرتو اقبال" کے نام سے شائع کیا گیا۔

منشی پریم چند کی صد سالہ برسی کے موقعے پر اکادمی نے سرینگر میں "پریم چند کانفرنس" بلائی، جس میں "پریم چند نمائش" بھی ہوئی۔ پریم چند کے منتخب افسانوں کے تراجم اکادمی نے "شیرازہ" کے مختلف ایڈیشنوں میں شائع کئے۔

"اردو کشمیری فرہنگ" اکادمی کا ایک گرانقدر کارنامہ ہے۔ یہ فرہنگ نور اللغات مہذب اللغات اور پلیٹس کی ڈکشنری جامع اللغات اور فیروز اللغات کی بنیاد پر ترتیب دیا گیا ہے۔ بارہ جلدوں میں شائع شدہ "اردو کشمیری فرہنگ" میں نوے ہزار کے قریب الفاظ اور مرکبات شامل ہیں۔ اس فرہنگ کو مکمل کرنے میں پندرہ سال سے زیادہ وقت صرف ہوا ہے۔

کلچرل اکادمی کا "مصور خبرنامہ" اکادمی "ریاست میں اپنی نوعیت کا منفرد جریدہ تھا۔ اس خبرنامے میں ریاست کی تہذیبی اور تمدنی زندگی کے مختلف گوشوں کے بارے میں خبریں، مضامین اور معلومات شامل ہوتے تھے۔ صاحب علم اور صاحب نظر لوگ

اس جریدے کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے یہ خبرنامہ اب چند ایک سال سے شایع نہیں ہوتا۔

اکادمی کے شعبہ مخطوطات کے لئے کچھ ایسے نوادرات حاصل کئے گئے ہیں۔ جو ہر لحاظ سے قابلِ قدر ہیں۔ ایسے نادر مخطوطات میں ڈاکٹر سر شیخ محمد اقبالؒ کا شیر کشمیر کے نام خط اور چودھری خوشی محمدؐ ناظر کا خط خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔

ریاست میں خوشنویسی کو فروغ دینے کے لئے اکادمی "تعلیم گاہِ خوش نویسی" کے نام سے ایک ادارہ چلا رہی ہے۔ جس میں طلبا اور طالبات کو خوش نویسی کی باقاعدہ تربیت دی جاتی ہے۔ اس درسگاہ کی بدولت ریاست میں خوشنویسی کے فن کو کافی فروغ حاصل ہوا ہے۔ فن خطاطی کے نمونوں پر مشتمل "شیرین قلم" کے نام سے شایع شدہ دو البم بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہیں۔ خطاطی کے ساتھ ساتھ اردو ٹائپ کی تربیت دینے کے لئے اکادمی ایک تربیت گاہ چلا رہی ہے۔ جس میں طلبا، کو اردو ٹائپ کی تربیت دی جاتی ہے۔

کشمیر کے عظیم صوفی علمدار کشمیر کے متعلق "مرقع علمدار" اکادمی نے شیخ العالم شش صد سالہ تقریبات کے موقع پر اردو میں شایع کیا ہے۔ حضرت شیخ شش صد سالہ جشن ولادت کے دوران تین اردو کتابیں "برج نور" "ریشیات" اور "شمس العارفین" شایع کی گئیں۔ "برج نور" حضرت شیخ کی پہلی مستند سوانح حیات ہے۔ جسے اکادمی نے اردو میں شایع کیا ہے۔

اکادمی کا سالنامہ "ہمارا ادب" پہلے سال بھر کی منتخب اردو تخلیقات پر مشتمل ہوتا تھا۔ مگر گزشتہ کئی سال سے "ہمارا ادب" کسی خاص موضوع پر شایع ہوتا ہے ہمارا ادب کے عام شماروں کے علاوہ "لوک ادب نمبر" "تشاہیر نمبر (۲ جلدیں)" "جموں و کشمیر نمبر"

(۴ شمارے) مستقل اور اہم تصنیفات کا درجہ رکھتے ہیں۔ عبدالاحد آزاد کی مشہور کتاب "کشمیری زبان اور شاعری" (۳ جلدیں) کو اب دوسری بار شایع کیا گیا ہے۔

کشمیر کی علاقائی زبانوں میں لکھے گئے افسانوں کے تراجم جہاں شیرازہ اردو میں شایع ہوتے رہتے ہیں۔ علاقائی ادب کو اردو میں منتقل کرنے کے سلسلے میں اب تک "پربت اور پنگھٹ" کے نام سے دو کتابیں چھپ چکی ہیں اور تیسری کتاب شایع ہونے والی ہے۔ دوسری کتابیں جو اکادمی نے اردو کے فروغ کے لئے شایع کی ہیں اُن کی تفصیل اِس طرح ہے۔

"وطن کی پکار۔ قومی گیتوں کا مجموعہ جسے محمد یوسف ٹینگ نے مرتب کیا ہے۔ "ڈوگری لوک ادب اور پہاڑی آرٹ"۔ ڈوگری ادیب سنسار چند کی انگریزی کتاب کا اردو ترجمہ "جدید ڈوگری ادب کا ارتقاء"۔ پروفیسر نیلامبر دیو شرما کی انگریزی کتاب کا اردو ترجمہ، "انتخاب اردو ادب"۔ ۱۹۴۷ء سے ۱۹۷۱ء تک کشمیر میں لکھی گئی اردو تحریروں کا انتخاب جو نور شاہ نے کیا ہے۔

دیوانِ نیر۔۔ راجہ محمود آباد کے مخطوطے کی بنیاد پر ترتیب دیا گیا یہ دیوان ڈاکٹر اکبر حیدری نے ترتیب دیا ہے۔

نئی حیثیت اور اردو شاعری۔۔ اردو ادب کی جدید نہجوں کے مطالعے کی آئینہ دار یہ نئی کتاب ڈاکٹر حامدی کشمیری کی کاوش قلم کا نتیجہ ہے۔ کتاب کا سرنامہ شمس الرحمٰن فاروقی نے لکھا ہے۔

خیابان خیابان۔۔ کشمیر کے بارے میں مرحوم روشن صدیقی کی لکھی ہوئی نظموں پر مشتمل شعری مجموعہ۔

مٹک ہلارے ۔۔ پنجابی شاعر بھائی ویر سنگھ کی نظموں کا اردو ترجمہ جو ہربنس سنگھ آزاد نے کیا ہے۔

ان کتابوں کے علاوہ اکادمی نے مہجور، آزاد، وہاب پرے، حبہ خاتون، پرمانند وغیرہ کے کلام کا اردو ترجمہ متن کیساتھ شایع کیا ہے۔

لل دید کے کلام کا اردو ترجمہ بھی اس کے متن کیساتھ شایع ہوا ہے۔ اکادمی ہرسال منتخب اردو کتابوں پر انعامات دینے کے علاوہ اردو کتابوں پر باقاعدگی کیساتھ سبسڈی بھی فراہم کرتی ہے۔ ریاست میں شایع ہونے والی اکثر اردو کتابیں اکادمی کے مالی اشتراک سے شایع ہوتی ہیں۔

کشمیر مغل زمانے میں خوش نویسی کے اہم مرکز کی حیثیت سے مشہور تھا۔ اس سرزمین نے مغلوں کے درباری خطاط مثلاً محمد حسین کشمیری زرّین قلم۔ محمد مراد وغیرہ پیدا کئے۔ اکادمی نے کشیر مکتب کی خطاطی کے دو شاندار مرقعے "زرّین قلم" کے نام سے شایع کئے جن کے معلومات افزا اور دلچسپ مقدمے محمد یوسف ٹینگ نے لکھے ہیں۔